واصف علی واصف

دِل دریا سمندر

واصف علی واصف

دِل دریا سمندر

[مضامین]

متقدس ایام کو

متنازعہ بنانے والوں کے نام ——

بڑے افسوس کے ساتھ ——!

روزبیہ خواجہ

فہرستِ مندرجات

آغازِ گفتگو

خاموش چہرہ، خاموش لفظ کی طرح، صاحبِ نظر انسان کے سامنے بولتا ہے۔ خاموشی خود گویا ہوتی ہے۔ صاحبِ نظر سکوت سے ہمکلام ہوتا ہے۔ اُس پر عجیب عجیب انکشافات ہوتے ہیں۔ اُس پر رازہائے سربستہ کھُلتے ہیں۔ اُس پر افکارِ عالیہ کا نزول ہوتا ہے۔ اُس پر پرانے اسماء کے نئے معانی اپنی نئی جہتوں اور نئی صورتوں کے ساتھ اُترتے ہیں۔ اُس کے لیے علامات کا در ایسے وا ہوتا ہے کہ وہ رموزِ مرگ و حیات سے باخبر ہوتا ہے۔ اُس کی زندگی میں ہونا اور نہ ہونا مسلسل ہوتا رہتا ہے۔

صاحبِ نگاہ کے سامنے فاصلے، فاصلے نہیں رہتے ـــــ زمان و مکاں کی وسعتیں اُس کی چشمِ بینا کے سامنے سمٹ جاتی ہیں۔ وہ ماضی اور مستقبل کو بیک وقت حال میں دیکھتا ہے۔ جو واقعات ہو چکے ہیں، اُس کی نظر کے سامنے دوبارہ ہونے لگتے ہیں اور وہ واقعات جو ابھی پردۂ غیب میں ہیں، اُس کے سامنے ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

یہ اعجاز ہے چشمِ بینا کا، کہ صاحبِ نگاہ کے لیے شبنم کا پاکیزہ قطرہ ایک مقدس آیت کی طرح ہوتا ہے۔ صاحبِ نظر اس کائنات کو کتابِ مبین کی طرح دیکھتا ہے ـــــ یہ بھی ایک ایسی کتاب ہے

جس میں کوئی شک نہیں — خالق ایک ہے — تخلیق کا انداز ایک ہے — قرآن میں کائنات کا تذکرہ ہے اور کائنات میں قرآن کی تفسیر و تفہیم ہے۔ کائنات کو باطل سمجھنے والا کسی مقدس کتاب کو نہیں مان سکتا — یہ کائنات ایسی نشانیوں کا مرقع جمال ہے کہ ان کی تلاوت اہلِ نظر حضرات کا شغل ہے۔ اہلِ فکر حضرات اور اہلِ ذکر حضرات انہی نشانیوں سے اصلِ کائنات کا پتا معلوم کرتے ہیں — وہ جانتے ہیں کہ بیج کو مٹی کی تاریکی میں پالنے والی اور قرآن کو نازل فرمانے والی ایک ہی ذات ہے — اور یہی ذات شکمِ مادر میں انسان کی تشکیل فرماتی ہے۔

ہر طرف ایک ہی ذات کے جلوے ہیں — رنگ رنگ کے جلوے دراصل بے رنگ کے جلوے ہیں — خالق اتنا مخفی ہے کہ ہر اظہار اور آشکار اُس کا اپنا ہے۔ وہ اتنا ظاہر ہے کہ ہر مخفی اُس کا اپنا ہے — چشمِ بینا کے لیے یہ کائنات آئینہ روئے حسن ہے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ تماشا اور تماشائی ایک ہی شے ہے — تماشا لگانے والا خود تماشائی کے رنگ میں ہے۔ وہ خود ہی ہے، خود آئینہ ہے، خود نظر ہے اور خود ہی خود کے روبرو ہے۔ صاحبِ نگاہ شاید اُسی کے نور سے دیکھتا ہے۔ اُس کے نور سے دیکھنے والا اُس کے نور کے علاوہ اور کیا دیکھے گا — یہ ذات پات کے جھگڑے، یہ عقیدتوں کی تفریق یہ اعتقادات کا اختلاف، یہ من و تو کی بحث، یہ سب دوریوں کے ابواب ہیں۔

تقرب کے جلوے رنگ اور آواز سے بلند ہیں — وہاں

صرف نور ہے، روشنی ہے ـــ روشنی اور صرف روشنی ـــ لیکن چشم کا وا ہونا ـــ ہو تو معلوم ہو ـــ! قطرہ اپنے اندر قلزم کی گہرائی اور پہنائی رکھتا ہے ـــ چشم وا ہو تو معلوم ہو!ـــ ذرّے میں صحراؤں کی وسعتیں جلوہ گر ہیں، لیکن کوئی دیکھے تو سہی ـــ رائی کے دانے میں کائنات کے جلوے موجود ہوتے ہیں ـــ کون جانے ـــ ایک بیج میں تو ہزارہا درختوں کے ظہور کے لیے حرفِ کُن موجود ہے۔ ایک انسان کتنی ملتوں کے جنم کا باعث ہو سکتا ہے۔

یہ طلسم ہوشربا نہیں ـــ یہ حقیقت ہے ـــ کہ دیکھنے والوں کے لیے نظارے اور ہیں ـــ اُن کے لیے ہر منظر میں نیا منظر ہے۔ اُن کے لیے یہ کائنات ورق در ورق ایک نئی کائنات ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ نہ کوئی مشرق ہے نہ مغرب بلکہ ہر مقام بیک وقت مشرق ہے' مغرب ہے۔ ـــ اگر چشمِ بینا ملے تو گوشِ مشتاق کا میسر آنا لازم ہے ـــ نظر ملے تو دل کیوں نہ ملے ـــ دل مل جائے تو کیا نہ ملے گا ـــ دیکھنے والے سننے والے بنا دیے جاتے ہیں ـــ وہ لفظ کو دیکھتے ہیں۔ اُس کی آواز سنتے ہیں ـــ انسان کو دیکھتے ہیں۔ اُس کے خاموش چہرے کی آواز سنتے ہیں۔ سننے والے اس کائنات میں ہر آن، ہر اذان کو سنتے ہیں۔ سننے والے ساز کے اندر مخفی نغمے کو سُنتے ہیں۔ سُنتے ہیں اور مست ہو جاتے ہیں ـــ نغمہ ابھی ساز میں ہے اور اہلِ دل کا دل ہل جاتا ہے ـــ حسن ابھی پردے میں ہے اور عشق پر لرزہ طاری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اہلِ بینش، اہلِ نظر اور اہلِ دل حضرات دنیا میں رہتے ہوئے بھی کسی اور دنیا میں رہتے ہیں۔ اور اس دنیا میں پُرانے

چراغوں سے نئی روشنی حاصل کی جاتی ہے ـــــ
یہ کتاب کوشش ہے کہ اِس روشنی کا پرتو پیش کیا جائے ـــــ
روشنی تو روشنی ہے۔ کسی کی دسترس میں نہیں ـــــ نور، منور کرتا ہے ـــــ
اور جب آنکھ منور ہو تو دل منور ہے ـــــ منور دل کو دریا کہا گیا ہے ـــــ
دریا رواں دواں، یقین کے راستے پر چلنے والا، کناروں سے نکلتا ہوا، اپنی منزلِ مقصود کی طرف، راستے میں کبھی نہ ٹھہرنے والا، ہمیشہ گامزن، انجام کار اپنی منزلِ مراد سے واصل ہوتا ـــــ سمندر کی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ـــــ سمندر کا دل دریا ہے اور دریا کا دل سمندر ـــــ
چشمِ بینا کے جلوے ہیں ورنہ کہاں دل، کہاں دریا اور کہاں سمندر ـــــ
پیار بھرے دل، میٹھے دریا اور کڑوے سمندر ـــــ لیکن چشمِ بینا کے لیے ورق در ورق نئی کائنات ہے ـــــ

حاضر ہیں یہ چند مضامین ـــــ پرانے چراغ ـــــ شاید ان میں نئی روشنی ہو ـــــ چشمِ بینا آپ کے پاس ہے، آپ کے اپنے پاس!!

واصف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محبت

جو ذات شکمِ مادر میں بچے کی صورت گری کرتی ہے، وہی ذات خیال اور احساس کی صورت گری بھی ہے۔ پیدا فرمانے والے نے چہروں کو تاثر دینے والا بنایا اور قلوب کو تاثیر قبول کرنے والا۔ ہر چہرہ ایک رینج (RANGE) میں تاثر رکھتا ہے اور اس کے باہر وہ تاثیر نہیں ہوتی۔ دائرۂ تاثیر صدیوں اور زمانوں پر بھی محیط ہو سکتا ہے۔ یہ خالق کے اپنے کام ہیں۔ آنکھوں کو بینائی عطا فرمانے والا نظاروں کو رعنائی عطا فرماتا ہے۔ وہ خود ہی دل پیدا فرماتا ہے، خود ہی دلبر پیدا فرماتا ہے اور خود ہی دلبری کا خالق ہے، بلکہ وہ خود ہی ستر دلبراں ہے۔

محبت کوشش یا محنت سے حاصل نہیں ہوتی، یہ عطا ہے، یہ نصیب ہے بلکہ یہ بڑے ہی نصیب کی بات ہے۔ زمین کے سفر میں اگر کوئی چیز آسمانی ہے تو وہ محبت ہی ہے۔

محبت کی تعریف مشکل ہے۔ اس پر کتابیں لکھی گئیں، افسانے رقم ہوئے، شعراء نے محبت کے قصیدے لکھے، مرثیے لکھے، محبت کی کیفیات کا ذکر ہوا، وضاحتیں ہوئیں، لیکن محبت کی جامع تعریف نہ ہو سکی۔ واقعہ کچھ اور ہے، روایت کچھ اور۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ ایک چہرہ جب انسان کی نظر میں آتا ہے تو اس کا انداز بدل جاتا ہے۔ کائنات بدلی بدلی سی لگتی ہے، بلکہ ظاہر و باطن کا جہان بدل جاتا ہے۔

محبت سے آشنا ہونے والا انسان ہر طرف حسن ہی حسن دیکھتا ہے۔ اس کی زندگی نثر سے نکل کر شعر میں داخل ہو جاتی ہے۔ اندیشہ ہائے سود و زیاں سے نکل کر انسان جلوۂ جاناں میں گم ہو جاتا ہے۔ اس کی تنہائی میں میلے ہوتے ہیں۔ وہ ہنستا ہے بے سبب، روتا ہے بے جواز۔ محبت کی کائنات

جلوۂ محبوب کے سوا کچھ اور نہیں۔

محبوب کا چہرہ، محب کے لیے کعبہ بن کے رہ جاتا ہے۔ محبت انسان کو زمان و مکاں کی ظاہری قیود سے آزاد کر دیتی ہے۔ محبت میں داخل ہونے والا ہر داستانِ اُلفت کو کم و بیش اپنا ہی قصّہ سمجھتا ہے وہ اپنے غم کا عکس دوسروں کے افسانوں میں محسوس کرتا ہے۔ محبت وحدت سے کثرت اور کثرت سے وحدت کا سفر طے کراتی ہے۔ محبت آسمانوں کی بے کراں وسعتوں کو ایک جست میں طے کر سکتی ہے محبت قطرے کو قلزم آشنا کر دیتی ہے۔ محبت زمین پر پاؤں رکھے تو آسمانوں سے آہٹ سنائی دیتی ہے۔ محبت کرنے والے کسی اور مٹی سے بنے ہوتے ہیں۔ یہ خلوص کے پیکر دنیا میں رہ کر بھی دنیا سے الگ ہوتے ہیں۔ دراصل محبت زندگی اور کائنات کی انوکھی تشریح ہے۔ یہ قرآنِ فطرت کی الگ تفسیر ہے۔ یہ حیات و مرگ کے مخفی رموز کی جداگانہ آگہی ہے۔ محبت میں دھڑکنے والے دل کے ساتھ کائنات کی دھڑکنیں ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ محب اور محبوب کا تقرب موسموں کو خوشگوار بنا دیتا ہے۔ محبوب کی جدائی سے بہاریں روٹھ جاتی ہیں۔ محبوب کا فراق بینائی چھین لیتا ہے اور محبوب کی قمیض کی خوشبو سے بینائی لوٹ آتی ہے۔ یہ بڑا راز ہے۔ یہ انوکھا عمل ہے۔ اس زندگی میں ایک اور زندگی ہے۔ اسی کائنات میں ایک اور کائنات ہے۔ محبت ہو تو انسان کو اپنے وجود ہی میں کائنات کی وسعتوں اور رنگینیوں سے آشنائی ہوتی ہے۔ اسے خوشبوؤں سے تعارف نصیب ہوتا ہے۔ اسے آہٹیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ دھڑکنوں سے آشنا ہوتا ہے۔ اُسے نالۂ نیم شب کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ محبت کرنے والا اپنی ہستی کے نئے معنی تلاش کرتا ہے۔ وہ باطنی سفر پہ گامزن ہوتا ہے۔ زندگی کے تپتے ہوئے ریگزار میں محبت گویا ایک نخلستان سے کم نہیں۔ محبت کے سامنے ناممکن و محال کچھ نہیں۔ محبت پھیلے تو پُوری کائنات، اور سمٹے تو ایک قطرۂ خوں۔

درحقیقت محبت، آرزوئے قربِ حُسن کا نام ہے۔ ہم ہمہ وقت جس کے قریب رہنا چاہتے ہیں، وہی محبوب ہے۔ محبوب ہر حال میں حسین ہوتا ہے کیونکہ حسن تو دیکھنے والے کا اپنا اندازِ نظر ہے۔ ہم جس ذات کی بقا کے لیے اپنی ذات کی فنا تک بھی گوارا کرتے ہیں، وہی محبوب ہے۔

محب کو محبوب میں کجی یا خامی نظر نہیں آتی۔ اگر نظر آئے بھی تو محسوس نہیں ہوتی۔ محسوس ہو بھی تو ناگوار نہیں گزرتی۔ محبوب کی ہر ادا دلبری ہے، یہاں تک کہ اس کا ستم بھی کرم ہے۔ اس کی وفا مجسم لطف اور جفا بھی پُرکشش۔ محبوب کی جفا کسی محب کو ترکِ وفا پر مجبور نہیں کرتی۔ دراصل وفا ہوتی ہی بے وفا کے لیے ہے۔ محبوب کی راہ میں انسان معذوری و مجبوری کا اظہار نہیں کرتا۔ محبوب کی پسند و ناپسند محب کی پسند و ناپسند بن کے رہ جاتی ہے۔ محبت کرنے والے جدائی کے علاوہ کسی اور قیامت کے قائل نہیں ہوتے۔

محبت اشتہائے نفس اور تسکینِ وجُود کا نام نہیں۔ اہلِ ہوس کی سائیکی PSYCHE اور ہے اور اہلِ دل کا اندازِ فکر اور۔ محبت دو روحوں کی نہ ختم ہونے والی باہمی پرواز ہے۔

محبت کے لیے کوئی خاص عمر مقرر نہیں۔ محبت زندگی کے کسی دَور میں بھی ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک انسان کو پُوری زندگی میں بھی محبت سے آشنا ہونے کا موقع نہ ملے۔ سوزِ دلِ پروانہ کسی مگس کے نصیب میں نہیں ہوتا۔

عقیدوں اور نظریات سے محبت نہیں ہو سکتی۔ محبت انسان سے ہوتی ہے۔ اگر پیغمبرؐ سے محبت نہ ہو، تو خدا سے محبت یا اسلام سے محبت نہیں ہو سکتی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مجاز کیا ہے اور حقیقت کیا ہے؟ دراصل مجاز بذاتِ خود ایک حقیقت ہے اور یہ حقیقت اس وقت تک مجاز کہلاتی ہے، جب تک رقیب ناگوار ہو۔ جس محبت میں رقیب قریب اور ہم سفر ہو، وہ عشق حقیقی ہے۔ اپنا عشق، اپنا محبوب اپنے تک ہی محدود رکھا جائے تو مجاز، اور اگر اپنی محبت میں کائنات کو شریک کرنے کی خواہش ہو تو حقیقت۔ رانجھے کا عشق مجاز ہو سکتا ہے، لیکن وارث شاہ کا عشق حقیقت ہے۔ عشق حقیقی، عشقِ نورِ حقیقت ہے یہ نور جہاں سے بھی عیاں ہو گا، عاشق کے لیے محبوب ہو گا۔ عشقِ نبیؐ عشقِ حقیقی ہے۔ عشقِ آلِ نبیؐ عشق حقیقی ہے۔ عشق اصحاب نبیؐ عشق حقیقی ہے۔ عشقِ جامیؒ عشق حقیقی ہے۔ اُویس قرنیؓ کا عشق حقیقی ہے۔ عشق رُومیؒ عشق حقیقی ہے۔ بلکہ اقبالؒ کا عشق بھی عشق حقیقی ہی کہلائے گا۔

اگر قطرۂ شبنم واصل قلزم ہو اور آنسو بھی سمندر سے واصل ہو تو شبنم اور آنسو کا عشق بھی عشق قلزم

یا عشقِ حقیقی کہلائے گا۔ پیرِ کامل کا عشق، عشقِ نبیؐ ہی کہلائے گا۔

حضورِ اکرمؐ کو نورِ خدا کہا جاتا ہے اور ولی چونکہ مظہرِ عشقِ نبیؐ ہوتا ہے اسے مظہرِ نبیؐ یا مظہرِ نورِ خدا کہا

جا سکتا ہے۔ پیرِ کامل کو عشق میں صورتِ ظلِ اللہ کہنا جائز ہے۔ مولانا رُوم نے اس کو یوں کہا ہے ؎

ہر کہ پیرو ذاتِ حق را یک ندید
نے مرید و نے مرید و نے مرید

بہر حال عشقِ مجازی کو بہ وسیلہ شیخ کامل، عشقِ حقیقی بننے میں کوئی دیر نہیں لگتی۔

ہر انسان کے ساتھ محبت الگ تاثیر رکھتی ہے۔ جس طرح ہر انسان کا چہرہ الگ، مزاج الگ، دل الگ، پسند ناپسند الگ، قسمت نصیب الگ، اسی طرح ہر انسان کا محبت میں رویہ الگ۔ کہیں محبت کے دم سے تخت حاصل کیے جا رہے ہیں۔ کہیں تخت چھوڑے جا رہے ہیں کہیں دولت کمائی جا رہی ہے۔ کہیں دولت لٹائی جا رہی ہے۔ محبت کرنے والے کبھی شہروں میں ویرانے پیدا کرتے ہیں، کبھی ویرانوں میں شہر آباد کر جاتے ہیں۔ دو انسانوں کی محبت یکساں نہیں ہو سکتی اس لیے محبت کا بیان مشکل ہے۔ دراصل محبت ہی وہ آئینہ ہے جس میں انسان اپنی اصلی شکل، باطنی شکل، حقیقی شکل دیکھتا ہے۔ محبت ہی قدرت کا سب سے بڑا کرشمہ ہے "جس تن لاگے سو تن جانے"۔ محبت ہی کے ذریعے انسان پر زندگی کے معنی منکشف ہوتے ہیں۔ کائنات کا حُسن اسی آئینے میں نظر آتا ہے۔

آج کا انسان محبت سے دُور ہوتا جا رہا ہے۔ آج کا انسان ہر قدم پر ایک دوراہے سے دوچار ہوتا ہے۔ مشینوں نے انسان سے محبت چھین لی ہے۔ آج کے انسان کے پاس وقت نہیں کہ وہ نکلنے اور ڈوبنے والے سورج کا منظر تک بھی دیکھ سکے۔ وہ چاندنی راتوں کے حسن سے ناآشنا ہو کر رہ گیا ہے۔ آج کا انسان دُور کے سیٹلائٹ سے پیغام وصول کرنے میں مصروف ہے۔ وہ قریب سے گزرنے والے چہرے کے پیغام کو وصول نہیں کر سکتا۔ انسان محبت کی سائنس سمجھنا چاہتا ہے اور یہ ممکن نہیں۔ زندگی صرف نیوٹن ہی نہیں، زندگی ملٹن بھی ہے۔ زندگی صرف

حاصل ہی نہیں، ایثار بھی ہے۔ ہرن کا گوشت الگ حقیقت ہے، چشمِ آہو الگ مقام ہے۔ زندگی کارخانوں کی آواز ہی نہیں، احساسِ پرواز بھی ہے۔ زندگی صرف "میں" ہی نہیں، زندگی "وہ" بھی ہے، "تو" بھی ہے۔ زندگی میں صرف مشینیں ہی نہیں، چہرے بھی ہیں، متلاشی نگاہیں بھی۔ زندگی مادہ ہی نہیں، رُوح بھی ہے۔ اور سب سے بڑی بات زندگی خود ہی معراجِ محبت بھی ہے۔



فیصلہ

آدھا رستہ طے کر آیا۔
اب کیا سوچ رہا ہے آخر
انجانی منزل کی جانب
چلتا جائے
یا واپس ہو جائے راہی!
سوچ کے بھی انداز عجیب ہیں
سوچ کے ہی آغاز کیا تھا
سَو رستوں میں ایک چُنا تھا
اور اب سوچ ہی روک رہی ہے؟
آگے بھی کچھ تاریکی ہے!
لوٹ کے جانا بھی مشکل ہے!
سوچ کا سورج ڈوب رہا ہے!
ایسے راہی کی منزل ہے ___ آدھا رستہ!

خوف

خوف پیدا ہونے کے لیے خطرے کا ہونا ضروری نہیں۔ خوف انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے، حالات سے بھی اور خیالات سے بھی۔ جب انسان اپنی کسی خواہش کا جواز اپنے ضمیر میں نہیں پاتا، تو خوف زدہ ہونا لازمی ہے۔ خوف ناروا خواہش کا اوّلیں سگنل ہے۔

ہر انسان کو کسی نہ کسی سے محبت ضرور ہوتی ہے اور اگر وہ محبوب انسان اپنی ہی ذاتِ گرامی ہو، تو خوف سے بچنا محال ہے۔ اپنے آپ سے محبت دوسرے انسانوں سے تصدیق کا تقاضا کرتی ہے اور دوسرے انسان اُس انسان سے محبت نہیں کر سکتے، جو اپنے آپ اور صرف اپنے آپ سے محبت کرتا ہے۔ اس لیے دوسروں کے عدمِ تعاون کا خیال ہی خوف پیدا کرتا ہے۔ خوف اس بات کا ہوتا ہے کہ مجھے جاننے والے، مجھے ماننے والے نہیں ہیں۔ آخر کیوں نہیں ہیں؟

کسی انسان کو انسانوں میں محبوب بننے کے لیے ان سے محبت کرنا پڑتی ہے اور دوسروں سے محبت کرنے کا عمل اپنے آپ سے غافل ہونے کا عمل ہے۔ اور یہ عمل اپنی ذات سے محبت کرنے کے عمل کے خلاف ہے، اس لیے محبتِ خویش، خوفِ خلق سے مبرّا نہیں ہوتی۔

خوف ایک اندازِ نظر ہے۔ ایک نقطۂ نگاہ ہے۔ ایک واہمہ ہے، جو حقیقت بن کر سامنے آتا ہے۔ ہر حادثہ ضروری نہیں کہ رونما ہونے سے پہلے خوف پیدا کرے اور ہر خوف ضروری نہیں کہ کسی حادثے پر ہی ختم ہو۔ حادثہ اطلاع کے بغیر آتا ہے۔ خوف بذاتِ خود ایک حادثہ ہے، جو آتا ہے اطلاع کے بغیر اور انسان کے دل میں بیٹھ جاتا ہے۔ یہ "گھس بیٹھیا" کہاں سے آتا ہے۔ کیسے آتا ہے۔ کیوں آتا ہے۔ کیا معلوم!

بدنیتی کی فوری سزا خوف ہے۔ نیت اعمال سے مخفی ہوتی ہے اس لیے خوف اعمال کے نتیجوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسا عمل جس کی نیت بری ہو اور نتیجہ اچھا ہو، خوف پیدا کرتا ہے مگر وہ عمل جس کی نیت اچھی ہو، خواہ برا ہو خوف سے آزاد رہتا ہے۔ خوف دراصل بری نیت کی تخلیق ہے۔ نیت کی اصلاح کے بغیر یہ سزا ختم نہیں ہوتی۔

اللہ کے دوستوں اور خاص بندوں کی یہ پہچان بتائی گئی ہے کہ ان کے ہاں خوف اور حزن نہیں ہوتا۔ اللہ کے دوست نیت کی پاکیزگی کے بغیر کوئی عمل نہیں کرتے۔ ان کے اعمال اچھی نیات کی وجہ سے درست ہیں۔

نتیجے سے بے نیازی ہی خوف سے بے نیازی ہے۔ اندیشہ ہماری خواہش کے برعکس کسی نتیجے کا امکان ہے۔ جب خواہش خوش نیت ہو تو کسی بھی قسم کا نتیجہ خوف پیدا نہیں کر سکتا۔ جب خواہش بدنیت ہو تو کسی بھی قسم کا نتیجہ خوف سے نہیں بچا سکتا۔

اللہ کے دوستوں کو ملال نہیں ہوتا۔ کسی شے کے کم ہونے یا گم ہونے سے ملال پیدا ہوتا ہے۔ اگر انسان اپنے کسی حاصل پر ہمیشہ قابض رہنے کی خواہش نکال دے تو ملال پیدا نہیں ہوگا مثلاً اپنے حسن، اپنی جوانی کو ہمیشہ قائم رکھنے کی لاحاصل خواہش نہ کی جائے، تو کبھی ملال نہیں ہوگا۔ خوف اور حزن، حاصل کو مستحکم بنانے کی خواہش اور کوشش کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔

زندگی کو ہمیشہ زندہ رکھنے کی خواہش موت کے خوف سے نہیں بچ سکتی۔ زندگی صرف ماضی اور مستقبل کے سنگم کا نام ہے۔ ماضی اور مستقبل دونوں ہمارے اختیار میں نہیں۔ حال پر اختیار برقرار رکھنے کی سعی ناکام خوف کے سوا کچھ پیدا نہیں کر سکتی۔

خود کو محفوظ بنانے کی خواہش غیر محفوظ ہونے کا اعلان ہی تو ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ شاید زندگی اپنے اندر گرتی رہتی ہے، ریت کی دیوار کی طرح۔ اسے کسی آندھی یا طوفان کے تکلف کی ضرورت نہیں۔ انسان کا وجود اور ارادہ اندر سے مفلوج ہوتے ہیں۔ باہر کے موسم تو ہمیشہ وہی رہتے ہیں۔ بہاریں اور خزائیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ لیکن ہم اپنے اندر بے نام اندیشے پالتے رہنے کی وجہ سے یکسر بدل جاتے

جاتے تو تعمیرِ حیات کی ہیں اور پھر ہمیں نہ بہار راس آتی ہے اور نہ خزاں۔ انسان اندر سے ٹوٹ جائے تو تعمیرِ حیات کی کتابیں مدد نہیں کر سکتیں۔

خوف اس انسان کو اُس انسان سے آتا ہے جس کو وہ خوف زدہ کرتا ہے۔ ہمارے رُتبے اور مرتبے، ان لوگوں میں خوف پیدا کرتے ہیں جو ان مراتب کے خواہاں ہوں۔ ہمارے خوف کی وجہ سے وہ دل ہی دل میں ہمیں ناپسند کرتے ہیں اور پھر یہی ناپسندیدگی ان کے چہروں پر سوالات لکھتی ہے اور ان سوالات کو پڑھ کر ہم خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ امیر آدمی جب غریبوں کو ناراض دیکھتا ہے تو اسے ان سے خوف محسوس ہوتا ہے کہ یہ گونگا خطرہ اگر زبان کھول دے تو جانے کیا ہو جائے۔

ہر ظالم کو مظلوم سے خوف محسوس ہوتا رہتا ہے۔ ڈرنے والا ہی ڈرانے والا بن جاتا ہے۔ ہم جس دشمن سے ڈرتے ہیں وہ بھی تو ہم سے ڈرتا ہے۔ بارڈر کے پاس ہمارا خوف پرورش پاتا رہتا ہے۔ جس نے ہمارا سکون برباد کیا، اس کو کب چین نصیب ہو سکتا ہے۔ یہ قانونِ فطرت ہے۔ اندھیرا اجالا ایک دوسرے سے ڈرتے ہی رہتے ہیں۔

پیسے گننے اور جمع کرنے والا غریب ہو جانے کے ڈر سے سو نہیں سکتا۔ باغی لوگ حکومت سے ڈرتے ہیں۔ حکومتیں بغاوتوں سے ڈرتی ہیں اور ڈرنا بھی چاہیے۔

طلبہ اساتذہ سے ڈرتے ہیں اور اساتذہ طلبہ سے ڈرتے ہیں۔ ڈرانے والا بہرحال ڈرتا ہے۔

خوف ایک حد تک تو خیر جائز ہے۔ خوف احتیاط پیدا کرتا ہے اور احتیاط زندگی کے تیز سفر میں ایک موزوں اور مناسب عمل ہے۔ لیکن ایک حد سے زیادہ خوف ہو تو انسان کا سارا تشخص، اس کی ساری سائیکی (PSYCHE) اس کا باطنی وجود، سب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ خوف خون کی رنگت اور ہڈیوں کا گودا ختم کر دیتا ہے۔

خوف زدہ انسان پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سے ڈرتا ہے۔ سرسراہٹ سے ڈرتا ہے۔ وہ آنے والوں سے ڈرتا ہے۔ وہ ہر ایک سے ڈرتا ہے۔ اپنے آپ سے ڈرتا ہے۔ اپنے ماضی سے ڈرتا ہے۔ اپنے حال سے ڈرتا ہے۔ اپنے مستقبل سے ڈرتا ہے، بلکہ اپنے پرائے یہاں تک کہ اپنے ہی سائے

سے ڈرتا ہے۔ خوف اگر ایک بار دل میں بیٹھ جائے تو پھر وجہ کے بغیر ہی خوف پیدا ہوتا رہتا ہے۔ ڈرتے ہوئے انسان کے لیے ہر امکان ایک ٹریجڈی ہے۔ اس کے لیے ہر واقعہ ایک حادثہ ہے۔

خوف زدہ انسان خود کو اس بھری ہوئی دنیا میں تنہا محسوس کرتا ہے۔ خوف احساسِ تنہائی ضرور پیدا کرتا ہے۔ خوف زدہ انسان کی مثال ایسے ہے جیسے کسی وسیع صحرا میں تنہا مسافر کو رات آ جائے۔ اور جب انسان اپنے وجود سے بے خبر ہو، اسے اپنے وجود کا احساس بھی مشکل سے ہوتا ہے۔

خوف سے بچنے کا واحد مناسب اور سہل طریقہ یہی ہے کہ انسان میں خدا کا خوف پیدا ہو جائے۔ یہ خوف، ہر خوف سے نجات دلاتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دے تو ہر خوف ختم ہو جاتا ہے۔ اگر منشائے الٰہی کو مان لیا جائے تو نہ زندگی کا خوف رہتا ہے نہ موت کا۔ نہ امیری کا نہ غریبی کا۔ نہ عزت کی تمنا نہ ذلت کا ڈر۔ یہ سب اس کے انداز ہیں۔ وہ جو چاہے عطا کرے۔ ہمیں راضی رہنا ہے۔ ورنہ ہماری سرکشی اور خود پسندی کی سزا صرف یہی ہے کہ ہمیں اندر سے دبوچ لیا جائے۔ ظاہر کے جسم میں تو کوئی خراش نہ ہو لیکن اندر سے باطنی وجود قاش قاش اور پاش پاش ہو چکا ہو۔

جب زمین والوں کی بداعمالیاں حد سے بڑھ جائیں تو آسمان سے عذاب کا دیباچہ خوف کی صورت میں نازل ہوتا ہے۔ ممالک، حکومتیں، معاشرے، تہذیبیں، افراد غرضیکہ ہر ذی جان خوف زدہ ہوتا ہے۔ ہر شخص یہی محسوس کرتا ہے کہ نہ جانے کب کیا ہو جائے۔ ہر ارتقاء اندیشے سے دوچار ہوتا ہے۔ ہر شے ایک بے نام اندیشے کے سائے میں لپٹی ہوئی نظر آتی ہے۔

جب انسان خدا سے دور ہو جائے تو سکون انسان سے دور کر دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ اندیشہ اور خوف مسلط کر دیا جاتا ہے۔

جب زندگی اپنی افادیت، معنویت اور تقدیس کھو دے تو نتیجہ خوف کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے۔ انسان جب انسانیت ترک کر دے تو اسے خوف سے بچانا مشکل ہے۔ خوف اور مسلسل خوف، بے وجہ اور بے معنی خوف ایک عذاب ہے۔ اس کربِ مسلسل سے بچنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ

انسان خوفِ خدا رکھے۔ انسان یہ نہ بھولے کہ اس کا قیام عارضی ہے۔ اسے ضرور اسی راستے پر گامزن ہونا ہے جس پر اس کے آباؤ اجداد سفر کر گئے۔ خیال اور عمل کا فرق کم کرنے سے خوف کم ہو جاتا ہے اپنے حاصل اور حق میں فرق مٹ جائے تو خوف مٹ جاتا ہے۔

خوف کسی غلطی، کسی غفلت، کسی گناہ اور کسی جُرم کی یاد دہی کا نام ہے۔ خوف خود کوئی شے نہیں۔ یہ صرف نشان دہی ہے، کسی ناروا عمل کی۔ کسی نامناسب رویے کا نتیجہ ہے۔

خوف زدہ انسان اوّل تو کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا اور اگر کر بھی لے تو غلط فیصلہ کر جاتا ہے۔ خوف اعصاب شکن بیماری ہے۔ اس سے انسان کی تمام فکری صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں اور اس کی شخصیت ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔

خوف کا پسندیدہ مسکن اس انسان کا دل ہے جس میں احساسِ گناہ تو ہو لیکن گناہ چھوڑنے کی طاقت نہ ہو۔ خوف زدہ انسان کی ہر بازی مات، ہر جنگ شکست اور ہر کوشش ناکام ہوتی ہے۔ خوف، خوراک سے طاقت اور نیند سے راحت چھین لیتا ہے۔ سب سے بدقسمت ہے وہ انسان جو اپنے مستقبل سے خائف ہو۔ جدا ہونے والے ہمراز اور ادب نہ کرنے والی اولاد سے خوف آتا ہے۔

اگر خیال کی اصلاح ہو جائے تو خوف دُور ہو سکتا ہے۔ ماضی کی غلطیوں پر توبہ کر لی جائے تو خوف دُور ہو جاتا ہے۔

اللہ کی رحمت پر بھروسہ کر لیا جائے، اس کے فضل سے مایوسی نہ ہونے دی جائے تو خوف نہیں رہتا۔ کوئی رات ایسی نہیں جو ختم نہ ہوئی ہو، کوئی غلطی ایسی نہیں جو معاف نہ کی جا سکے۔ کوئی انسان ایسا نہیں جس پر رحمت کے دروازے بند ہوں، رحم کرنے والے کا کام ہی یہی ہے کہ رحم کرے۔ رحم اس فضل کو کہتے ہیں جو انسانوں پر ان کی خامیوں کے باوجود کیا جائے۔ اور یہ رحم ہوتا ہی رہتا ہے۔ کسی کو خوف زدہ نہ کیا جائے تو خوف کا عذاب ٹل جاتا ہے۔ دعا سے خوف دُور ہوتا ہے اور دعا کا حاصل اور اس کا ماحصل ہی یہی ہے کہ یہ ہمیں ہمارے خوف سے نجات دلاتی ہے۔



صاحبِ حال

جس طرح مشاہدہ کا بیان مشاہدہ نہیں ہوتا، اسی طرح صاحبِ حال پڑھنے یا سننے والی بات نہیں، وہ دیکھنے والی شے ہے۔ اس کے جلوے خرد اور جنوں کی سرحدوں پر ہوتے ہیں۔ جہاں اہلِ عقل کی حد ہے، وہاں سے صاحبِ دل کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ جذب اور سلوک کے درمیان ایک منزل ہے، جسے حال کہتے ہیں اور جہاں ہونا نہ ہونا ہے اور نہ ہونا عین ہونا ہے۔ صاحبِ حال اس مقام پر ہوتا ہے، جہاں قال کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ الفاظ حقیقت کو محجوب کر دیتے ہیں۔ کہنے والا کچھ اور کہہ رہا ہوتا ہے اور سننے والا کچھ اور سننے لگ جاتا ہے۔ اسی لیے صاحبِ حال الفاظ سے گریزاں ہوتا ہے۔ وہ اس کائنات میں نئی کائنات دریافت کر چکا ہوتا ہے۔ وہ ظاہر سے باطن کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اسم سے مسمّیٰ دریافت کرتا ہے۔ نعمت سے منعم کا عرفان حاصل کرتا ہے۔ وہ مطلع انوارِ صبح سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے اور اس کی نگاہ ڈوبتے سورج کی لاش پر بھی ہوتی ہے۔ صاحبِ حال قطرے میں قلزم اور ذرے میں صحرا کو دیکھنے کی قدرت رکھتا ہے۔ صاحبِ حال تغیّر و تبدّل سے مرعوب و متاثر نہیں ہوتا۔ موسم بدلتے ہیں، زمین و آسمان کے جلوے بدلتے ہیں، آغاز و انجام کے رشتے بدلتے ہیں، لیکن صاحبِ حال نہیں بدلتا۔ وہ زندگی اور موت کو ایک حقیقت کے دو رُخ سمجھتا ہے۔ وہ غم اور خوشی سے نجات پا چکا ہوتا ہے۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل کو ایک ہی زمانہ سمجھتا ہے۔ وہ زمین و آسمان کے انوکھے رشتوں کا مفسّر ہوتا ہے۔ اس فنا کے دیس میں صاحبِ حال ملکِ بقا کا سفیر ہے۔ صاحبِ حال اس زمانے میں کسی اور زمانے کا پیغام رساں ہے۔ وہ ایسا صاحبِ جنوں ہے جو خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہے۔ اس کی نگاہ سات

رنگوں سے بہت آگے ہوتی ہے۔ وہ بے رنگ کے نیرنگ سے آشنا ہوتا ہے۔صاحبِ حال کیفیت کے اس مقام پر ہوتا ہے، جہاں تحیر بھی ہے اور شعور بھی۔جہاں وارفتگی بھی ہے اور آگہی بھی۔ صاحبِ حال اسماء اور اشیاء کے معانی اور مفاہیم سے باخبر ہوتا ہے۔وہ اس منزل پر ہوتا ہے جہاں سفر ہی مدعائے سفر ہے۔ وہ خود آگہی کے ایسے دشتِ وحشت میں پہنچ چکا ہوتا ہے' جہاں نہ فراق ہے نہ وصال، نہ کوئی اپنا ہے نہ غیر۔ وہ سکوت سے ہم کلام رہتا ہے۔ وہ ذروں کے دل کی دھڑکن سنتا ہے۔ اس کی نگاہ وجود اور بےوجود کے باطن پر بھی ہوتی ہے اور عدم اور ناموجود کی حقیقت پر بھی۔ وہ ذات اور صفات کے تعلق سے آشنا ہوتا ہے۔وہ جانتا ہے کہ عیاں کا رابطہ ہر حال میں "نہاں" سے قائم رہتا ہے۔ صاحبِ حال خود ہی آخری سوال ہے اور خود ہی اس کا آخری جواب۔

صاحبِ حال بغیر حال کے سمجھ میں نہیں آتا۔اس کا قال بھی حال ہے اور خاموشی بھی حال۔ بہر حال صاحبِ حال اپنے وجود میں اپنے علاوہ بھی موجود رہتا ہے معلوم اور نامعلوم کے سنگم پر صاحبِ حال گنگناتا ہے۔ آپ ایک ایسے انسان کا اندازہ کریں جس کی ایک ہتھیلی پر آگ ہو اور دوسری پر برف۔ وہ نہ آگ بجھنے دیتا ہے، نہ برف کا انجماد ٹوٹنے دیتا ہے۔ وہ ایک ایسی جلوہ گاہ میں محو کھڑا ہوتا ہے، جہاں آنکھ کی راہ میں بینائی کا پردہ حائل نہیں ہوتا۔ اس کی پیشانی زمین پر ہو، تو اس کی سجدہ گاہ آسمان پر ہوتی ہے۔ وہ کسی کو نزدیک سے پکارتا ہے اور جواب دینے والا دور سے جواب دیتا ہے۔اس کا دل اس کی آنکھ میں ہوتا ہے اور آنکھ دل میں ہوتی ہے۔ صاحبِ حال "نمی دانم" کے پردے میں دانائی کے چراغ جلاتا ہے۔ اس کی خاموشی میں جمالِ گفتگو کے جلوے ہوتے ہیں۔ اس کے قرب میں انسان اپنے آپ سے دُور ہو جاتا ہے۔ اس کی محفل میں گردشِ زمان و مکاں رک سی جاتی ہے۔

صاحبِ حال کوئی انوکھی مخلوق نہیں۔ وہ انسان ہے۔ انسانوں کی دنیا میں انسانوں کے درمیان رہتا ہے۔ اس کا اندازِ نظر انسانوں سے جُدا ہوتا ہے۔ وہ معمولی سے واقعہ کو غیر معمولی اہمیت

دیتا ہے۔ درخت سے پتا گرے تو وہ پکار اُٹھتا ہے ۔

پتّا ٹوٹا ڈال سے لے گئی پون اُڑا

اب کے بچھڑے کب ملیں گے دور پڑیں گے جا

ایک صاحبِ حال نے جنازہ دیکھا۔ پوچھا "یہ کیا ہے؟" جواب ملا "زندگی کی آخری منزل"۔ بولا "اگر یہ آخری منزل ہے تو ہم کون سی منزل میں ہیں۔ کیوں نہ آخری منزل کو دیکھا جائے۔" ملبس تخت چھوڑ دیا، شہر چھوڑ دیا، جنگل کی راہ لی اور پھر راز آشنا ہوگیا۔

موسیٰ علیہ السلام کی صاحبِ حال سے ملاقات ہوئی۔ ایک دور کا پیغمبر اپنے دور کے صاحبِ حال سے مل کر حیران رہ گیا کہ یہ کون سا علم ہے؟ کتاب کا علم اکتاب کا علم تو موسیٰؑ کے پاس بھی تھا بلکہ کتاب ہی موسیٰؑ کے پاس تھی۔ صاحبِ حال کسی اور زمانے کے واقعات میں مصروف تھا۔ موسیٰؑ اپنے زمانے کا حال دیکھ رہے تھے۔ نتیجہ "ھٰذا فراق بینی و بینکم" یعنی جدائی۔ موسیٰؑ کے عرفان میں شک نہیں ہو سکتا۔ آپ کے مقام پر شک نہیں ہو سکتا۔ آپ کی بصیرت پر شک نہیں۔ آپ کے عصا، یدِبیضا اور کلیمی پر شک نہیں، لیکن صاحبِ حال آپ کی پہچان میں نہ آسکا۔ صاحبِ حال کا علم "لدُنی" ہے، مخفی ہے۔ اسے اللہ کی عنایت کا خصوصی مظہر کہنا چاہیے۔

ایک صاحبِ حال کا ذکر MATHEW ARNOLD نے اپنی نظم سکالر جپسی SCHOLAR GIPSY میں کیا ہے کہ ایک آدمی علمِ ظاہری کی اذیّت سے تنگ آکر علمِ باطن کے سفر پر نکل گیا۔ آکسفورڈ سے بھاگا ہوا طالبِ علم، علم کی طلب میں سرگرداں رہا۔ علم سے بھاگ کر علم میں داخل ہونا ہی صاحبِ حال کا کام ہے۔ وہ علم اور ہے۔ اس کی تلاش میں انسان زندگی سے نکل جاتا ہے اور پھر موت سے بھی نکل جاتا ہے اور پھر حیاتِ جاوداں پالیتا ہے۔ سکالر جپسی ہر زمانے کو آکر بتاتا رہا کہ جو ایک ہوگیا، یکتا ہوگیا۔ وہ مر نہیں سکتا۔ وحدت کو موت نہیں اور کثرت موت سے بچ نہیں سکتی۔ جو بدلتا نہیں مرتا نہیں، جو تبدیل ہوتا ہے مرتا ہے۔

ایک صاحبِ حال مولانا رومؒ سے ملا۔ بولا "مولانا! یہ کیا علم ہے؟" مولانا نے کہا "اے آپ

نہیں جانتے۔ صاحبِ حال نے اپنا علم ظاہر کیا۔ مولانا بولے یہ کیا علم ہے؟ صاحبِ حال بولا یہ تم نہیں جانتے۔ بس پھر اس کے بعد مولانا رومؒ، غلامِ شمس تبریزؒ ہو کر رہ گئے۔ مولانا بھی صاحبِ حال ہو گئے۔ صاحبِ مثنوی ہو گئے۔ ایسی مثنوی کہ قلوب کی خشک زمین پر عشقِ حقیقت کی نورانی برسات ہے۔ مثنوی صاحبِ حال بناتی ہے۔ پیرِ رومیؒ کی محبت میں مریدِ ہندیؒ صاحبِ حال ہو گیا بلکہ صاحبِ اقبال باکمال ہو گیا۔

صاحبِ حال صاحبِ عشق ہوتا ہے۔ صاحبِ وجدان ہوتا ہے۔ صاحبِ مشاہدہ ہوتا ہے۔ صاحبِ یقین ہوتا ہے۔ صاحبِ ایمان ہوتا ہے۔ صاحبِ نسبت ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ صاحبِ نصیب ہوتا ہے۔ صاحبِ حال کو مردِ حق آگاہ کہا گیا ہے کہیں اسے سُپرمین (SUPER MAN) کہا گیا ہے۔ کبھی اسے صرف مردِ مومن بھی کہتے ہیں۔ صاحبِ حال حق آگہی حق شناسی کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے، جہاں وہ اناالحق کہہ اٹھتا ہے۔ اس ایک اناالحق میں کتنی حقیقتیں پنہاں ہوتی ہیں۔ یہ کوئی صاحبِ حال ہی جان سکتا ہے۔

صاحبِ حال میں نغمگی کا ہونا لازمی ہے۔ وہ بصد سامانِ رسوائی سرِ بازار رقص کرتا ہے۔ صاحبِ حال کے رقص میں بڑے رموز ہیں۔ صاحبانِ حال کشتگانِ خنجرِ تسلیم ضرور ہوتے ہیں۔ دیکھنے اور سوچنے والی بات یہ ہے کہ اس کائنات میں صاحبِ حال پیدا کرنے والی نگاہ ضرور کارفرما ہے۔ کوئی ہے اس پردے کے پیچھے، کسی کا ہاتھ ضرور ہے جو ان لوگوں کو حال عطا کرتا ہے۔ کوئی ایسی ذات موجود ہے، جس کا قرب انسان کو صاحبِ حال بنا دیتا ہے۔ ایسی ذات جو نظر ملا کر انسان کو بدل کے رکھ دیتی ہے۔ دیکھنے والے بے خبر رہتے ہیں اور بدلنے والا بدل چکا ہوتا ہے۔ وہ ذات علمِ لدُنّی کے خزانے لٹاتی ہے اور پھر صاحبِ حال جہاں جہاں سے گزرے، راستے جگمگا اُٹھتے ہیں۔ صاحبِ حال بنانے والی ذات پر سلام ہو۔

صاحبِ حال بننے والے انسانوں کو غور سے دیکھا جائے تو ان کی فطرت میں وفا اور استقامت کی بنیادی خوبی ضرور ہوتی ہے۔ ایک ایسا انسان جو صاحبِ علم نہ بھی ہو، اپنے عمل کی استقامت

سے صاحبِ حال بن سکتا ہے اور صاحبِ حال ہو جانے کے بعد اس کا صاحبِ علم ہو جانا پہلا قدم ہے۔ مثلاً آپ ایک آرٹسٹ کو دیکھیں جو خلوص سے تصویر بناتا ہے۔ زندگی بھر استقامت سے فن کی خدمت کرتا ہے۔ ایک صبح نہ جانے کیوں اس کا برش برہنگی اجسام کو کینوس پر اتارتے اتارتے خطاطی کے شہ پارے پیش کرنے لگتا ہے۔ وہ قرآنی آیات کے حسن میں ایسا محو ہوتا ہے کہ اس کا باطن روشن کر دیا جاتا ہے اور وہ صاحبِ حال بن چکا ہوتا ہے۔ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ تو اور آدمی تھا اور اب کیسے ہو گیا۔ بس ہو گیا۔ بنانے والے نے بنا دیا۔ وہ کافروں کو ایمان عطا کرتا ہے۔ اندھیروں کو روشنی بخشتا ہے۔ عاصیوں کو معاف کرتا ہے اور صاحبانِ استقامت کو اپنے لطف میں داخل فرما کر صاحبانِ حال بنا دیتا ہے۔ فتویٰ اس کے خلاف ہوتا ہے لیکن حقیقت اور صداقت صاحبِ حال کے پاس ہوتی ہے۔

اسی طرح اگر کوئی مصنف علم کو خدا کا فضل سمجھنے والا تحلیلِ جاں کے مراحل سے استقامت و صبر سے گزرے، تو اسے وہ نگاہ قبول فرما لیتی ہے۔ پھر اس کے اعمال و احوال یکسر بدل جاتے ہیں۔ وہ قیدِ وجود سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اسے بے نیازِ غمِ دوراں کر دیا جاتا ہے۔ اب یہاں فتویٰ کیا کرے گا۔ قبول کرنے والا قبول کر رہا ہے، تو ہم اعتراض کرنے والے کون ہیں۔ اگر سائیں کا فضل کسی کو صاحبِ حال بنا دے، تو ہم کیوں برہم ہوں۔

اعتراض کرنے والے فارمولا استعمال کرتے ہیں۔ قانون استعمال کرتے ہیں۔ قاعدہ کلیہ استعمال کرتے ہیں اور صاحبِ حال فارمولے سے باہر ہوتا ہے۔ فتویٰ اقبال کے خلاف تھا اور فطرت اس کی آنکھ میں خاکِ مدینہ و نجف کا سُرمہ لگا رہی تھی۔ وہ دانائے راز بنا دیا گیا۔ اسے فقیری عطا ہوئی، قلندری ملی۔ وہ اُبدیشک ہو گیا۔ غبارِ راہِ حجاز ہو گیا۔ مفتی اس کے خلاف رہے فطرت اس کے ساتھ ہو گئی۔ اقبال کا صاحبِ حال ہونا مخالفینِ اقبال کو صاحبانِ حال بننے سے محروم کر گیا۔ یہ اس نگاہ کے فیصلے ہیں۔ اس کی عطا کے کرشمے ہیں۔ عمل کسی اور رخ کا ہوتا ہے، فضل کسی اور طرف پہنچا دیتا ہے۔ کوئی سمجھے تو کیا سمجھے، کوئی جانے تو کیا جانے۔

صاحبانِ حال کے سلسلے میں قائدِ اعظمؒ کی مثال سب سے اہم ہے۔ وہ استقامت وصداقت کا پیکر قائدِ اعظم کہلانے کے لیے کوشش نہیں کر رہا تھا۔ وہ مسلمانوں کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھا۔ اس کے خلوص کو فطرت نے منظور کیا۔ اسے صاحبِ حال بنا دیا۔ فتویٰ اس کے خلاف تھا لیکن فطرت اور حقیقت اس کے ساتھ تھی۔ اسے قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ بنا دیا گیا۔ اہلِ شرع کا ایک گروہ اس بات کو اور اس واردات کو نہ پہچان سکا۔ معترض رہا۔ اہلِ باطن پہچان گئے کہ یہ کسی کی نگاہ کی بات ہے۔ یہ فیض ہے کسی ذات کا۔ یہ نصیب کا فیصلہ ہے۔ اہلِ باطن قائدِ اعظم کے ساتھ ہو گئے، منزل مل گئی۔ ملک بن گیا۔ فتویٰ دینے والے آج تک نہ سمجھ سکے کہ یہ کیا راز تھا۔ قائدِ اعظم دلوں میں اُتر گئے اور مخالفین دلوں سے اُتر گئے۔

جس طرح ہمارے ہاں طریقت کے سلاسل ہیں۔ چشتی، قادری، نقشبندی، سہروردی وغیرہ اور ہر سلسلہ کا کوئی بانی ہے، اسی طرح قائدِ اعظمؒ سے ایک نئی طریقت کا آغاز ہوتا ہے اور وہ طریقت ہے "پاکستانی"۔ اس طریقت میں تمام سلاسل اور تمام فرقے شامل ہیں۔ ہر "پاکستانی" پاکستان سے محبت کو ایمان کا حصّہ سمجھتا ہے۔ ہمارے لیے ہمارا وطن خاکِ حرم سے کم نہیں۔ اقبال نے مسلمانوں کو وحدتِ افکار عطا کی، قائدِ اعظمؒ نے وحدتِ کردار۔

آج اگر قوم میں کوئی انتشارِ خیال ہے تو اس لیے کہ وحدتِ عمل نہیں۔ وحدتِ فکر و عمل عطا کرنا وقت کے صاحبِ حال کا کام ہے۔ صاحبِ حال بنانے والی نگاہ کسی وقت بھی مہربانی کر سکتی ہے۔ وہ نگاہ ہی تو مشکل کشا ہے۔ نہ جانے کب کوئی صاحبِ حال قطرۂ شبنم کی طرح نوکِ خار پہ رقص کرتا ہوا آئے اور قوم کے دل و نگاہ میں سماتا ہوا وحدتِ عمل پیدا کر جائے۔ اور ایک بار پھر

"ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی"

وقت کے صاحبِ حال کی خدمت میں بھی سلام۔



یہ کائنات

یہ کائنات جہاں آئینۂ جمال ہے، وہاں یہی کائنات مظہرِ صفاتِ الٰہیہ اور مظہرِ صفاتِ انسانیہ ہے۔ کائنات میں رونما ہونے والا ہر واقعہ، ہر عمل اور ہر کرشمہ انسان کی داخلی اور ذاتی کائنات میں منعکس ہوتا ہے۔ سیاروں اور ستاروں کی چال اور رفتار سے لے کر ایک معمولی سی حقیر چیونٹی تک، ہر شے اپنے اندر ایک عجب پیغام رکھتی ہے۔ ہر شے ایک علامت ہے، خوبصورت علامت اور ہر شے میں ایک استعارہ ہے، ایک بامعنی استعارہ۔

یہ کائنات مرقّع نور ہے۔ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کہکشاؤں کے عظیم اور وسیع سلسلے، شمس و قمر کے جلوے، چمکنے والے ستاروں کی یہ حسین کائنات اتنی منوّر ہے کہ یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ اس کو تخلیق کرنے والا خود زمین اور آسمانوں کا نور ہے۔ اتنی روشن کائنات ایک روشن دلیل ہے، اپنے نورانی خالق کی۔

اگر ذوقِ نظر میسّر ہو تو یہ کائنات ایک عجب تماشا ہے۔ کرنوں میں آفتاب ہیں، قطروں میں بحر ہیں، دریا حباب میں ہے، ذرّوں میں دشت ہیں۔ دیکھنے والی نظر ہو تو نظاروں کی کمی نہیں۔

اس کائنات کی وسعتوں کے بارے میں جو کچھ بھی کہہ دیا جائے، بلا مبالغہ ہوگا۔ ہم ایک سُورج سے وابستہ ہیں اور اس کائنات میں ایسے کروڑوں سُورج موجود ہیں۔ ایسے سیّارے اور ستارے دریافت ہو چکے ہیں، جن کا زمین سے فاصلہ ہزاروں لاکھوں سال "نُور" ہے۔ یعنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چلنے والی روشنی ایک ستارے سے زمین پر آنے میں لاکھوں سال لیتی ہے۔ اللہ اللہ یہ وسعت، انسان سوچ کر ہی سہم جاتا ہے۔ اس وسیع کائنات میں زمین کی کیا حیثیت، اور زمین میں

ایک ملک کی کیا اہمیت! اور ملک میں ایک شہر اور شہر میں ایک مکان اور مکان میں ایک انسان کی کیا اہمیت! اور پھر اس انسان میں ایک چھوٹا سا دماغ کیا جسارت کرے گا، اس وسیع کائنات کے عظیم خالق کے بارے میں لب کشائی کرنے کی۔ مقامِ تحیر اور مقامِ سکوت ہے۔

اسی کائنات میں ایسے علاقے ہیں جہاں اتنی سردی ہے کہ بس انسان ذکر کرے تو خیال منجمد ہو جائے اور کہیں اتنی حدت کہ سورج بھی پناہ مانگے۔ یہ کائنات عجب ہے۔ تخلیق اپنے خالق کی مظہر ہے۔

جس خالق نے اس کائنات کو تخلیق کا حیران کن مظہر بنایا، اسی خالق نے انسان کو بڑے دعوے اور وثوق سے اشرف المخلوقات پیدا فرمایا۔ یہ ایک عظیم احسان ہے عظیم محسن کا۔ انسان کو بینائی عطا فرمانے والا، اپنے بے مثال حسن کے پرتو میں اس کائنات کی ہمہ رنگ نیرنگیوں اور رنگینیوں میں جلوہ گر ہے۔

انسان کی پہچان کے لیے کائنات کو آسمان اور زمین کے حوالے سے ظاہر فرمایا گیا۔ انسان اپنی ہستی کا سفر زمین پر ہی شروع کرتا ہے اور یہ سفر یہیں تمام ہوتا ہے۔ انسان کے گرد پھیلی ہوئی زندگی اس کے علم کے وسیع ابواب ہیں۔ اسے علم الاسماء عطا فرمایا گیا۔ وہ اسماء سے اشیاء کو پہچانتا ہے اور پھر اشیاء سے مفاہیم تلاش کرتا ہے اور اسے ہر طرف پھیلے ہوئے سلسلے، اپنی صلاحیتوں اور صفات کے استعارے نظر آتے ہیں۔ انسان کی کائنات حسین وجمیل علامتوں کی کائنات ہے۔

یہی وہ راز ہے، جو انسان کو جاننے والا بناتا ہے۔ انسان ظاہر سے باطن اور باطن سے ظاہر کا سفر کرنے کے لیے پیدا کیا گیا۔ وہ وجوہ سے نتائج اور نتائج سے وجوہ تلاش کرتا ہے۔ وہ ہر شے کے اندر پنہاں اس جوہر کو ڈھونڈتا ہے، جو اس شے کی پہچان ہے، اس شے کا راز ہے اور یہ راز اور یہ جوہر اور یہ صفت انسان کی اپنی کسی صفت کا مظہر ہوتی ہے۔

شعر و ادب کی دنیا میں انسان نے مظاہر فطرت کو استعاروں اور علامتوں کے روپ میں شامل کیا ہے اور اس طرح اس نے جہاں اپنی زندگی کو پُرلطف بنایا، وہاں اس نے ہر ذی جان اور

بے جان شے کو اسم دیا اور اس کو معنی عطا کیے۔

پہاڑوں کو انسان نے اپنے عزم کا مظہر کہا۔ نہ بدلنے والا اٹل ارادہ' پہاڑ کی طرح اپنی جگہ سے نہ ہلنے والا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ارشاد فرمایا کہ "پھر تمہارے دل سخت ہو گئے' جیسے وہ پتھر ہوں حالانکہ میں نے پتھروں سے بھی نہریں جاری کی ہیں۔" گویا پتھر سے دریا کا نکلنا ایسے ہے جیسے سخت دل انسان کا دل بھر آنا یا آنکھ سے آنسو کا بہنا۔

دریا کو زندگی کا دریا کہا گیا' جو موت کے سمندر میں ڈوبتا ہے۔ ہر دریا آخر کار تاریک سمندر میں گر جاتا ہے۔ وقت دریا ہے اور لوگ تنکوں کی طرح اس میں بہتے چلے جا رہے ہیں۔

دشت و صحرا کو بھی عجب معنی ملے۔ دشتِ جنوں، دشتِ وحشت، یادوں کا صحرا، چھوٹے کا تھل، دشتِ فرقت اور پھر صحرا کی پیاس۔ یہ سب اہلِ ذوق کے پُرمغز استعارے ہیں۔

سمندر کو ہستی کا آغاز و انجام کہا گیا۔ انسان بادلوں کی طرح سمندر سے آتا ہے اور واپس سمندر کو چلا جاتا ہے کہ یہی اس کا گھر ہے' یہی خالق ہے یا مظہرِ تخلیق ہے۔

سمندر یا قلزم سے بڑے معنی وابستہ ہیں۔ بڑے استعارے ہیں۔ بڑی علامتیں ہیں۔ سمندر روح ہے۔ نصف شب کو جاگتا ہے۔ طوفان میں ہو تو کناروں کو اڑا دے' پُرسکون ہو تب بھی گہرائی کی وجہ سے پُرخوف ہو۔ سمندر مُردار کو باہر نکال پھینکتا ہے۔ اس کے باطن میں خزانے ہیں' موتیوں کے' زندگی کے اور اس کے اندر انسان کے لیے بڑے علوم ہیں۔ جب تک سمندر زندہ ہے' زندگی ختم نہیں ہو سکتی۔ سمندر گہرا ہے' کڑوا ہے۔ ناقابلِ تسخیر وسعت کو سمندر کہا گیا۔ فیاضی اور علم کے پیکر کو سمندر کہتے ہیں۔ قُلزمِ رحمت، وسیع و بے پایاں' صفتِ الٰہی ہے۔ اور پھر سمندر خاموش ہو گیا یعنی محبت کی امواج میں ٹھہراؤ کا مقام۔ موج کے نام سے کتنا ہی لٹریچر موجود ہے۔

آئیے دیکھیں! انسان نے اپنے گرد رہنے والے جانداروں سے کیا حاصل کیا۔ انہیں کیسے کیسے معنی دیے۔ ان سے کیا کیا سبق، عبرت اور نتیجے نکالے۔

پرندوں کی دُنیا میں شاہین کو لیجیے۔ مردِ مومن ہی شاہین ہے۔ پرندوں کی دنیا کا درویش ہے۔ آشیانہ نہیں بناتا۔ بلند پرواز ہے۔ بلند نگاہ ہے۔ پہاڑوں کی چٹانوں میں رہتا ہے۔ قصرِ سُلطانی سے گریز کرتا ہے۔ یہ ایک مردِ حُر کی صفاتِ عالیہ ہیں۔

ایک آزاد قوم کے لیے شاہین ایک بہت بڑا استعارہ ہے۔ سورج کو نگاہ میں نہیں لاتا۔ مَر جائے تب بھی زمین پر نہیں گرتا۔ اس کی نگاہ آسمانوں پر رہتی ہے۔ اس کا رزق صالح اور پاکیزہ ہے یعنی زندہ کبوتر شکار کرتا ہے۔ شاہین مانگ کے نہیں کھاتا۔ قانع ہے۔ غیرت والا ہے۔ متوکل ہے، قوی ہے۔ جھپٹتا ہے۔ پلٹتا ہے۔ خون گرم رکھتا ہے۔ نگاہ تیز رکھتا ہے۔ درویشی میں بادشاہی کرتا ہے اور بادشاہی میں درویشی کرتا ہے۔ اقبالؔ کا شاہین ہی اقبالؔ کا مردِ مومن ہے۔ اقبالؔ نے جوانوں میں عقابی رُوح کے بیدار ہونے کی دُعا کی ہے۔ عقابی رُوح کا کام ہے آسمانوں کی طرف پرواز کرنا اور پھر شہباز لامکاں، شہبازِ طریقت، شہبازِ خطابت اور پھر ہمارے شاہین یعنی ہماری ایئر فورس۔ ایک پرندے نے کیا نہیں دیا ہمیں۔ یہی خودی کا ترجمان ہے۔ یہی محرمِ لامکاں ہے۔ یہی فاتح زمان و مکاں ہے۔ یہی شاہین رازِ ہستی کا رازداں ہے۔ شاہین بھوک سے مر جاتا ہے، لیکن مردار نہیں کھاتا۔ شاہین صفاتِ مومن کا مظہر ہے اور خودی کا نگہبان ہے۔ انسان کی خودشناسی کو پرندوں نے بڑی آسانیاں عطا فرمائی ہیں۔ گدھ یا کرگس۔ اس پر کیا کچھ نہیں لکھا جا چکا ہے، اندازہ کرنا مُشکل ہے۔ آج کے ادب میں گدھ ایک عظیم استعارہ اور علامت بن کے ظاہر ہُوا ہے۔

ایک ڈرامے میں ایک منظر دکھایا گیا کہ ایک امیر آدمی مر رہا ہے اور اس کے رشتہ دار اس کے پاس خاموش بیٹھے ہیں۔ کٹ کر کے دوسرا منظر پیش کیا گیا کہ ایک ویرانے میں ایک گھوڑا مر رہا ہے اور اس پر گِدھ منڈلا رہے ہیں۔ اب آپ گِدھ کے بارے میں اندازہ لگالیں۔ گدھ کی بلند پروازی، مُردار کی تلاش میں ہے۔

جن درختوں پر دن کے وقت چمگادڑ اُلٹے لٹکتے ہیں، انہی درختوں پر رات کو گِدھوں کا بسیرا ہوتا ہے۔ یہ تعلق اور تقرب بھی بڑا بامعنی ہے۔

گدھ کی مُردار خوری فضا کو آلودگی اور تعفن سے بھی بچاتی ہے۔ بہرحال انسانوں کی دنیا میں کرگس صفت لوگ موجود رہتے ہیں اور کرگسی عمل بھی جاری رہتا ہے۔

کبوتر اور فاختہ امن کے نشانات ہیں۔ یہ صلح اور امن کے استعارے ہیں طوطا ایک ایسا پرندہ ہے جس پر بڑے بڑے ادیبوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ مولانا رُوم نے ایک طوطے کی کہانی لکھی ہے کہ ایک سوداگر نے پنجرے میں ایک بولنے والا طوطا رکھا ہُوا تھا۔ سوداگر سفر پر جانے لگا تو اس نے طوطے سے پُوچھا کہ تیری کوئی خواہش۔ طوطے نے اپنے گرو طوطے کو پیغام بھیجا کہ آزاد فضاؤں میں رہنے والو، غریب قیدی کا سلام قبول کرو۔ سوداگر نے پیغام دیا۔ گرُو طوطا سُن کر مر گیا اور ساتھ ہی سارے طوطے گر کر مر گئے۔ سوداگر نے یہی افسوسناک خبر اپنے طوطے کو آکر بتائی، وہ بھی مر گیا۔ سوداگر نے اسے پنجرے سے نکال کر پھینک دیا۔ وہ طوطا اڑ گیا اور بولا ؟ اے سوداگر! میرے گرو نے میری فریاد پر مجھے رہائی کا یہی راستہ بتایا تھا کہ مرنے سے پہلے مر جاؤ۔ آزاد ہو جاؤ گے۔" پس یہ ہے وہ راز جو گرو مرید کو دیتا ہے۔ بہرحال طوطا، علم کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

ایک معمولی سا کوّا بھی لٹریچر کا حصہ بن گیا: "کا گا" ایک پیغام ہے "کسی آنے والے کا۔ کاگا" اڑیا پر بولتا ہے۔ "کاں" بنیرے پر بولتا ہے اور پھر پردیسی گھر آجاتے ہیں۔ کوّا منافق نہیں اندر باہر سے کالا ہے جبکہ بگلہ منافق ہے۔ باہر سے سفید اور اندر سے بد باطن۔ مچھلی کے انتظار میں مصروفِ عبادت نظر آتا ہے۔ قمری، تیتر اور چکور، آوازوں کے استعارے ہیں۔ اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے لوگ ان آوازوں کا بہت احترام کرتے ہیں۔

مور، نفس کا وہ مقام ہے جہاں انسان اپنے رنگ پر ہی مست ہو جاتے۔ ظاہر پرست انسان مور ہے، انا کا مارا ہُوا۔

اسی طرح جانوروں میں شیر کو لیں۔ اللہ کا شیر یعنی اسد اللہ۔ ایک مقام ہے، ایک صفت ہے، ایک انداز ہے ضربِ یدُاللّٰہی کا۔ شیرِ ربّانی ایک لقب ہے، ایک رُوحانی مقام ہے۔ شیر خواب میں نظر آئے تو رُوحانی فیض کی دلیل ہے۔ شیر بیباکی اور جُرأت کا مظہر ہے۔

"اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی"

جہاں شیر دلیر ہے وہاں گیدڑ بزدل، لومڑی مکار، سانپ چھپا دشمن ہے۔ چکیلا لیکن زہریلا۔ سانپ کبھی وفادار نہیں ہوتا۔

وفا کے باب میں کُتے اور گھوڑے کا ذکر آتا ہے۔ کُتا اگر کُتے کا بَیری نہ ہوتا تو کبھی نجس نہ ہوتا گھوڑے کو لٹریچر میں بڑا حصّہ ملا ہے۔ غالبؔ نے دو اشعار میں گھوڑے کو زندگی اور موت سے تعبیر کیا ہے: "زندگی کا سرکش گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا ہے، انسان سوار تو ہے لیکن بے بسی کا یہ عالم ہے کہ ہاتھ باگ پر ہے، نہ پاؤں رکاب میں۔ انسان کا ایک پاؤں ہوس کی زمین میں گڑا ہوا ہے اور دوسرا پاؤں موت کے گھوڑے کی رکاب میں ہے": زندگی اور موت کو بیان کرنے کے لیے گھوڑے سے کیا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ غرضیکہ ہر جانور، ہر پرندہ، ہر شے انسان کے لیے معنی رکھتی ہے۔ انسان غور کرے تو یہ کائنات علم کے وسیع خزانوں سے مالا مال نظر آئے گی۔ انسان کو اپنا پرتو اور اپنے خالق کا جلوہ اسی کائنات میں نظر آئے گا۔

یوسفؑ کے خواب میں آنے والے گیارہ تارے، چاند اور سُورج ان کے اپنے بھائی اور ماں باپ تھے۔ سبحان اللہ! یہ علم اس نے خود عطا کیا ہے جس نے انسان کو شاہکارِ تخلیق بنایا۔ انسان کو شرف بخشنے والے نے انسان کو علم عطا کیا۔ کائنات کا علم، کائنات کی اشیاء کا علم، کائنات کی زندگی اور اس کے حُسن کا علم۔

یہ کائنات آئینہ ہے انسان کی اپنی کائنات کا۔ ہر طرف انسان کی اپنی صفات پھیلی ہوئی ہیں۔ انسان غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ یہی کائنات انسان کا باطن ہے اور انسان اس کائنات کا باطن۔ یہ کائنات ایک کھلی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں حقیقت ہی حقیقت ہے معنی در معنی استعارہ در استعارہ، علامت در علامت۔

انسان کی کائناتِ حسن، حُسن کائنات کا خوبصورت عکس ہے۔ "چاند محبوب ہے اور چاندنی محبوب کی یاد۔ چاند دُور ہو تو چاندنی پاس ہوتی ہے۔ چاند پاس ہو تو چاندنی ختم ہو جاتی ہے۔ پھول دل میں بسنے والا دوست ہے اور کانٹا آنکھوں میں کھٹکنے والا رقیب۔

غرضیکہ لامحدود جلوہ کائنات میں موجود ہے۔ انسان کی تلاش کے لیے اور تلاشِ ذات کے لیے اسی کائنات میں ایک مخفی اور حسین کائنات موجود ہے۔ معنی کی کائنات، جلوؤں کی کائنات، انسان غور تو کرے۔



اے ہمدمِ دیرینہ

تم تو بڑے نڈر تھے۔ تم ماں باپ سے بھی نہیں ڈرتے تھے۔ تم کسی ناگہانی آفت سے کبھی خوفزدہ نہیں تھے۔ تم بڑے حوصلے والے تھے، مگر آج۔ تم اپنے سائے سے ڈر رہے ہو۔ تم اپنی اولاد سے خوفزدہ ہو۔ تمہارے بچّوں نے تمہیں کس اذیّت سے گزارا ہے۔ بے خوف دل میں خوف کا پیدا ہونا عجیب ہے۔ یہ بڑا انتشار ہے۔ بزرگوں سے کی گئی گستاخیوں کی سزا گستاخ بچّوں کی شکل میں ملتی ہے۔ بے ادب اور گستاخ اولاد والدین کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ میرے دوست، والدین کی رُوحوں سے معافی مانگو تاکہ تمہارے بچّے تمہاری عاقبت اور عبرت نہ بنیں۔ جس نے والدین کا ادب کیا، اس کی اولاد مؤدّب ہوگی۔

آج تمہارے پاس پیسہ ہے، لیکن غریبی کا ڈر بھی ہے۔ کل تک تم غریب تھے۔ تمہیں ڈر نہیں تھا۔ تم نے کبھی سوچا یہ سب کیا ہے؟ دولت جمع کرنے والا، اسے گننے والا، اس سے محبت کرنے والا کبھی سُکھی نہیں ہوتا۔ دولت کی آرزو میں غریبی کا ڈر ہے۔ غریب کو غریب ہونے کا ڈر نہیں ہوتا۔ اس کو امید ہوتی ہے کہ کبھی بھلے دن آئیں گے۔ امیر آدمی کو ڈر ہوتا ہے کہ کبھی بُرے دن نہ آجائیں۔ تمہارے بزرگوں کے پاس پیسہ کم تھا، سکون زیادہ تھا۔ تمہارے پاس پیسہ زیادہ ہے، سکون نہیں ہے۔ شاید سکون امیر ہونے کی آرزو سے نجات پانے ہی میں ملتا ہے۔ تم نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا کہ دولت کبھی کسی کو سکون نہیں دیتی۔ دولت کی افادیت ہی پیسے خرچ کرنے میں ہے اور خرچ کرنے سے یہ کم ہو جاتی ہے۔ گویا دولت کی افادیت ہی اس کے کم ہونے میں ہے۔ دولت جمع رہے تو اس کی افادیت ہی نہیں ہے۔ دولت مند کنجوس اور بخیل ہو جاتا

ہے۔ وہ دراصل کسی اور کے مال کی حفاظت پر مامور ہے اور یہ مال اس کے وارثین کی وراثت ہے
دولت کی تمنا، اس کا حصول، اس کا ارتکاز سب انتشار کے ابواب ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ غریب
سکون میں ہو، لیکن یہ ضروری ہے کہ دولت مند سکون سے محروم ہوگا۔ ہمدم! اپنی کمائی، جائز
ناجائز کمائی، محروم انسانوں تک پہنچا کر اپنے لیے سکون کا اہتمام کرو۔

اگر تمنا حاصل سے زیادہ ہو تو اضطراب پیدا ہوگا، انتشار ہوگا۔ اور اگر حاصل، تمنا سے زیادہ
ہو، تو سکون کا باعث بنے گا۔ کم آرزو والے انسان مطمئن رہتے ہیں۔

تم محبت بھی کرتے ہو۔ انسانوں سے نہیں، اشیاء سے۔ تمہیں کثرت عزیز ہے۔ تم آلائش
سے، آرائش سے، آسائش سے، زیبائش سے اور نمائش سے محبت کرتے ہو۔ تم فطری جذبات
سے محروم ہو چکے ہو۔ تم اپنے مکان کو ہی سجاتے رہتے ہو۔ اس میں فانوس روشن کرتے ہو۔ اس
میں چراغاں کرتے ہو، مگر تمہارے دل کی دنیا میں چراغاں نہیں ہے۔ مکان جگمگا رہے ہیں اور
دل بجھے ہوئے۔ باہر کا چراغاں دل کا اندھیرا دُور نہیں کر سکتا۔ یہ روشنیاں کیا ہیں، جبکہ اتنا اندھیرا
ہے۔ یہ محفلیں کیا ہیں جبکہ رُوح کے اندر تنہائی چیختی رہتی ہے۔ یہ انتشار کیا ہے؟ سب منتشر ہیں۔
ایک دُوسرے کے پاس رہنے والے ایک دوسرے سے ناشناس کیوں ہیں؟ کیا کوئی کسی کو نہیں
جانتا؟ کیا کوئی کسی کے دل کے قریب نہیں؟

کیا کوئی کسی کے اندر نہیں جھانکتا؟ کیا سارے ہی سب سے اجنبی ہیں؟ کیا سارے
اپنے آپ سے بیگانہ ہیں؟

کیا انجمن صرف تنہائیوں کا میلہ ہے؟ قہقہوں کے شور میں کوئی سسکیاں نہیں سنتا۔ کیا
ہنستے ہوئے چہرے سب نقلی ہیں، سب لبادے ہیں؟ ہمدم! تم کون سی دنیا میں رہتے ہو،
جہاں بھیڑ ہے اور تنہائی ہے۔ جہاں آرزوؤں کے طوفان میں لوگ ایک دوسرے سے بچھڑ
گئے ہیں۔ کیا سب لوگ سب کی تلاش میں ہیں؟ کیا کوئی کسی کی تلاش میں نہیں؟

تم کس فکر میں سرگرداں ہو؟ تم ہمہ وقت مصروف کیوں ہو؟ تمہیں کیا ہو گیا؟ تمہارے

پاس وقت نہیں۔ کیا تم نے زندگی بیچ دی ہے اور اب تمہارے پاس اس سے حاصل ہونے والا مال خرچ کرنے کا وقت بھی نہیں ہے؟ تم نے مکان بنایا اور اس میں رہنے کا وقت نہیں تمہارے پاس۔ تم نے خوشی حاصل کرنے کے لیے دل بیچ دیا، اب خوشی کیسے محسوس کرو گے۔ تمہارے پاس آسانیاں ہیں لیکن دل ہی نہیں۔ تم مشین بن گئے ہو۔ ہمہ وقت مصروف، جذبوں سے عاری، غم اور خوشی سے لاتعلق، سب سے بیگانہ اپنے آپ سے بھی بیگانہ۔ یہ کیا انتشار ہے۔ یہ کس جرم کی سزا ہے۔ بے کیف زندگی، بے جان حرکات، بے سمت سفر، بے معنی تگ و دو، بے نام منزلیں، بے انجام مسافرت، بے حضور قلوب، بے نور دیدے، بے شعور الجھنیں، بے سبب اندیشے، بے وجہ دھڑکے، بے نصیب کوششیں اور بے لگام وحشتیں۔

یہ دنیا کہاں جا رہی ہے، کچھ تم ہی بتاؤ۔ یہ سب لوگ کہاں سے آ رہے ہیں۔ کدھر کو جا رہے ہیں، آوازیں ہی آوازیں ہیں اور کچھ سنائی نہیں دیتا، بھیڑ ہی بھیڑ ہے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ آنا اور جانا، جانا اور آنا یہ سب کیوں ہے۔

انسان کماتا ہے تاکہ زندہ رہے اور زندہ رہتا ہے تاکہ کماتا رہے۔ یہ کیا ہے؟ تم اس جہانِ رنگ و بُو میں کیسے گزر کر رہے ہو؟ تم نے شاید سوچنا چھوڑ دیا، اچھا کیا۔ سوچنا بہت بڑی بیماری ہے۔ ایسی بیماری جس کا علاج نہیں ہے۔ سوچنے والے کو کبھی رات کو سُورج نظر آتا ہے، کبھی دن کو تارے نظر آتے ہیں۔ وہ ہر شے کو ایک اور زاویے سے دیکھتا ہے۔ سوچنے والا الفاظ کے معنی ہی نہیں معنی کے چہرے بھی دیکھتا ہے اور پھر ان چہروں سے محوِ کلام ہوتا ہے۔ چہرے کے معنی اور معنی کے چہرے، عجب بات ہے۔ لیکن یہ کوئی بات نہیں۔ سوچنے والوں کی دنیا، دنیا والوں کی سوچ سے الگ ہے۔ سوچنا اور ہر وقت سوچنا ہلاکت ہے۔ تم نے اچھا کیا کہ تم سوچ سے نکل گئے۔ اب تم عمل ہی عمل ہو، بے وجہ اور بے نتیجہ عمل، لیکن تم مصروف ہو۔ شاید تم مصروف رہنے کو کامیابی سمجھتے ہو۔ مصروف، ہمہ وقت مصروف، مشین کی طرح، دریا کی طرح، چیونٹی کی طرح گردشِ افلاک اور گردشِ حالات کی طرح۔ تم سوچ میں وقت ضائع نہیں کر سکتے، کیونکہ وقت قیمتی ہے

اور اس کی قیمت تم وصول کر چکے ہو، تمہیں حرکت دینے والی طاقت کا نام ضرورت ہے اور ضرورت کا پجاری کثرت پرست ہوتا ہے۔ کثرت پرست کو سوچ، تدبر اور فکر مل ہی نہیں سکتے۔ تم بھی دنیا میں ہو، اس میں وہی کچھ ہے، جو ہے۔

لیکن کبھی کبھی جب ضرورت ساتھ چھوڑ دے اور عمل کی قدرت نہ رہے تو اس بات پر غور کرنا کہ یہ سب کس لیے۔ اگر یہ سب کچھ اس لیے اکٹھا کیا ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے تو اکٹھا کرنے کا فائدہ۔ اور یہ ممکن ہی نہیں کہ اسے نہ چھوڑا جائے۔ یہ عجیب بات ہے کہ محنت کی عادت قائم رہے بھی تو انسان کی طاقت کم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس کا سفر جاری رہتا ہے لیکن سفر کی رفتار مدھم ہو جاتی ہے۔ آنکھیں محفوظ رہتی ہیں لیکن بینائی غیر محفوظ ہے۔ اس کا آنگن پھولوں سے بھرا ہوتا ہے، لیکن وہ رنگوں اور خوشبوؤں کے طلسمات سے لطف اندوز ہونا بھول چکا ہوتا ہے اس کے دسترخوان کشادہ ہوتے جاتے ہیں، لیکن اس کا ذائقہ ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ زندگی بھر کتابیں اکٹھی کرتا ہے کہ کبھی فرصت ملی تو پڑھیں گے، لیکن جب لائبریری مکمل ہوتی ہے تو زندگی بھی مکمل ہو جاتی ہے اور اس طرح کتابوں کا مالک ہونے کے باوجود کتابوں سے ناآشنا ہی رہتا ہے۔

ہمدم! زندگی بڑی طویل ہے لیکن زندگی بڑی مختصر بھی ہے۔ نہ گزرے تو ایک لمحہ نہیں گزر سکتا، صدیوں تک ایک لمحہ نہیں گزرتا اور اگر گزرنے لگے تو صدیاں ایک لمحے میں سمٹ کر گزر جاتی ہیں، اسی طرح جس طرح ہجر کا لمحہ اور وصال کی صدیاں۔ یہ زندگی عجب ہے۔ نہ سوچو تو کٹتی ہی چلی جاتی ہے اور اگر سوچنے لگو تو وقت ٹھہر جاتا ہے۔ گردشیں رُک جاتی ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل صاحبِ فکر کے سامنے ایک لمحہ میں سمٹ جاتے ہیں۔ ایسا لمحہ جس میں وہ پرانے کاغذ، پرانے خطوط، جن میں پرانے چہرے اور پرانی آنکھیں لکھی ہوتی ہیں، اچانک ایک نیا لباس پہن کر نئے معنی سے نئے سفر پر ہمسفری کی تمنا کرتے ہیں۔ وہ جو نہیں ہوتے، ہوتے ہیں اور جو ہوتے ہیں، نہیں ہوتے اور اس طرح ہونا اور نہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ہمدم! یہ سب سوچ کے طلسمات

ہیں۔ فکر کے کرشمے ہیں۔ تمہاری دنیا سے دُور تمہارے جہاں سے الگ، تمہارے زمانے میں لیکن تمہارے زمانے سے باہر۔ تمہارے شب و روز میں حاصل اور محرومی ہے، لیکن صاحبانِ فکر کے ہاں نہ سُود ہے نہ زیاں ہے۔ وہاں مُسلسل خلش ہے، مستقل تپش ہے، مدام آتش۔

اس لیے تم اپنے سفر پر گامزن رہو۔ تم اپنے شب و روز کو پریشان نہ کرو۔ تم کماتے جاؤ اور کھاتے جاؤ کھاتے جاؤ اور کماتے جاؤ، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ تمہارے آنگن میں پھول کھلیں، تمہارے مکانوں میں چراغاں رہے، تمہارے شہروں میں میلے قائم رہیں اور تمہارا دل۔ دل کی بات بس دل ہی میں رہنے دو۔



عیاں تھا جس کی نگاہوں پہ عالمِ اسرار
اُسے خبر نہ ہوئی کیا ہوا پسِ دیوار
یہ کیا غضب کہ مجھے دعوتِ سفر دے کر
کڑکتی دُھوپ میں آنکھیں چُرا گئے اشجار
وہاں ہوئی ہے مسخّر خلا کی پہنائی
یہاں دھری ہے ابھی تک مزار پر دستار
میں کتنی صدیوں سے اس انتظار میں گم ہوں
الٰہی اب تو مسیحا کو آسماں سے اُتار
وہ جس نے توڑ دیا جامِ آرزو واصفؔ
اسی کے نام سے منسوب ہیں مرے اشعار

صداقت

ایک دوست نے دوسرے سے پُوچھا۔ بھئی آپ نے زندگی میں پہلا جھوٹ کب بولا؟
دوست نے جواب دیا۔ جس دن میں نے یہ اعلان کیا کہ مَیں ہمیشہ سچ بولتا ہوں۔ سچ اور جھوٹ ہماری زندگی میں کچھ اس طرح شیر وشکر ہو گئے ہیں کہ ان کو جُدا کرنا مشکل سا ہے۔ کاذب ماحول میں صادق کی زندگی ایک کربلا سے کم نہیں۔

ایک شیخ نے اپنے مُرید کو خرقۂ خلافت عطا کیا اور اسے کسی بستی میں تبلیغ کے لیے بھیج دیا۔ کچھ عرصہ بعد شیخ کو اطلاع ملی کہ ان کا مُرید بڑا کامیاب ہے۔ سب لوگ اس سے خوش ہیں۔ شیخ نے مرید کو طلب کیا اور کہا کہ خرقۂ خلافت واپس کرے۔ مرید نے شیخ سے ناراضگی کا سبب دریافت کیا۔ شیخ نے کہا "سنا ہے کہ سب لوگ تجھ سے خوش ہیں۔" مرید نے کہا آپ کی مہربانی ہے۔ شیخ نے غصّہ سے کہا کہ "سب لوگوں کا خوش ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ تم نے سچ بولنا چھوڑ دیا ہے۔"

سچ اور جھوٹ کی شناخت ہر انسان کو یکساں میسّر نہیں ہوتی۔ ایسا ممکن ہے کہ دو انسان اپنی اپنی صداقت کے زعم میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوں۔ ایک انسان کا اندازِ فکر دوسرے انسان کے اندازِ فکر کے برابر نہیں ہوتا۔ شعور اور ترجیحات کا فرق ایک ہی صداقت کے بیان میں فرق پیدا کر دیتا ہے۔ شبنم کے قطرے صبح کی مسکراہٹ بھی ہیں اور رات کے آنسو بھی۔ اندازِ نظر بدل جائے تو نظارہ بدل جاتا ہے۔

ہم اپنے بچّوں کو سچ بولنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ہم انہیں کہانیاں سناتے ہیں۔ پریوں کی کہانیاں، جنّات کی، شہزادوں کی، بادشاہوں کی کہانیاں اور یہ سب کہانیاں جھوٹ ہیں۔ بچّے

صداقت کا مفہوم کیا سمجھیں گے؟ اسی طرح ایک بچہ نابالغ ہونے کے ناطے اور بھی کئی صداقتیں سمجھنے سے قاصر ہے۔ ہمارا افسانہ، ہمارا ڈرامہ، سفر نامہ، انشائیہ، غنائیہ، تخلیقی صداقت تو ضرور ہے لیکن عین صداقت نہ ممکن ہے نہ مدعا ہے۔ اگر ادبی تخلیقات کو سچ کہا جائے تو جھوٹ کیا ہے۔ مگر جھوٹ ہے تو سچ کیا ہے۔ حضرت مولانا روم کی مثنوی فارسی زبان میں قرآن کہلاتی ہے۔ لیکن مثنوی کی اکثر کہانیاں عربی کے قرآن کے مفہوم کے مطابق سچ نہیں ہیں۔ لیکن ان سے حقیقت فہمی آسان ہوتی ہے۔ بے باک بیانی نے مثنوی کے اندر رہ کر صداقت بن جاتا ہے۔ اگر کوئی اور مصنف ایسی ویسی کہانی لکھ دے تو نہ صرف یہ کہ وہ صداقت نہ رہے گی بلکہ فحاشی بھی بن سکتی ہے۔

دراصل صداقت، بیان کرنے والے کے ساتھ، اپنا رنگ بدلتی رہتی ہے۔ کوئی جھوٹا آدمی سچ بولنے لگے، تو سمجھ لینا چاہیے کہ سچ خطرے میں ہے۔ سچ وہی ہے جو سچے کی زبان سے نکلے۔

سچے انسان کا جھوٹ مصلحت پر مبنی ہو سکتا ہے لیکن جھوٹے انسان کا سچ منافقت کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ منافق کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ مومنوں کے سامنے کہتا ہے کہ وہ ایمان لایا اور جب وہ خلوت میں اپنے شیاطین کے پاس ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ اس نے مومنوں کو بیوقوف بنانے کے لیے ایمان کا اعلان کیا ہے۔ منافق اس انسان کو کہتے ہیں جو مومنوں اور کافروں میں بیک وقت مقبول ہونا چاہے۔

بعض اوقات سچ کا بیان بے ربط ہونے کی وجہ سے بے معنی ہو جاتا ہے اور اس طرح اپنا مفہوم کھو دیتا ہے۔ مثلاً اگر میں یہ کہوں کہ "سورج مشرق سے نکلتا ہے۔ زمین گول ہے۔ پرندے ہوا میں اڑتے ہیں۔ آج ہفتہ ہے۔ میں خوشاب کا رہنے والا ہوں۔ نوائے وقت اچھا اخبار ہے۔"

یہ بیان صداقت تو ہے لیکن بے ربط ہے۔ اس لیے لغو ہے۔ صداقت کے اظہار کا وقت ہوتا ہے۔ ہر وقت کی ایک صداقت ہے۔ غریب اور امیر کی صداقت میں فرق ہے۔ کم علم انسان اور علم والے انسان کی صداقت میں فرق ہے۔ بے یقین انسان کی صداقت میں بھی فرق ہے۔

ہم سچ کو اپنی سچائی کے معیار کے مطابق جانتے ہیں۔ قاتل اور مقتول کا رب تو ایک ہے۔

لیکن دونوں فریق بیک وقت اس صداقت کو کیسے مان لیں۔ بیمار اور صحت مند انسان ایک ہی صداقت کو ایک جیسا نہیں مان سکتے۔ غرضیکہ ہر انسان اپنے معیارِ فکر سے سچ اور جھوٹ کا اندازہ کرتا ہے۔ محبت کرنے والوں کی صداقت اور ہے، محروم محبت کا سچ اور ہے۔ مثال کے طور پر لفظ "انسان" کو لیں۔ ہر آدمی انسان کے بارے میں الگ شعور رکھتا ہے۔ انسان کی تعریف میں ہمیں طرح طرح کے بیان ملیں گے۔ مثلاً:

انسان اشرف المخلوقات ہے۔

انسان ظلوم وجہول ہے۔

انسان ہی احسن تقویم کی شرح ہے۔ انسان اسفل السافلین بھی تو ہے۔

فطرت انسان پر فخر کرتی ہے۔

فطرت انسان کے اعمال پر شرمندہ ہے۔

انسان روشنی کا سفیر ہے۔

انسان اندھیرے کا مسافر ہے۔

انسان کو سوچنے والا بنایا گیا ہے۔ اس کے سینے میں دھڑکنے والا دل ہے۔

انسان کے پاس سوچنے کا وقت ہی نہیں۔ اس کے سینے میں برف کی سِل ہے۔

انسان کو انسان سے اتنی محبت ہے کہ انسان انسان پر مرتا ہے۔

انسان کو انسان سے اتنی نفرت ہے کہ انسان انسان کو مارتا ہے۔

انسان رحمان کا مظہر ہے۔

انسان شیطان کا پیروکار ہے۔

انسان فطرت کے ہر راز سے باخبر ہے۔

انسان اپنے آپ سے بھی بے خبر ہے۔

انسان کی خاطر اللہ نے شیطان کو دُور کر دیا۔

شیطان کی خاطر انسان اللہ سے دور ہو گیا۔

انسان کو اس کے عمل اور ارادے میں آزاد رہنے دیا گیا۔

انسان کے عمل پر جبر کے پہرے بٹھا دیے گئے۔

انسان کو اللہ نے آزادی دی، بادشاہی دی، عزّت دی۔

انسان کو کس نے مجبوری دی، غلامی دی، ذلت دی؟

انسان حیا کا پیکر ہے۔ انسان لطافتوں کا مرقع ہے۔

انسان جنسیات کے تابع ہے۔ انسان معاشیات سے مجبور ہے۔

انسان سماج بناتا ہے۔

انسان سماج شکن ہے۔

انسان صُلح کا خوگر ہے۔

انسان جنگ و جدال کا شائق ہے۔

انسان کو علم ملا، زندگی ملی۔

انسان کو جہالت ملی، موت ملی۔

انسان دنیا میں بہت کچھ کھوتا ہے۔ بہت کچھ پاتا ہے۔

انسان نہ کچھ کھوتا ہے نہ کچھ پاتا ہے۔ وہ صرف آتا ہے اور جاتا ہے۔

غرضیکہ ایک لفظ "انسان" کی صداقت ہی اتنی وسیع المعنی ہے کہ اس کے کوئی معنی نہیں۔ انسان سب کچھ ہے۔ انسان کچھ بھی نہیں۔ انسان کے بارے میں کیا بات سچ ہے، کچھ فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ انسان اپنے عقیدے کو سچ اور دوسروں کے عقائد کو جھوٹ کہتا ہے۔ ہم اپنے وطن کی خاطر مر جائیں تو شہید۔ دشمن اپنے وطن کی خاطر مرمٹے تو واصل بہ جہنم۔ ہم یہ نہیں سوچ سکتے کہ دوسروں کا عقیدہ ان کے لیے اتنا ہی واجب الاحترام ہے جتنا ہمارے لیے ہمارا عقیدہ۔ پیدا کرنے والے نے ہی خیر اور شر کو تخلیق فرمایا۔ انسانوں کی سرشت میں دنیا کی محبت اور آخرت کی طلب رکھ دی گئی۔

فطرت نے کسی کے ہاتھ میں کاسۂ گدائی دے دیا اور کسی کے سر پر تاجِ شاہی پہنا دیا۔ ایک کی خوشی دوسرے کا غم ہے۔ سچ اور جھوٹ کی پہچان یکساں کیسے ہو سکتی ہے؟

ہم جو کچھ دیکھتے ہیں اسے ویسے ہی سچ سمجھ لیتے ہیں۔ دُور بین' خورد بین نے ثابت کر دیا کہ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ ویسے سچ نہیں۔ ہم ساکن ہیں' لیکن ہم متحرک ہیں۔ ہماری عمر بڑھ رہی ہے لیکن ہماری عمر کم ہو رہی ہے۔

یہ سچ ہے کہ سائنس نے انسان کو آسائشیں دی ہیں۔ انسان کو تحفظ دیا ہے۔ انسان کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا ہے۔ لیکن یہ بھی تو سچ ہے کہ سائنس نے انسان کا جینا حرام کر دیا۔ انسان کو غیر محفوظ بنا دیا۔ انسان کا آسمانی سفر زمین پر آگ برسانے کے لیے ہو رہا ہے۔

سچ اور جھوٹ صرف پہچان کے درجے ہیں۔ ان میں سے کچھ باطل نہیں۔ اس کائنات میں سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ جو کچھ تخلیق کیا گیا ہے' وہ باطل نہیں ہے۔

ایک ملک کی سچائی دوسرے ملک کی سچائی نہیں ہے۔ ہم جس شے سے کراہت کرتے ہیں' وہ دوسرے ملک میں مرغوب غذا ہے۔ اسی طرح ایک زمانے کا جھوٹ دُوسرے زمانے کا سچ ہو سکتا ہے۔ فاصلوں سے سچ نظر آنے والی شے قریب سے دیکھو تو جھوٹ ہے' سراب ہے۔ زمین پر چاند کی چاندنی ہے لیکن چاند پر چاندنی نہیں۔ اب اصل صداقت کیا ہے۔ زندگی کا خواب الگ ہے۔ خواب کی زندگی الگ۔

انسان کسی ایک صداقت کے سفر میں ہوتا ہے۔ اسے راستے میں اور طرح کی صداقتیں ملتی ہیں۔ وہ انہیں جھوٹ سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے۔ انسان اپنے لیے جو کچھ پسند کرتا ہے' عین ممکن ہے کہ اس کے لیے نقصان دہ ہو۔ اسی طرح وہ اپنے لیے جو کچھ ناپسند کرتا ہے' عین ممکن ہے کہ وہ اس کے لیے مفید ہو۔ یعنی ہماری اپنی پسند اور ناپسند کی صداقت بھی جھوٹ ہو سکتی ہے۔

اسی طرح منافقین اگر مسجد بنائیں اور ان کی نیت یہ ہو کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچایا جائے تو رب کا حکم ہے کہ ایسی مسجد کو گرا دیا جائے۔ مسجد سچ ہے' لیکن بدنیت انسان بنائے' تو جھوٹ ہے۔

ہر انسان سچ اور جھوٹ کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ ایک عدالت کا سچا فیصلہ دوسری عدالت میں ہی جھوٹ ہو جاتا ہے اور دونوں عدالتیں سچی ہیں۔

سچ اور جھوٹ کی پہچان اس لیے ناممکن ہے کہ سچ اور جھوٹ کا تعلق عقیدے سے ہے۔ تسلیم سے ہے۔ اس میں تحقیق کا پہلو کم ہے۔

ہم سچائی کی تلاش میں نکلیں تو ہمیں سچائی نہیں ملے گی۔ سچائی نہیں مل سکتی۔ زیادہ سے زیادہ ہم صرف سچے انسان تک پہنچ سکتے ہیں۔ ہم جس انسان کو سچا مان لیں، اس کا فرمایا ہوا ہر لفظ سچ ہے۔ سچے کا فرمان سچ ہے۔ سچ کو ماننے کے لیے ہمیں خود سچائی کا راستہ اختیار کرنا ہے۔ صادق کو ماننے والا صدیق ہی تو ہوگا۔ صادق کی ہر بات صداقت ہے۔

اسی صداقت کے حوالے سے ہی صداقتِ کائنات یا صداقتِ ہستی کی پہچان ممکن ہے۔ اگر صادق کا حوالہ نہ ہو تو سچ اور جھوٹ کے الفاظ اپنی اہمیت کھو بیٹھتے ہیں۔ ہم نے سچے دل سے صادق کی ہر بات کو سچ مان کر زندگی کا شعور حاصل کرنا ہے۔

صادق تک رسائی ہی اصل صداقت ہے۔ صادق مل گیا تو سب صداقتیں مل گئیں۔ صادق کے مخالف راستے میں کذب ہے، جہل ہے، بلکہ ابوجہل ہے۔

صادق کے فرمان میں اپنی صداقتیں اور اپنی وضاحتیں شامل کرنے سے سچ میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ صادق الہام بولتا ہے، ہم ابہام بولتے ہیں۔

قرآن اللہ کا کلام ہے، سچ ہے۔۔۔ حق ہے۔ تفسیر انسان کی وضاحت ہے۔ ممکن ہے سچ نہ ہو۔ الہامی کتاب کی تفسیر صاحبِ الہام ہی لکھ سکتا ہے۔ سچ کو سچ ہی رہنے دیا جائے، اسے کوئی اور لباس نہ پہنایا جائے۔



وعدہ

اللہ کریم کا ارشاد ہے کہ ہم سے ہمارے وعدوں کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ وعدہ حال میں "مستقبل" کے بارے میں کیا جاتا ہے اور جب مستقبل حال بنتا ہے تو وعدہ کرنے والا "حال" ماضی بن چکا ہوتا ہے اور بات آئی گئی ہو چکی ہوتی ہے۔

اپنے وعدوں کا پاس کرنے والے لوگ عظیم ہوتے ہیں۔ وہ ہر حال میں اپنے الفاظ کو عمل کا جامہ پہناتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انسان کی زبان سے نکلا ہوا لفظ انسان کے باطن کا اظہار ہے۔ اس طرح نیات اعمال سے اور اعمال نیات سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور انسانوں کی پہچان بھی ہوتی رہتی ہے اور ان کی عاقبت بھی مرتب ہوتی جاتی ہے۔

ہماری زندگی چونکہ کثیر مقاصد کی زندگی ہے، اس لیے ہمارے وعدے بھی کثرت سے ہوتے ہیں اور وعدوں کی کثرت وعدوں کی عظمت ختم کر دیتی ہے۔ اکثر وعدے متضاد اور متصادم ہونے کی وجہ سے پورے نہیں ہو سکتے۔ اگر وعدے کم کیے جائیں تو ان کے پورا ہونے کا قوی امکان ہو سکتا ہے۔

ہمارے وعدے ہمارے اپنے ساتھ ہوتے ہیں، لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور خدا کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ہمارا عزم ہمارے اپنے ساتھ ہمارا وعدہ ہے۔ اسے پورا کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ کبھی کبھی حالات اور حادثات رستہ نہیں دیتے اور ہم اپنے عزائم کو حسرتوں میں شمار کر کے چپ ہو جاتے ہیں۔ ہر آدمی کامیاب ہونے کا عزم کرتا ہے اور ہر انسان کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ واقعات کی سختی کی وجہ سے ہوتا ہے اور ہم ٹریجڈی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

لوگوں سے وعدہ بعض اوقات مجبوری کے سبب کیا جاتا ہے۔ وعدہ بات کو کل پر ٹلنے

کا ذریعہ ہوتا ہے لیکن یہ بات ملتی نہیں۔ ہمارا وعدہ لوگوں کو منتظر رکھتا ہے اور وعدہ پورا نہ ہو تو لوگ ہمارے کردار کے بارے میں قیاس آرائیاں کرنے لگتے ہیں۔ حقیقت میں ہر وعدہ مشروط ہوتا ہے کہ اگر حالات سازگار رہے تو وعدہ پورا ہوگا اور اگر وہ تعلق جس کی بنا پر وعدہ کیا جاتا ہے، قائم ہی نہ رہے تو ایفائے عہد کی ذمہ داری ختم سی ہو جاتی ہے۔ دوست سے وعدہ دوستی کے قیام کی شرط کے ساتھ ہے۔ محبوب سے وعدہ محبت سے مشروط ہے۔ دوسروں کی وعدہ خلافی کا گلہ کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ انھوں نے خود کیا وعدہ کیا ہوا تھا۔

اسی طرح استاد شاگرد، پیر مرید اور گرو چیلے کے درمیان وعدے دو طرفہ ہوتے ہیں۔ استاد علم دینے کا وعدہ کرتا ہے اور شاگرد ادب کرنے کا۔ اگر شاگرد ادب چھوڑ دے تو اس کا علم سے محروم ہونا اس کا ازلی مقدر بن جاتا ہے۔ اس میں استاد کا ایفائے عہد دخل ہی نہیں دے سکتا۔ مرید گستاخ ہو جائے تو وہ سارا نظامِ طریقت ہی ختم ہو جاتا ہے۔ پیر کی نظرِ التفات بھی فیض نہیں دے سکتی۔ فیض ادب کا نام ہے اور محرومی گستاخی کا نام۔

انسان کو اپنے عہد پورے کرنے کا حکم ہے۔ یہی بڑے نصیب کی بات ہے کہ ہم اپنے موقف پر قائم رہیں۔ اپنے الفاظ کی عزت کریں۔ اپنے عہد پورے کریں۔ اگر ہم حق طلب ہیں تو ضرور رستہ ملے گا۔ حقیقت کے متلاشی مایوس نہیں ہوتے۔

ہماری زندگی وعدوں سے بھری ہوتی ہے۔ ہم ہر قدم پر ایک وعدے سے دوچار ہوتے ہیں۔ ایسا ہوگا ایسا کریں گے، ایسا ہی ہوتا ہے، اور پھر اسی زندگی میں ایک وعدہ، جو اکثر یاد نہیں رہتا موت سے ہے۔ ایک دن موت سے ملنا ہے اور وہ دن کسی دن بھی آسکتا ہے اور اس طرح باقی سب وعدے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ ہمیں زندگی سے کیے ہوئے وعدے بھی پورے کرنا ہیں اور موت سے کیے ہوئے وعدے بھی۔

ہمارا وعدہ خدا کے ساتھ بھی ہے۔ کلمہ طیبّ ایک عہد ہے۔ ایک وعدہ ہے کہ ہم اللہ کے علاوہ کسی کو معبود نہیں مانیں گے اور اللہ کے محبوبؐ کو ہر حال میں آخری نبی مانیں گے اور آپؐ

کی ہر بات کو صدقِ دل سے قبول کریں گے۔ یہ وعدہ ہمارا ایمان ہے۔ زندگی کی مجبوریاں اکثر اس وعدے کو پُورا کرنے کی مہلت نہیں دیتیں۔ جو لوگ اللہ کے ساتھ کیے ہوتے وعدے پر استقامت سے قائم رہے ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں۔ وہ حالات کی کمی بیشی سے اپنے وعدے کی حُرمت کی حفاظت کرتے ہیں یہی لوگ یقین کے چراغ روشن کرتے ہیں۔ بیمار دِلوں کی شفا ان لوگوں کے دَم سے ہے۔ ان کا سَر تن سے جُدا کر دیا جائے تو بھی اُن کی زبان سے قرآن جاری رہتا ہے۔ سلام ہو ان کی بارگاہِ مقدس میں۔

اللہ تعالیٰ نے بھی انسان سے وعدے کیے ہوتے ہیں۔ نیک اعمال والوں کے لیے جنّت کی بشارت ہے اور بداعمال لوگوں کو دوزخ میں لے جا کر کہا جائے گا کہ "یہ ہے وہ جہنّم جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔"

اللہ کے وعدے سچ ہیں۔ اللہ کے وعدے پُورے ہو کر رہتے ہیں۔ ہم لوگ شب و روز کے حصار میں گِھرے ہوتے ہیں۔ ہم جلد باز اور جھگڑالو ہیں۔ ہم فوری طور پر اپنے اعمال کا نتیجہ چاہتے ہیں، لیکن اللہ کریم ہمیں مُہلت عطا فرماتا ہے کہ ہم خود اپنے اعمال کا جائزہ لیں۔ فوری نتیجے کی صُورت میں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں عبرت سے دوچار ہونا پڑے۔ ابھی وقت ہے۔ غنیمت ہے۔ توبہ کے ذریعے اپنی بداعمالیوں سے نجات حاصل کی جائے۔ اللہ کا وعدہ ضرور پُورا ہو کر رہتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے عزت اور کشادگی کا وعدہ ہے۔ مسلمان اسلام سے محبت اور وابستگی قائم رکھیں۔ یقین کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ حالات کا بہتر ہو جانا اللہ کا وعدہ ہے، پُورا ہو گا۔

سیاست کے میدان میں بھی بڑے حسین و جمیل وعدے ہوتے ہیں۔ کامیاب سیاستدان وہی ہے جو وعدہ کرنے میں سخی ہو۔ ایک سیاستدان سے کسی نے پُوچھا "آپ نے اتنے وعدے کیے، پُورا کوئی وعدہ نہیں کیا۔" وہ بولا "ابھی ایک وعدہ باقی ہے۔" پُوچھنے والے نے پُوچھا "کیا؟" اس نے کہا کہ "وعدہ پُورا کرنے کا وعدہ تو ابھی کیا ہی نہیں۔"

قصّہ مختصر یہ ہے کہ حزبِ اقتدار وعدہ کرتی ہے اور حزبِ مخالف وعدہ شکنی کا اعلان کرتی

بڑھتی ہے۔ لوگ سنتے رہتے ہیں اور وقت گزرتا رہتا ہے۔

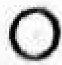
تخلیقِ پاکستان ایک وعدہ تھا خدا کے ساتھ، مسلمانانِ پاکستان کے ساتھ، مسلمانانِ ہند کے ساتھ بلکہ مسلمانانِ عالم کے ساتھ۔ یہی وعدہ ہمارا آئین ہے، بلکہ ہمارا دین ہے۔ اللہ کی زمین پر اللہ کے بندوں پر اللہ کے دین کا نفاذ ہی وہ وعدہ تھا جو پورا ہونا چاہیے۔ لوگوں کی زندگی بھی کامیاب بنائی جائے اور عاقبت بھی۔ غریب کو مایوس نہ ہونے دیا جائے اور امیر کو مغرور نہ ہونے دیا جائے۔ یہ وعدہ اس وقت پورا ہوگا جب نہ کوئی مظلوم ہوگا نہ محروم۔

بہرحال اگر ہم اپنے وعدوں کو پورا کرنے کا عزمِ صمیم کر لیں تو معاشرے سے برائی ختم ہو سکتی ہے۔ ایک سرکاری ملازم جس کا وعدہ تنخواہ کے عوض کام کرنے کا ہے، اپنی محنت یا خدمت کا صلہ رشوت کی شکل میں طلب نہیں کرے گا۔ وعدہ بہرحال وعدہ ہے۔

تنہائیوں میں کیے ہوئے وعدے جب پورے نہیں کیے جاتے تو عدالتوں میں ان کی تشہیر ہوتی ہے۔ ازدواجی زندگی کا سکون وعدہ خلافی کی وجہ سے برباد ہوتا ہے۔ محبت کے رشتے طلاق کی تلوار سے کٹتے ہیں۔ یہ سب وعدوں کی عزت نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ کاروباری زندگی میں وعدہ خلافیاں عدالتوں میں اذیت ناک مراحل طے کرتی ہیں۔

قانون وعدہ شکنی کی الگ انداز میں سزا رکھتا ہے۔ اللہ کریم نے وعدہ خلافی کی الگ انداز میں سزا مقرر کر رکھی ہے۔

مناسب ہے کہ انسان وعدہ کرنے سے پہلے غور کر لے۔ لیکن جب وعدہ کر لیا جائے تو اسے ہر حال میں پورا کرنے کی سعی کی جائے۔ اسلام نے ہمیں صداقت کا درس دیا ہے اور سب سے زیادہ صادق الوعدہ ہستی حضور پُرنور کی ہے اور اس ہستی کا ہر وعدہ ہمیشہ پورا ہوا۔ درود و سلام آپؐ کے وعدوں کی صداقت پر۔



اسلام + فرقہ = صفر

اگر کلامِ الٰہی یا قرآن کریم میں کسی لفظ کا اضافہ کر دیا جائے یا کسی لفظ کی تخفیف کر دی جائے تو وہ قرآن نہیں رہے گا اور تحریف کرنے والا واجب القتل ہوگا۔

قرآن کریم اللہ کا کلام ہے اور اتنا مکمل ہے کہ اس میں اللہ کے لفظ کا اضافہ بھی ممکن نہیں۔ قرآن سے لفظِ شیطان نکالنا ممکن نہیں، بلکہ قرآن کی زبر زیر پیش کو بدلنا ممکن نہیں۔ اس کی حفاظت اللہ کریم نے ایسے انداز سے فرمائی ہوتی ہے کہ یہ مقدس قرآن جیسا تھا ویسا ہی ہے اور ویسا ہی رہے گا۔ نہ بدلنا قرآن کا اعجاز ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ بدل جائے تو یہ قرآن نہیں ہوگا۔ قرآن کی ترتیب کو بدلنا بھی ممکن نہیں۔ قرآن اسی کتاب کا نام ہے۔ کسی اور کتاب کو کسی اور زبان کا قرآن کہنا، قرآنِ مقدس کی شان میں گستاخی ہے، گناہ ہے۔

اسی طرح اللہ کریم کے بارے میں جو علم، تعلیم، اطلاع، خبر اور ارشاد حضورِ انور کی زبان سے عطا ہوا، وہی اللہ کے بارے میں حرفِ آخر ہے۔ کسی اور مذہب کا کوئی اور بیان، جرما سوائے بیانِ پیغمبر ہوگا، ہمارے لیے نہیں ہے۔ مثلاً اللہ کو کسی ایسے اسم سے پکارنا جس کی سند حضورِ انور سے نہ ملی ہو، مناسب نہیں۔ پیر کو اللہ اور اللہ کو پیر کہنا نامناسب ہے۔

اللہ کریم کی جو صفاتِ عالیہ حضورؐ نے بیان فرما دی ہیں، بس وہی صفات ہیں۔ جیسے اس زمانے میں، ویسے ہی آج کے دور میں اور ویسے ہی ہمیشہ ہمیشہ

الآن کما کان

اللہ کریم کو ہم نے دریافت نہیں کیا، معلوم نہیں کیا۔ ہمیں حضور اقدسؐ کی ذات نے فرما دیا، ہم

نے تسلیم کیا۔ ہم نے سنا اور مان لیا۔

اگر یہ کہہ دیا جائے اللہ ہمارے شہر میں کسی انسان کی شکل میں موجود ہے تو بغیر کسی لمحہ کے توقف کے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے، بہتان ہے، سراسر غلط ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس سے اللہ نے کلام کیا اور اس سے کہا ہے کہ وہ لوگوں سے کہہ دے کہ عذاب آنے والا ہے، تو یہ غلط ہوگا اور کہنے والا جھوٹی نبوت کا دعویٰ دار لائق تعزیر ہوگا۔

اگر کوئی انسان یہ کہہ دے کہ وہ اللہ سے جو چاہے منوا سکتا ہے تو یہ بات غلط ہوگی، ناممکن ہوگی۔ کُنْ فَیَکُوْن کی طاقت اللہ ہے۔ اللہ کے پاس انسان کا کہا ہُوا اللہ کا کہا ہوا نہیں ہو سکتا۔ اِلّا یہ کہ وہ انسان انسانِ کامل حضورِ اکرمؐ کی ذاتِ گرامی ہو۔ وہ ذات جو بغیر وحی کے کلام نہ کرے اور یہ صفت کسی اُمّتی سے منسوب کرنا مناسب نہیں۔

اللہ اور صرف اللہ کو ماننے اور اس سے تعلّق کا نام اسلام نہیں۔ حضور اکرمؐ کے وسیلے کے بغیر تقربِ الٰہی کا تصوّر خارج از اسلام ہے۔

ہم پر اللہ کی اطاعت فرض ہے۔ اللہ کی عبادت ضروری ہے، لیکن تقربِ حق کا کوئی ایسا دعویٰ، جو حضورِ انورؐ کے فرمائے ہوئے میزان کے علاوہ ہو، بہتان ہے اور اسے غلط ثابت کرنے کا تکلّف بھی غیر ضروری ہے۔

اسی طرح اسلام ایک مکمّل اور محفوظ دین ہے۔ اس کو تکمیل کی سند مالکِ حقیقی نے خود یہ کہہ کر فرمائی کہ "الیوم اکملت لکم دینکم"۔ جس دن، جس گھڑی جس لمحہ یہ دین مکمل کر دیا گیا، اس کے بعد کے اضافے، تخفیفیں، تحریفیں، رنگ رنگ کی وضاحتیں، انوکھی تشریحات اسلام پر احسان نہیں بلکہ اس کے برعکس اسلام کو اس کے بنیادی رنگ کے علاوہ کسی اور رنگ میں پیش کرنے کی سعی نامناسب ہے۔

اسلام کا اصل رنگ وہی ہے جو یومِ تکمیل کے وقت تھا۔ جس طرح ایک خواب، خوابِ حسیں، خوابِ مبارک، اپنی رنگا رنگ تعبیروں کی وجہ سے خواب مبہم بن کر رہ جاتا ہے، اسی طرح اسلام کی

حقیقت وضاحتوں کے اضافی بوجھ میں دب کر رہ گئی ہے۔

آج تک سُورج کے منور ہونے کا ثبوت کسی نے پیش نہیں کیا۔ شاید اس لیے کہ سُورج کا ثبوت دیکھنے والی آنکھ کے علاوہ ممکن نہیں اور دیکھنے والی آنکھ کو ثبوت درکار نہیں۔

اللہ کو ثابت کرنے کی کوشش کرنے والا بھی اُتنا ہی گمراہ ہے جتنا اللہ سے انکار کرنے والا۔ اللہ ثابت کرنے سے ثابت نہیں ہوتا۔ اللہ کو ماننا ہے' جاننا نہیں ہے۔ یہ تسلیم بغیر ایمان کے نہیں اور ایمان پیغمبرؐ کی صداقت کو تسلیم کرنے کا نام ہے اور یہ تسلیم اطاعتِ شریعتِ محمدیؐ ہے۔ اسلام تحقیق سے نہیں' تسلیم سے حاصل ہوتا ہے۔

اسلام کو عمل سے نکال کر علم میں داخل کرنے والے اسلام کے محسن نہیں ہیں۔ اسلام پر کتابیں لکھنا اور کتابوں پر کتابیں لکھنا اور تبصرے کرنا اور تقریریں کرنا اسلام نہیں۔ ایک کافر اسلام پر یا حضورؐ کی حیاتِ طیبہ پر کتاب لکھ کر تو مومن نہیں ہو سکتا۔ مومن وہ ہے جس کو اعتمادِ شخصیتِ نبیؐ حاصل ہو اور جسے وابستگیٔ نبیؐ حاصل ہو۔ مومن وہ نہیں' جسے بھائی مدد کو پکارے تو وہ اسے قرآن سنانا شروع کر دے۔ مومن وہ نہیں جو وعدہ پورا نہ کرے اور نماز پوری کرے۔ مومن وہ نہیں جو منبر پر کھڑے ہو کر مسلمانوں میں انتشار پھیلائے۔ فرقہ پرست' حق پرست نہیں ہو سکتا۔

اسلام مسلمانوں کی وحدتِ فکر و عمل کا نام ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت ہمیشہ اسلام کے قریب رہے گی۔ وحدتِ ملّت سے جُدا ہونے والا فرقہ اسلام سے جُدا ہو جاتا ہے۔

شارحین اسلام کی طویل اور معکوس وضاحتوں نے فرقے تخلیق کیے ہیں۔ فقہا، علمأ اور فقرأ کی نیت پر شک نہیں۔ ان کا تدبّر درست' ان کے ارشادات بجا' لیکن مسلمانوں کی وحدت' ان کی تعمیر و ترقی کے لیے اسلام کے اتنے فرقے کس حد تک موزوں رہے' تاریخ شاہد ہے۔ اسلام کے چہرے کو اتنے پیوند لگائے جا چکے ہیں کہ اس کا اصل رنگ دب کر رہ گیا ہے۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ سب فرقے اپنے اپنے مقام پر صادق ہیں' تو بھی فرقہ سازی کا

عمل خوبصورت عمارت کو اینٹ اینٹ میں تقسیم کر دے گا اور اسلام کا رُعب جمال جو باعث عروج و کمال تھا، اضمحلال و زوال کا شکار ہو جائے گا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرقہ وحدتِ ملت کی طرف سفر کرے اور ایک بار پھر وہی مقام حاصل ہو جائے جو اسلام کا حق ہے اور یہ حق برحق ہے۔

بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے ہاں کئی لاکھ مساجد ہیں اور کئی لاکھ آئمہ مساجد۔ اس کے باوجود قوم کا عالم یہ ہے کہ معاشرے میں تمام برائیاں موجود ہیں۔ اسلام کا بیان بہت ہو چکا' اب اسلامی عمل کا وقت ہے۔ اپنے سماج کی تطہیر اور اس کے بعد تطہیرِ نظامِ دنیا منصبِ اسلام ہے۔

آئیے ایک سرسری جائزہ لیں کہ ہمارے ہاں اسلام کے نام پر کیا کیا ہو رہا ہے اور اس کا نتیجہ کیا برآمد ہو رہا ہے۔

مذہبی فرقے اور ان کے سربراہ، دوسرے مذہبی فرقوں اور ان کے سربراہوں پر تنقید کر رہے ہیں۔ مقامِ توحید اور مقامِ رسالت کے تحفّظ کے نام پر ایک گروہ دوسرے گروہ کا مخالف ہے۔ یارسُول اللہ کہنے یا نہ کہنے پر ابھی تک دلائل دیئے جا رہے ہیں۔ تبلیغی جماعتوں کے اندازِ فکر پر بہت کچھ کہا جا رہا ہے۔ تقریباً ہر فرقے کے پاس ہر دوسرے فرقے کے لیے فتویٰ' کفر موجود ہے۔

مسلمانوں کو اسلام کا ماضی سُنا سُنا کر ملّتِ اسلامیہ کو قصّہ ماضی بنایا جا رہا ہے۔ اسلام میں اتنا اسلام ملا دیا گیا ہے کہ اب نتیجہ صفر ہے۔ ہر فرقہ اسلام کے نام پر علیحدہ ہوتا جا رہا ہے، حالانکہ اسلام وحدتِ ملت کا نام ہے۔

سیاسی اور سماجی تحریکیں اسلام کے نام پر قائم ہیں اور ان میں اتنا فرق ہے کہ اصل اسلام کا پتہ نہیں چلتا۔ ایک مسلمان ملک کا معاشرہ دوسرے مسلمان ملک کے معاشرے سے مختلف ہے۔ صحیح اسلامی معاشرہ کہیں قائم نہیں ہو سکا۔

اسلام ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے' اس لیے سب کے غور کرنے والی بات ہے کہ ایک مسلمان ملک دوسرے مسلمان ملک کے خلاف جنگ جہاد لڑ رہا ہے۔ مسلمان مسلمانوں سے لڑ رہے ہیں۔ اس لیے کہ ہر ایک کا اسلام مختلف ہے۔ اسلام میں اسلام کے نام پر بہت کچھ ملایا جا چکا ہے۔

اس کے برعکس افغانستان پر روسی حملہ کے باوجود کسی طرف بھی جہاد کی ضرورت کا احساس نہیں پیدا ہوا۔ اسلامی شعور مفقود ہوتا جا رہا ہے۔

اپنے ملک میں اسلام کے نفاذ کی کوشش جاری ہے۔ چودہ سو سال بعد بھی مسلمانوں پر اسلام کا نفاذ ایک مسئلہ ہے۔

غور کرنا پڑے گا کہ یہ کیسے مسلمان ہیں جن پر ابھی اسلام کا نفاذ ہونا ہے اور یہ کیسا اسلام ہے جو ابھی مسلمانوں پر نافذ ہونا ہے۔

میلادِ مصطفےٰ کانفرنس کچھ اور تقاضا رکھتی ہے۔ تبلیغی جماعت کچھ اور انداز اختیار کرتی ہے۔ علماء کانفرنس، مشائخ کانفرنس سے الگ ہوتی ہے۔ بریلوی، دیوبندی الگ الگ انداز ہیں۔ یارسول اللہ کانفرنس، محمدؐ رسول اللہ کانفرنس سے الگ ہے۔ ایک اسلام میں کئی اسلام شامل ہو چکے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ۔ "حقیقت خرافات میں کھو گئی"۔

اسلام وحدتِ ملّت کا پیغام لایا اور ہم اسلام کے نام پر تفریق کر رہے ہیں۔ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمانوں میں وحدتِ عمل کی کمی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جب تک تمام فرقے اور تمام شارحینِ اسلام اکٹھے نہیں ہوتے، وحدتِ ملت کا تصور تک ممکن نہیں۔

قائداعظم کے پیچھے چلنے والوں سے تو کسی نے کلمہ نہیں سُنا تھا، کیوں ؟

پاکستان کے لیے جان قربان کرنے والوں سے تو کسی نے نہ پوچھا کہ وہ کس طریقت کے لوگ ہیں۔

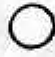
افسوس ہے کہ قرآن وہی ہے، اللہ وہی ہے، اللہ کے رسولؐ وہی ہیں لیکن اسلام وہی نہیں۔ ہر آدمی اسلام کا دعویدار ہے اور ہر دوسرا آدمی بھی یہی دعویٰ رکھتا ہے، لیکن وہ آپس میں اکٹھے نہیں ہوتے۔ کیوں ؟

اسلام میں اسلام کے نام پر بہت کچھ شامل ہو گیا۔ نتیجہ صفر ہے۔ آج اسلامی معاشرہ، اسلامی معیشت، اسلامی فقہ، اسلامی اخوّت، اسلامی وحدت، اسلامی ثقافت سب بدل سے گئے ہیں۔

ہم حضور پُرنورؐ کے دور سے اتنی دور آ گئے ہیں کہ ایک بار پھر وہیں سے شروع کرنا پڑے گا

کلمہ توحید کو رُوح وحدت مان کر اسلام کا عمل شروع کرنا چاہیے، ورنہ علم اور صرف علم اسلام سے بہت دُور لے جائے گا۔ ایمان والے نفاق سے توبہ کر کے وحدت و محبّت میں متحد ہو جائیں، ورنہ کثرتِ اسلام نتیجہ صفر دیں گے۔

اسلام جب اللہ کا دین ہے تو اسے اللہ کی رضا حاصل ہونا چاہیے اور اللہ کی رضا ہی مُسلمانوں کی سرفرازی کی ضامن ہے۔ آج کے مسلمانوں کی زبوں حالی اس لیے ہے کہ اسلام میں ملاوٹ ہو گئی ہے۔ آج کے فقہا مُسلمانوں کو ایک اسلام سے وابستہ کر کے انہیں پھر عروج کی منزل دکھائیں۔ ابھی وقت ہے۔ فرقوں سے الگ ہو کر وحدتِ ملّت کی طرف سفر کیا جائے، ورنہ اگر یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو خدانخواستہ ہر مسجد، مسجدِ قرطبہ بن کر رہ جائے گی، ماضی کی یادگار عظیم یادگار مسجد قرطبہ حال اور مستقبل سے محروم۔ ہم مسلمان ہیں۔ یہی ہمارا فرقہ ہے۔ یہی ہماری طریقت ہے اور یہی ہماری جمعیت۔ کلمہ طیّب ہی کلمۂ توحید ہے۔ اسی بُنیاد پر وحدتِ ملّت کی عمارت استوار کی جاسکتی ہے۔ مسلمان متحد ہو جائیں تو نصرت اور کامیابی ان کا مقدّر ہو جائے، ورنہ اسلام میں فرقہ سازی اور فرقہ کا عمل ہمیں اسلام سے اتنا دُور لے جائے گا کہ ہم مسلمان کہلانے کے قابل ہی نہ رہیں گے۔



کشتی ہچکولے کھا رہی ہو تو اللہ کی رحمت کو پکارا جاتا ہے۔ جب کشتی کنارے لگ جائے تو اپنی قوتِ بازو کے قصیدے کہے جاتے ہیں۔ بہت کم انسان ایسے ہیں جو اپنے حاصل کو رحمتِ پروردگار کی عطا سمجھتے ہیں۔

رفاقت

رفاقت کی تمنا سرشتِ آدم ہے۔ انسان کو ہر مقام پر رفیق کی ضرورت ہے۔ جنت بھی انسان کو تسکین نہیں دے سکتی، اگر اس میں کوئی ساتھی نہ ہو، کوئی اور انسان نہ ہو، کوئی ہمراز نہ ہو، کوئی سننے والا نہ ہو، کوئی سنانے والا نہ ہو۔ آسمانوں پر بھی انسان کو انسان کی تمنا رہی اور زمین پر بھی انسان کو انسان کی طلب سے مفر ممکن نہیں۔

تنہائی صرف اسی کو زیب دیتی ہے جو "لاشریک" ہے، جو ماں باپ اور اولاد سے بے نیاز ہے۔ لامکاں میں رہنے والا تنہا رہ سکتا ہے، لیکن زمین پر رہنے والا تنہا نہیں رہ سکتا۔ یہ انسان کی ضرورت بھی ہے اور اس کی فطرت بھی۔

انسان کسی مقام پر تنہا نہیں رہ سکتا۔ قبل از پیدائش اور بعد از مرگ کے حالات تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن زندگی میں انسان پر کوئی دَور ایسا نہیں آتا جب وہ تنہا ہو۔ نہ جنازہ تنہا، نہ شادی تنہا۔ رات کے گہرے سنّاٹے میں اپنی کرسی پر اکیلا بیٹھا ہُوا انسان بھی اکیلا نہیں ہوتا۔ اسے ماضی کی صدائیں آتی ہیں۔ اس کے ساتھ وہ نظارے ہوتے ہیں، جو اس کے سامنے نہیں ہوتے۔ یادوں کے گلاب کھلتے ہیں۔ جلتی بجھتی آنکھوں کے طلسمات وا ہوتے ہیں۔ حسین پیکروں کے خطوط ابھرتے ہیں، ڈوبتے ہیں۔ گزرے ہوئے ایام پھر سے رخصت ہونا شروع ہوتے ہیں۔ خشک شاخیں زخموں کی طرح پھر سے ہری ہوتی ہیں اور اس سنّاٹے میں آوازیں ہی آوازیں آنی شروع ہوتی ہیں اور یوں تنہائی میں تنہائی ممکن نہیں ہوتی۔

رفاقت کی افادیت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی صفات اور اپنی صلاحیتوں

کا جائزہ لے۔ ہماری ہر صلاحیت رفاقت کی محتاج ہے۔ ہماری گویائی سماعتِ رفیق کی محتاج ہے۔ ہماری سماعت آوازِ دوست کی منتظر رہتی ہے۔ ہماری نگاہ دوست کے چہرے سے خوراک لیتی ہے۔ ہمارا چہرہ مرکزِ نگاہِ یار ہوتا ہے۔ ہمارے افکار دوست کو روشنی دیتے ہیں اور ہم اس کی فکر سے پرورش پاتے ہیں۔ دل ہمارا ہوتا ہے اور درد دوست کا۔ ہماری خوشیاں شرکتِ حبیب سے دوبالا ہوتی ہیں اور ہمارے غم غمگسار کے تقرب سے کم ہوتے ہیں۔ ہمارا سفر ہمارے ہمسفر کی معیت سے بامعنی و پُررونق ہوتا ہے۔ ہمارا قیام اسی چراغ سے منور ہوتا ہے۔ دوست کی توجہ اور اس کا تعاون ہمیں عروج کی منازل سے آشنا کراتا ہے۔ ہمارے منصوبے ہماری زندگی میں اور ہماری زندگی کے بعد بھی ہمارے دوست کی نگرانی سے پروان چڑھتے ہیں۔

دوست سے گفتگو حکمت و دانائی کے رموز آشکار کرتی ہے۔ ہمارے ظاہر و باطن کا نکھار جمالِ ہم نشیں سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ ہماری عبادت بھی رفاقت سے سعادت حاصل کرتی ہے۔ ہماری تمام دعائیں اجتماعی ہیں اور اجتماع کی بُنیاد رفاقتوں کے فیض سے قائم ہے۔

وہ انسان جس نے رفیق سے وفا نہ کی، کسی سے وفا نہیں کر سکتا، نہ دین سے نہ خدا سے، نہ خود اپنے آپ سے۔ عظیم انسان اپنے حبیب پر غیر متزلزل اعتماد کے سہارے عظیم ہوتے ہیں۔

انتخابِ رفیق سے پہلے تحقیق کر لینا جائز ہے لیکن کسی کو دوست کہہ لینے کے بعد اسے کسی آزمائش سے گزارنا بددیانتی ہے۔ دوست کے ساتھ صرف ایک ہی سلوک روا ہے اور وہ وفا ہے۔ وفا کرنے والے کسی کی بے وفائی کا گلہ نہیں کرتے۔ اپنی وفا کا تذکرہ بھی وفا کے باب میں ابتدائے جفا ہے۔

رفاقت قائم رکھنے کے لیے انسان کو نہ ختم ہونے والا حوصلہ ملتا ہے۔ رفاقتیں گردشِ حالات سے متاثر نہیں ہوتیں۔ رفاقت صعوبتوں کی گھاٹیوں سے گنگناتی ہوئی گزرتی ہے۔

کائنات کی ہر شے میں ہمہ وقت تغیّر ہے لیکن رفاقت کے خمیر و ضمیر میں استقامت کا جوہر ہے۔ رفاقتوں کا مفرور زندگی سے فرار کرتا ہے۔

جس کو زندگی میں کوئی سچّا اور سُچّا دوست نہ ملا ہو اس جھوٹے انسان نے اپنی بدبختی کے بارے

میں اور کیا کہنا ہے؟

انسانوں کا جہان رفاقتوں کا جہان ہے۔ یہ وفاؤں کی داستان ہے۔ رشتوں کی تقدیس ہے۔ سماجی اور دینی رابطوں کی تفسیر ہے۔ خوش نصیب ہے وہ انسان جس کا ہمسفر اس کا ہم خیال ہو۔

خدا سے لُو لگانے والے مخلوق خدا سے الگ بیٹھ کر عبادات کے درجات حاصل کرنے کے بعد مخلوقِ خدا کے پاس واپس لوٹا دیے جاتے ہیں تاکہ مخلوق کی راہنمائی کریں۔ تنہائیوں سے واپسی ہی رفاقت کی اہمیت کا ثبوت ہے۔ پیغمبروں نے پسندیدہ رفاقتوں کی دعائیں فرمائیں۔ کوئی عابد عبادت کی غرض سے جنگل میں تنہا بیٹھ جاتے تو بھی تنہا نہ رہ سکے گا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اس کے گرد انسانوں کا ہجوم اکٹھا ہو جائے گا۔ آستانہ بنے گا، عبادت گاہ بنے گی، لنگر خانے کھل جائیں گے اور طالبانِ حق و صداقت اس ویرانے میں بستی آباد کریں گے۔

پیدا ہونے والا بچہ جب آنکھ کھولتا ہے تو سب سے پہلے اسے جو شے نظر آتی ہے، وہ انسانی چہرہ ہے۔ شفیق چہرہ، نورانی چہرہ۔ محبت و مسرت سے سرشار ممتا کا مقدس چہرہ۔ اس کے بعد ساری زندگی چہروں کی رفاقت کا سفر ہے۔ ایک انسان کا تقرب ہی انسانیت کا تقرب ہے۔

نیکی، بدی، گناہ، ثواب، سب انسانوں سے وابستہ ہے۔ انسان سے آشنائی خداشناسی کی کُنہ ہے۔ رفاقت کا سرمایہ ہر سرمائے سے افضل ہے۔

انسان، انسان کی خاطر جان پر کھیل جاتا ہے۔ بادشاہ تخت چھوڑ دیتے ہیں، دوست کو نہیں چھوڑتے۔

رفاقتوں کے فیض اعتماد کے دم سے ہیں۔ بداعتماد انسان نہ کسی کا رفیق ہوتا ہے، نہ اس کا کوئی حبیب ہوتا ہے۔ بداعتمادی کی سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ انسان کو ایسا کوئی انسان نظر نہیں آتا جس کے تقرب کی وہ خواہش کرے اور نہ وہ خود کو کسی کے تقرب کا اہل سمجھتا ہے۔ تنہائی کی مسافر بیمار رُوحیں اذیت کی منزلیں طے کرتی ہیں۔

رفاقت زندگی ہے، فرقت موت۔

آج کے مشینی دور نے انسان کو انسان سے دُور کر دیا ہے۔ رفاقتِ بشری سے محروم انسان

مال اور اشیاء کی محبت میں گرفتار ہے۔ وہ نظریات کا قائل ہے، انسان کا قائل نہیں۔ آج کا انسان انسانوں سے بیزار ہے۔ وہ خود سے بیزار ہے۔ وہ غیر فطری زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس پر کربناک تنہائی کا عذاب نازل ہو چکا ہے۔ کوئی کسی سے ہمدردی نہیں رکھتا۔ کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ کوئی کسی کا بوجھ اٹھانے کو تیار نہیں۔

آج انسانوں کی بھیڑ میں ہر انسان اکیلا ہے، ایسے ہی جیسے ایک وسیع سمندر میں بے شمار جزیرے، ایک دوسرے کے آس پاس، لیکن ایک دوسرے سے ناشناس۔

ناشناسی اور ناآشنائی کی وبا پھیل چکی ہے۔ کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہیں ہے۔ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ سے بے خبر ہے۔ بھائی بھائی سے بیگانہ ہے۔ رشتوں کی تقدیس پامال ہو چکی ہے۔ افسر ماتحت کا خیال نہیں رکھتا، ماتحت افسر کا لحاظ نہیں رکھتا۔ استاد شاگردوں سے، شاگرد استادوں سے نالاں ہیں۔

ڈاکٹر مریض کی نبض پر ہاتھ رکھنے سے پہلے اس کی جیب پر ہاتھ رکھتا ہے۔ عجیب بے حِسی کا دَور ہے۔ رفاقت ختم ہو رہی ہے۔

مِلّتیں پائیدار رفاقتوں سے بنتی ہیں۔ رفاقت میسّر نہ ہو تو عناصرِ مِلّت میں ظہورِ ترتیب ممکن ہی نہیں۔ اینٹ کا اینٹ سے ربط ختم ہو جائے تو دیواریں اپنے بوجھ سے گرنا شروع ہو جاتی ہیں۔ مِلّت کے تشخص کی تلاش دراصل اپنے رفیق کی تلاش کا نام ہے۔ دیارِ حبیب ہی محبُوب ہو سکتا ہے۔ دوست ہی محبّت و وفا کا سرچشمہ ہے اور یہ محبت و وفا ملک و مِلّت کا سرمایہ ہے۔ جس انسان کا ملک میں کوئی دوست نہیں، وہ ملک سے دوستی نہیں کر سکتا۔

ملک کی خاطر قربانیاں دینے والے دراصل اپنی وابستگی کے لیے قربانیاں دیتے ہیں۔ جس کی وابستگی ختم ہو جائے، اس کی حُبّ الوطنی مشکوک ہو جاتی ہے۔ کارواں کو غبارِ راہ میں چھوڑ کر کسی نامعلوم منزل پر پہنچنے والا راہنما دراصل راہزن ہے۔ رہبر وہی ہے جو قافلے کو شادابیٔ منزل سے آشنا کرے۔

زندگی کا خوب صورت میلہ سنگت کے دم سے ہے۔ سنگت نہ ہو تو اس میلے میں ہر انسان اکیلا ہے۔ یہ میلہ خوش نصیبوں کا میلہ ہے۔ خوش نصیب وہ ہے جو کسی انسان کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ خوش نصیب وہ ہے جو کسی کا منتظر ہے۔ خوش نصیب وہ ہے جو رفیقِ طریق کے ہمراہ میلے پر نکلا ہے۔ دل میں رفاقت کی روشنی نہ ہو تو چراغوں کے میلے کس کام کے۔ بہر حال ہمارا رفیق ہی ہمارا میلہ ہے۔ وہی ہمیں زندگی اور موت کے جھمیلوں سے نجات دلاتا ہے۔

زقیدِ دو جہاں آزاد گشتم
اگر تو ہمنشینِ بندہ باشی



تارا ٹوٹا دیکھ کے دل نے کی پکار
کوئی مجھے بھی دیکھتا میں ٹوٹا سو بار



ہری ہری میں ہر گئی مین ہاری ہر بار
ہار ہی موری جیت ہے موہ سنگ کھیلے یار



بابل گھر کی راگنی ہوئی بدیش سوار
شہنائی کی گونج میں سکھیاں کریں پکار

تقدیر بدل جائے تو.....!

تقدیر کو اگر وہ فطرت کہہ دیا جائے، جس میں انسان پیدا ہوتا ہے تو تقدیر کا بدل جانا ایک ناممکن سی بات ہے۔ پہاڑ کا اپنی جگہ سے ٹل جانا ممکن ہے، لیکن فطرت کا بدل جانا ناممکن ہے۔ شیر بھوک سے مر جائے گا، لیکن گھاس نہیں کھائے گا، کیونکہ شیر کی فطرت میں ایسے نہیں۔ شیر کا مقدر گوشت ہے۔ شیر کی تقدیر اس کے مزاج کی شکل میں اس کے ساتھ ہے۔

شاہین کو شاید معلوم ہی نہ ہو کہ فطرت نے اس کی فطرت میں بلند نگاہی اور بلند پروازی اس طرح شامل کر دی ہے کہ اسے پرندوں کی دنیا کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس فطرت نے کرگس کو بلند پروازی تو دی ہے، لیکن پست نگاہی کا یہ عالم ہے کہ گدھ کی خوراک ہی مُردار ہے۔ پرجا گِدھ ہو یا راجہ گدھ، مُردار کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مُردار خوری اُس کی تقدیر ہے، اس کا مقدر ہے۔ گدھ کی آنکھ مُردار اجسام کے علاوہ کچھ اور دیکھنے سے قاصر ہے۔

کائنات کی ہر شے کو اپنے اپنے مقدر کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔ کسی شے کو اپنے مدار اور اپنے حصار سے باہر نکلنا دشوار ہے۔ اجسام اور افراد اپنے مزاج سے نکل کر اپنے آپ کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ ہر ذی جان اور بے جان شے کا اپنی تقدیر میں پابند رہنے کا عمل ہی اس کائنات کی استقامت اور اس کے حُسن کا راز ہے۔

اگر ہوائیں چلنے سے انکار کر دیں، تو نظامِ ہستی ختم ہو جائے۔ سُورج تپش سے باہر نکل جائے، تو کائنات درہم برہم ہو جائے۔ ہر شے اپنے مقدر میں رہن رکھی جا چکی ہے۔

انسان کو اکثر یہ بات ناگوار لگتی ہے کہ اس کے لیے ایک تقدیر بھی مقرر کر دی گئی ہے۔ پابندی

اور جبر انسان کو کبھی پسند نہیں رہا۔ اسے آزادی اور آزاد خیالی سے محبت ہے۔ اگر انسان سے یہ کہہ دیا جائے کہ پستیوں میں رہ کر بلندیوں کی تمنا کرنا ہی اس کا مقدر ہے، تو شاید یہ بات اتنی واضح نہ ہو۔ پابندیوں میں آزادیوں کی تمنا انسان کی سرشت میں تو ہے، لیکن وہ آزادی کی خواہش کو مقدر کی مجبوری ماننے پر بھی تیار نہیں۔

بہشت میں انسان کو ہر طرح سے آزادی تھی، خوشی تھی، محنت کے بغیر خوراک میسر تھی۔ کیا نہیں تھا۔ صرف ایک پابندی تھی کہ اُس درخت کے قریب نہیں جانا۔ انسان نے اپنا بہشت قربان کرکے یہ پابندی آخر توڑ ہی دی۔ انسان آزادی چاہتا ہے، مقدر سے بھی آزادی۔

کوئی شخص پیدا نہیں ہوتا جب تک اس کے ہمراہ اس کا مقدر نہ پیدا ہو۔ اچھا یا بُرا۔ مقدر ضرور ہوتا ہے۔

اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ انسان کے ماں باپ ہی اس کا مقدر ہیں۔ اب پیدا ہونے والا بچّہ والدین کی صفات لے کر پیدا ہُوا۔ اسے وہ ماحول ملا۔ وہ عقائد ملے۔ وہ مزاج ملا۔ وہ محبّت، وہ شفقت، جو ملا سو ملا۔ نفرت ملی تو بھی مقدر ملا۔ بہر حال پیدا ہونے والے کے ساتھ تقدیر موجُود ہے۔ اس مقدر سے مفر نہیں۔ انسان اپنے والدین کی تاثیر سے بچ نہیں سکتا۔ والدین کی فطرت ہر طرح سے اولاد پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اثر بڑھتے بڑھتے تقدیر بن جاتا ہے۔

انسان کا اپنا چہرہ اس کی تقدیر ہے۔ عمل اور کردار کے اظہار سے پہلے انسان کا چہرہ اس کے لیے پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے جذبات پیدا کرچکا ہوتا ہے۔

انسان کی تقدیر اس کے مزاج کی شکل میں اس کے اندر موجُود رہتی ہے۔ یہ مزاج خواہش پیدا کرتا ہے۔ خواہش عمل پیدا کرتی ہے اور عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ ہم نتیجہ کو مقدر کہہ لیں یا اس مزاج کو جس سے یہ نتیجہ نکلا، فرق نہیں پڑتا۔ مقدّر بہر حال انسان کے ساتھ ہے۔

تقدیر کے مقابلے میں انسان نے تدبیر کا تصوّر رکھا ہُوا ہے۔ تدبیر یا حُسنِ تدبیر ہی دراصل تقدیر کی مہربانی ہے۔ ہماری تدبیریں تقدیر کی معاون ہیں۔ تقدیر کے مقابل نہیں آسکتیں۔ جب

بُرے دن آتے ہیں، تو انسان کی تدبیریں غلط ہو جاتی ہیں۔ ہمیں غلط یا صحیح مشورہ دینے والا دوست تقدیر کا قاصد ہوتا ہے۔

کیا تقدیر بدل سکتی ہے؟ اگر تقدیر بدل جائے تو بدلنے سے پہلے بھی تقدیر کا ہونا بے معنی سا ہے۔ تقدیر بدل جائے تو حاصل بھی ہے تقدیر! دراصل تقدیر نہیں بدلتی۔ جو بدل جائے وہ تقدیر نہیں۔

جب ہم کسی تکلیف میں ہوتے ہیں، تو ہم سمجھ نہیں سکتے کہ تقدیر اب کیا ہے۔ اگر مقدر اچھا ہو، تو کہیں نہ کہیں سے کوئی نگاہ مردِ مومن کی نگاہ بن کر تکلیف دور کر جاتی ہے۔ نگاہِ مردِ مومن ہی تقدیر ہے۔ سب کے لیے نہیں ہے، جس کے لیے ہے اُس کا مقدر!

تقدیر پر بحث کرنا مناسب نہیں ہے۔ جبر و قدر کے مسائل بحث سے حل نہیں ہوتے۔ جو کچھ ہوگیا، جو گزر گیا، اسے تقدیر کہہ لیا جائے اور جو ہونا ہے، آنے والا ہے، اسے امکان کہہ لیا جائے، تو بات سمجھ میں آسکتی ہے۔ آنے والا بدل سکتا ہے، کیونکہ ابھی آیا نہیں۔ گزرا ہوا بدل نہیں سکتا، کیونکہ وقت کا پہیہ واپس نہیں ہو سکتا۔ یہی تقدیر ہے کہ جو گیا وہ واپس نہیں آیا۔ اگر واپس آیا تو وہ، وہ نہیں تھا، سب کچھ بدل گیا تھا.....

جب انسان کا شعور بیدار ہوتا ہے، وہ اس کائنات کی ہمہ رنگ نیرنگیوں کا جائزہ لیتا ہے۔ وہ اپنے لیے کچھ پسند کرتا ہے۔ کچھ انتخاب کرتا ہے۔ بس یہی لمحۂ انتخاب، لمحۂ تقدیر ہے۔ تقدیر ہمیں ہماری عاقبت کے سامنے لے جاتی ہے۔ یہ خوش نصیبی بھی ہے اور بدنصیبی بھی ہو سکتی ہے۔

موسیٰ علیہ السّلام کو معلوم نہیں تھا کہ آگ کی تلاش ان کے لیے کون سا مقدر لانے والی ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ہمارا انتخاب ہمارے لیے کیا دشواریاں اور کیا آسانیاں لائے گا۔ ایک غلط فیصلہ زندگی کو بہشت سے نکال کر دوزخ میں ڈال دیتا ہے اور اسی طرح ایک قدم خوش بختی کا قدم، دوزخ سے نکال کر ہمیں بہشت میں پہنچا سکتا ہے۔

اس کائنات میں ایسے ہوتا ہی رہتا ہے۔ معمولی واقعات بہت معمولی واقعات بڑے غیر معمولی نتائج کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ تقدیر صرف میرا عمل ہی نہیں۔ تقدیر میرے دوست کا

عمل یہی ہے۔ دوست ناراض ہو جائے تو میری تقدیر بگڑ سکتی ہے، حالانکہ میری تقدیر کا میں ہی مالک ہوں۔ ہماری آدھی تقدیر ہمارے اعمال میں ہے اور آدھی اُن کے اعمال میں جو ہم سے وابستہ ہیں۔

انسان اپنی تقدیر آپ بنائے یا اُسے بنی بنائی تقدیر مل جائے، فرق نہیں پڑتا۔ ہم ایک مقررہ مدت تک یہاں ہیں اور اس کے بعد ہمارا سفر ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہمارے "فیصلے" ہمارے اعمال یا ہمارے نتائج پر نہیں بلکہ ہماری نیات پر ہوں گے۔ اچھی نیت ہی اچھا مقدّر ہے۔ اس شخص کی تقدیر بگڑ جاتی ہے، جس کی نیت میں فتور ہو۔ نیت کا بُرا انسان مقدر کا بُرا ہوتا ہے۔

تقدیر کا تعلق منشائے الٰہی سے ہے اور تدبیر کا تعلق میری منشا ہے۔ جو کچھ اللہ نے میرے لیے مقرر کر رکھا ہے، وہ مجھے مل کر رہے گا۔ میری سعی، میری کوشش بغیر منشائے الٰہی کے مجھے کچھ نہیں دے سکتی۔ میں تقدیر کے حصار سے نہیں نکل سکتا، کیونکہ میں وجود سے باہر نہیں نکل سکتا۔ میں آسمانوں کی وسعتوں میں نہیں رہ سکتا۔ میرا ٹھکانہ زمین ہے۔ یہی میرا مقدّر ہے۔

میں گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے کسی بھی ذریعۂ سفر کا انتخاب کر سکتا ہوں۔ بڑے امکانات ہیں۔ سفر کے لیے بڑے ذرائع ہیں، لیکن جب میں گاڑی میں سوار ہو جاتا ہوں، تو یہ مقدر ہے۔ میں اپنے لیے امکانات کے دستر خوان سے تقدیر کی ڈِش منتخب کرتا ہوں۔ مجھے اپنے انتخاب پر گلہ نہیں، اس لیے میں تقدیر سے راضی ہوں۔ وہ انسان، جو اپنی زندگی سے مطمئن ہے، وہ ہر طرح کی تقدیر سے مطمئن ہے۔ جو خود اپنے سے راضی نہیں، وہ تقدیر سے کیوں راضی ہو گا۔۔۔؟

دنیا کے عظیم انسان صاحبِ مقدر تھے، صاحبانِ نصیب تھے۔ ان کا عمل تو واضح ہے۔ ایسا عمل کرنے سے تو اتنی عظمت پیدا نہیں ہو سکتی۔ پیغمبرؐ کے دین پر چلنے والے ضرور فلاح پا سکتے ہیں۔

لیکن پیغمبروں کا مقدر دیکھیں کہ کس کے گھر میں پیدا ہو کر کیا بن گئے۔

اس کائنات کے اندر تقدیر نے عجب تقسیم کی ہے۔ کہیں نغمہ ہے، کہیں رنگ، کہیں مور، کہیں کوا۔ پہاڑ کو میخوں کی طرح گاڑ دیا۔ دریا کو روانی ملی۔ مچھلی تیرتی ہے۔ پرندے اُڑتے ہیں۔ سورج روشن ہے، رات تاریک۔ زندگی فانی ہے، زندگی عطا کرنے والا باقی ہے۔ اسی مقدر کی دلآویزیوں میں ہم نے چند روزہ زندگی صرف کرنی ہے۔ اپنے لطف میں سفر کریں۔ میرا مقدر میرے مالک نے میرے لیے بہتر مقرر فرمایا ہے۔ کوئی جھگڑے کی بات نہیں، میری تقدیر کی لکیر میرے ہاتھ میں بھی ہے اور اس کے ہاتھ میں بھی جس سے میرا تعلق ہے۔ جہاز میری تدبیر ہے۔ بھنور یا کنارا میری تقدیر۔ مکان بنانا میری تدبیر ہے۔ اس میں سکون ملتا ہے یا اضطراب، میرا مقدر ہے۔ اگر انسان پیدائش میں اور موت میں آزاد نہیں، تو اس کی زندگی کیسے آزاد ہو۔ جس کو اپنے آپ پر اعتماد نہ ہو، اُسے کسی خوش فہمی پر کیسے اعتماد ہو گا۔ جو انسان اپنے قد سے باہر نہیں نکل سکتا، وہ تقدیر کی حد سے کیسے باہر نکل سکتا ہے۔

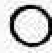
بہرحال تقدیر ماننے والوں کے لیے ایک نعمت ہے، نہ ماننے والوں کے لیے یہ آزمائش ہے۔ اگر یہ سوچ لیا جائے کہ ماضی میرا مقدر ہے، حال فیصلے کا لمحہ ہے، مستقبل امکانات کا خزانہ۔ فیصلے سے پہلے ہر راستہ منزل کا راستہ ہو سکتا ہے، لیکن فیصلے کے بعد مسافر کے لیے منزل تک پہنچنے کا راستہ صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہی مقدر ہے۔

مقدر بدل نہیں سکتا۔ ہمارے پروگرام بدل سکتے ہیں، لیکن امرِ الٰہی ٹل نہیں سکتا۔ بڑے بڑے کامیاب انسانوں کو اُن کی اولاد نے ایسی ناکامیاں عطا کی ہیں کہ بس خدا کی پناہ۔ اولاد کا عمل بھی والدین کے اعمال کی طرح انسان کی زندگی پر اثر انداز ہو کر اُسے ایک مقدر کے حوالے کر دیتا ہے۔

انسان اپنے آپ کو کہاں تک محفوظ کرے گا۔ چراغ کو آندھی اور طوفان سے تو بچایا جا سکتا ہے، لیکن چراغ کے اندر ہی سے تیل ختم ہو جاتا ہے۔ اس چراغ کو کوئی نہیں بجھاتا۔ یہ

خود ہی بجھتا ہے۔ زندگی کی دیوار اپنے بوجھ سے ہی گر جاتی ہے۔ یہی اس کا مقدر ہے۔
زندگی کو باہر سے خطرہ ہو، تو اس کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔ اگر خطرہ اندر ہی ہو، تو کیا کیا جائے۔ سانس خود ہی رک جاتی ہے۔ دل خود ہی بند ہو جاتا ہے۔ بس یہی مقدر ہے۔ اسے بدلنے کی خواہش اور کوشش تو ضرور ہوتی ہے، لیکن اسے تبدیل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

جو ٹل جائے، وہ مقدر نہیں، اندیشہ ہے۔ جو بدل جائے، وہ صرف امکان ہے، مقدر نہیں۔ جو نہ بدلے، وہ مقدر ہے۔ جو اٹل ہو، وہی امرِالٰہی ہے۔ وہی نصیب ہے۔ ہمارا نصیب، جو ہمارے عمل کے تعاون کا بھی محتاج نہیں۔ اُس بارش کی طرح ہے، جو آسمانوں سے نازل ہوتی ہے اور اُس زلزلے کی طرح ہے جو زمین کے اندر سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ اس میں کسی کا دخل نہیں۔ یہ فطرت کے فیصلے ہیں اٹل اور نہ بدلنے والے۔



قیامت کس طرح آئی اسے کوئی نہیں سمجھا
شبِ تاریک رخصت ہو چکی، سورج نہیں نکلا

بڑی محرومیاں لکھی گئیں اس کے مقدر میں
وہ راہی جو درختوں سے چرا کر لے گیا سایا

تمہاری یاد میں قلمیں لگائی ہیں گلابوں کی
تمہارے نام سے گھر میں لگایا سرو کا بوٹا

چلو اظہارِ غم پر تو ترے ماتھے پہ بل آئے
مگر ضبطِ فغاں پر کیوں تری آنکھوں میں خوں اترا

تلاش

ہر انسان کسی نہ کسی شے کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ کوئی کچھ چاہتا ہے، کوئی کچھ ڈھونڈ رہا ہے۔ انسانوں کے ہجوم میں آرزوؤں کا بھی ہجوم ہے۔ دشمن، دشمن کی تلاش میں ہے اور دوست، دوست کی جستجو میں۔

کائنات کی تمام اشیاء کا ہمہ وقت مصروفِ سفر رہنا کسی انوکھی تلاش کا اظہار ہے۔ آرزو کا انجام شکستِ آرزو ہو، تو بھی یہ ہستی کی دلیل ہے۔ سورج تاریکی کے شکار کو نکلا ہے اور تاریکی سورج کے تعاقب میں ہے۔ دریا کو سمندر کی لگن ہے اور سمندر کو دریا بننے کی خواہش مضطرب کر رہی ہے۔ ہر چیز اپنے اپنے مدار میں اپنی خواہش اور تلاش کے حصار میں ہے۔

تلاش متحرک رکھتی ہے اور حرکت رازِ ہستی ہے۔ تلاش ہی انسان کی جبلت ہے۔ یہ اس کا اصل ہے۔ یہ اس کا خمیر ہے۔ یہ اس کی سرشت ہے۔ جسے اور کوئی تلاش نہ ہو، وہ اپنی تلاش کرتا رہتا ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کون ہے؟ وہ کہاں سے آیا ہے؟ وہ کب سے ہے؟ اور وہ کب تک رہے گا؟ وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ وہ کون سا جذبہ ہے جو اسے محرومیوں اور ناکامیوں کے باوجود زندہ رہنے پر مجبور کرتا ہے۔

انسان اس بات سے آگاہ ہونا چاہتا ہے کہ یہ کائنات اور نظامِ کائنات کس نے تخلیق فرمایا؟ تخلیقِ حُسن میں کیا حُسنِ تخلیق ہے؟ یہ سب جلوے کس کے ہیں؟ کون ہے اس پردۂ رعنائی کے اندر؟ اور کون ہے اس پردے سے باہر؟ اور یہ پردہ کیا ہے؟

تلاش کا سفر اتنا ہی قدیم ہے جتنا ہستی کا سفر۔ ہر پیدا ہونے والے کے ساتھ اس کی

تلاش ہی پیدا ہوتی ہے۔ انسان آگاہ ہو یا بے خبر، وہ ہمیشہ رہینِ آرزو رہتا ہے۔ زندگی کی آرزو دراصل کسی کی جستجو ہے۔

انسان کو ہر وقت ایسے احساس ہوتا ہے، جیسے وہ کچھ کھو چکا ہے۔ وہ کچھ بھول گیا ہے۔ اُسے چھوڑی ہوئی منزل متلاشی بناتی ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے پاس کوئی قدیم راز تھا، جو گم ہو گیا۔ اس کا بے ربط ماضی اُسے کسی درخشندہ مستقبل سے محروم کر گیا۔ شاید وہ دنیا کے عوض آخرت کا سودا کر بیٹھا۔ انسان غور کرتا ہے اور جُوں جُوں غور کرتا ہے، ایک شدید پیاس کی طرح ایک نامعلوم تلاش اسے جکڑ لیتی ہے۔ اس تلاش سے مفر نہیں۔

جس انسان کو تلاش کے نقطہ ہائے دقیق سے آشنائی نہ ہو، وہ دوسرے انسانوں کے چہرے ہی دیکھتا چلا جاتا ہے، جیسے اِن چہروں میں اسے کسی خاص چہرے کی تلاش ہو اور وہ چہرہ شاید اس نے دیکھا ہُوا بھی نہ ہو، لیکن اُسے پہچان لینے کا دعویٰ اس کے پاس موجود ہو۔ ان دیکھے چہرے کو ڈھونڈنا اور اسے پہچاننا انسان کی تلاش کا کرشمہ ہے۔ ایسے لگتا ہے، جیسے انسان اُس چہرے کو پہلی بار دیکھنے سے پہلے بھی دیکھ چکا ہو۔

انسان کی تلاش ہی اس کا اصل نصیب ہے۔ یہی اُس کے عمل کی اساس ہے۔ یہی تلاش اس کے باطن کا اظہار ہے۔ یہی اس کے ایمان کی روشنی ہے۔ تلاش انسان کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ اُسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بچھو اُسے اندر سے ڈس رہا ہے۔ وہ بھاگتا ہے، دوڑتا ہے، بے تاب و بیقرار اُس تریاق کی تلاش میں جو اِس زہر کا علاج ہے۔ جب وہ شکل سامنے آتی ہے، اُسے قرار آجاتا ہے۔ ہرچند کہ اُسے پہلی بار دیکھا ہے، وہ اُسے پہچان لیتا ہے۔

دراصل ہم جس شے کی تلاش کرتے ہیں، اسی نے تو ہمیں اپنی تلاش عطا کی ہے۔ منزل ہی تو ذوقِ سفر پیدا کرتی ہے اور ذوقِ منزل رہنمائے سفر ہوتا ہے۔ منزل اگر اپنے مسافر نہ پیدا کرے، تو ہر تلاش ایک واہمہ ہو کر رہ جائے۔ جو حاصلِ آرزو ہے، وہی خالقِ آرزو ہے۔

ضرورت کی تلاش اور شے ہے اور تلاش کی ضرورت اور شے۔ عرقِ گلاب یا گلقند کے لیے

گلاب کو تلاش کرنے والا ضرورت مند کہلائے گا۔ اس کی ضرورت کچھ اور ہے۔ اُسے ہم تلاش کے باب میں قابلِ غور نہیں سمجھتے۔ خوشبو کا مسافر، بُوئے گُل کو منزلِ دل کا مقام سمجھتا ہے۔ وادیٔ نور کے مسافروں کی راہنما نکہتِ گُل ہی تو ہے۔

کچھ انسان صداقت کی تلاش کرتے ہیں۔ یہ ساری کائنات ہی صداقت پر مبنی ہے، لیکن صداقت کا اپنا الگ وجود نہیں۔ صداقت، صادق کی بات کو کہتے ہیں۔ صادق کا قول صداقت ہے۔ اِس صداقت کی پہچان اپنی صداقت سے ہے۔ اپنی صداقت اعتمادِ ذاتِ صادق ہے۔ کسی جھُوٹے انسان نے کبھی کسی صادق کی تلاش نہیں کی۔ کاذب، صادق کا ہمسفر نہیں رہ سکتا۔ صادق ماننے کے بعد اس کی راہ کے علاوہ کوئی راہ گمراہی ہے۔

تلاش کا یہ مقام بہت ارفع ہے کہ انسان صداقت کی تلاش کرے۔ صادق سے نسبت کا سہارا لے کر انسان اپنی ذات سے آشنا ہو جاتا ہے۔ یہ تلاش اپنے باطن کی تلاش ہے۔ اپنے آپ میں جتنی صداقت میسر آئے گی اتنا ہی صادق سے تقرب بڑھے گا جس انسان کو اپنے آپ میں صداقت نظر نہ آئے، وہ نسبتِ صادق سے محروم ہو جاتا ہے۔

انسان کی پہچان کا راز اس کی تلاش میں مضمر ہے۔ ہم جس شے کے انتظار میں ہیں، وہی ہماری عاقبت ہے۔ ہمیں اپنے انتظار کا کھوج لگانا چاہیے۔ سچ کے مسافر سچے ہوتے ہیں اور جھُوٹ کے جھُوٹے۔

اس دنیا میں وہ لوگ بھی ہیں جو حقیقت کی تلاش کرتے ہیں۔ ان کا مدعا خالقِ حقیقی ہے۔ یہ تلاش نہ ختم ہونے والی تلاش ہے۔ اس سفر کا مدعا بھی سفر ہے۔ اس کی انتہا بھی سفر ہے۔ محدود کا لامحدُود کے لیے سفر کسی بیان میں نہیں آ سکتا۔ قطرے کو قلزم آشنا ہونے کے لیے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، وہی جانتا ہے جس پر یہ مقامات اور مراحل گزرتے ہیں۔

خالق کی تلاش بعض اوقات دنیا سے فرار کی خواہش ہے۔ دنیا سے گھبرا کر وحشت زدہ ہو کر انسان خالق کا قرب تلاش کرتا ہے۔ کچھ لوگ دُنیا کی نعمتوں کے حصول کے باوجُود، اس کی محبت میں

سرشار خالق کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ حقیقت کی تلاش انہیں کسی انسان تک ہی پہنچاتی ہے اور وہ انسان انہیں رازآشنا کر دیتا ہے۔ اس کے بعد کا سفر، جلوؤں کا سفر ہے۔ نور کا سفر ہے۔ اسی کائنات میں نئی کائنات کا سفر ہے۔ قطرے کا سفر وصالِ قلزم کے بعد انا البحر کا بیان ہے اور یہ بیان، بیان میں نہیں آسکتا۔

انسان جب کسی تلاش میں نکلتا ہے، تو اس کے پاس وہ ذریعہ ہوتا ہے، وہ آلہ ہوتا ہے، جس سے وہ اپنی تلاش کے مدعا کو پہچان سکے۔ اگر وہ آلہ آنکھ ہو تو حقیقت کسی چہرے، کسی منظر، کسی نظارے، کسی جلوے، کسی رعنائی، کسی رنگ کا نام ہے۔ حقیقت کا چہرہ بھی ہوتا ہے۔ جدھر آنکھ اٹھاؤ اُدھر ہی۔ اس کا رنگ بھی ہوتا ہے۔ سب سے احسن رنگ حقیقت کا رنگ ہے۔

اگر حقیقت کی تلاش میں انسان سماعت لے کر نکلے تو حقیقت نغمے کی شکل میں آشکار ہو گی۔ آواز کی صُورت میں جلوہ گر ہو گی۔ ایسا متلاشی دور کی آواز سنے گا۔ وہ خاموشی کی صدا سنے گا۔ وہ سناٹوں سے پیغام لے گا۔ اسے آہٹیں سنائی دیں گی۔ وہ تنہا ہو گا اور حقیقت اس سے ہمکلام ہو گی۔ اس سچے متلاشی کی سماعت ہی ذریعۂ وصالِ حق بن جائے گی۔ ایسے انسان کو افلاک سے نالوں کا جواب آتا ہے۔ اسے آہ و فغانِ نیم شب کا پیام آتا ہے۔ وہ سکوت سے کلام کرتا ہے آنے والے زمانے اس سے بات کرتے ہیں۔ اپنی سماعت، غیرِ حق پر بند کر دینے سے یہ راز کُھل سکتا ہے۔

حقیقت کی تلاش میں انسان صرف چہرہ بن کر نکلے، تو حقیقت آنکھ بن کر سامنے آئے گی۔ وہ آنکھ جو اس کے چہرے کی قیمت ہے۔ وہیں سے پہچان شروع ہو جائے گی۔ اُسے ہر چہرے میں اپنا ہی چہرہ نظر آنے لگے گا۔ وحدت الوجود کا یہ مقام، بیان میں نہیں آسکتا۔ یہ صرف مشاہدہ ہے۔ تلاش کرنے والوں کا حاصل۔

کچھ لوگ حقیقت کی تلاش میں نکلتے ہیں، سخاوت کے جذبات لے کر۔ وہ اپنا مال حقیقت پر نثار کرنے کے لیے ساتھ لیتے ہیں۔ حقیقت سائل کے رُوپ میں ان سے واصل ہو گی ضرورت مند سائل، محتاج، لیکن کَلی کے ساتھ سخاوت کرنے والے انداز کے ساتھ سخاوت وصالِ حقیقت

کا ذریعہ ہے۔ اگر انسان محتاج بن کر اس کی تلاش میں نکلے، تو حقیقت غنی بن کر سامنے آئے گی۔ ہماری تلاش کے روپ کے مقابل حقیقت نے روپ اختیار کرنا ہے۔

جو لوگ تلاش کے مقدس سفر میں دل لے کر نکلتے ہیں وہ حقیقت کو دلبری کے انداز میں پاتے ہیں۔ انہیں کائنات کا ہر ذرہ ایک تڑپتا ہوا دل محسوس ہوتا ہے۔ حقیقت کی ادائے دلبری ایسے متلاشی کو اپنا ذاکر بناتی ہے۔ وہ حقیقت کا ذکر کرتا ہے، حقیقت اس کا ذکر کرتی ہے۔ یہ عجب سلسلے ہیں۔ دل والے متلاشی اس مقام تک پہنچ سکتے ہیں، جہاں ذکر، ذاکر اور مذکور باہم ہوں۔ یہ وہ مقام ہے، جہاں چند ساعتیں صدیوں پر محیط ہوتی ہیں۔

کچھ ذہین لوگ عقلِ سلیم کے ذریعے حقیقت کی تلاش کے سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ یہ سفر بڑا محتاط ہوتا ہے۔ ایسے لوگ دنیا کے عبرت کدے میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ وہ تحیر آشنا ہو کر حقیقت آشنا ہو جاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کوئی نتیجہ بے سبب نہیں ہوتا اور کوئی سبب بغیر نتیجے کے نہیں ہو سکتا۔ اتنی بڑی کائنات بغیر سبب کے نہیں اور اس سبب کا ایک پیدا کرنے والا ضرور ہے اور وہی مسبّب ہے۔ عقل والے سبب سے مسبّب کا سفر کرتے ہیں۔ وہ نعمتوں سے مُنعم کا نشان معلوم کرتے ہیں۔ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہر چیز انسان کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ انسان زندہ ہونے کے باوجود زندگی کو نہیں سمجھ سکتا۔ وہ مرے بغیر موت کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔ وہ خالق سے راز آشنائی کا سوال کرتے ہیں اور اُن کو رموزِ مرگ و حیات سے آگاہ کر دیا جاتا ہے تو وہ کہہ اُٹھتے ہیں "اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" اور اس تسلیم کا نتیجہ "آگ گلزار بن جاتی ہے اور وصالِ حق کی منزل آسان ہو جاتی ہے۔"

غرضیکہ، تلاش جو انداز اختیار کرے، حاصلِ تلاش اُسی انداز سے سامنے آئے گا۔ اور سب سے اچھا اندازِ تلاش تقرب صادق ہے، اعتمادِ شخصیت صادق ہے۔ یہ تلاش عین ایمان ہے۔ سب سے سچے اور اکمل انسان نے حقیقت کے بارے میں جو فرما دیا، وہی حقیقت

ہے۔ اسی کی اطاعت کرنا ہے۔ نئے اندازِ فکر کی بدعت میں مبتلا نہیں ہونا۔

صداقت کا سفر، حقیقت کا سفر ہے۔ صادق کا تقرب حق کا تقرب ہے۔ صادق کی محبت حق کی محبت ہے۔ صادق کی رضا صداقت کی سند ہے اور صداقت کی سند حقیقت کا وصال ہے۔ آئینۂ صداقت میں جمالِ حقیقت نظر آسکتا ہے۔ اسی کی تلاش گوہرِ مقصد کی تلاش ہے اور یہی تلاش حاصلِ ہستی ہے اور یہی حاصل عین ایمان ہے۔



آنسو کیا ہیں ؟ بس موتی ہیں۔ چمکنے والے، بہنے والے۔ گرم آنسو انسان کی فریاد ہیں۔ پرانی یادوں کے ترجمان ہیں۔ یہ آنسو انمول خزانہ ہیں۔ معصوم و پاکیزہ، مستور دوشیزہ کے حسن سے زیادہ حسین، حور سے زیادہ مکنون۔ اور یہ خزانہ کمزور کی قوت ہے۔ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلنے والا آبِ حیات کا چشمہ، سعادتوں کا سرچشمہ، آرزوؤں کے صحرا میں نخلستانوں کا مژدہ۔ آنسو تنہائیوں کا ساتھی، دعاؤں کی قبولیت کی نوید، انسان کے پاس ایسی متاعِ بے بہا ہے، جو اسے دیدہ وری کی منزل عطا کرتی ہے۔

یہ موتی بڑے انمول ہیں۔ یہ خزانہ بڑا گرانمایہ ہے۔ یہ تحفۂ فطرت کا نادر عطیہ ہے۔ تقربِ الٰہی کے راستوں پر چراغاں کرنے والے موتی انسان کے آنسو ہیں۔

دُعا

جس کا خدا پر یقین نہ ہو، اس کا دعا پر کیوں یقین ہوگا۔ دعا در اصل ندا ہے، فریاد ہے مالک کے سامنے التجا ہے، اپنی فانی اور محدود زندگی کی کسی اُلجھن سے نکلنے کے لیے۔

فریاد کا سلسلہ پیدائش سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ معصوم اور بے شعور بچہ فریاد اور پکار سے زندگی کے سفر کا آغاز کرتا ہے اور اس کے بعد یہ عمل جاری رہتا ہے۔ انسان فریاد کرتا ہی رہتا ہے، کسی نہ کسی مشکل سے نجات کے لیے۔

بیمار آدمی جب اللہ کو پکارتا ہے تو وہ اپنی بیماری سے نجات چاہتا ہے۔ اسے اللہ کے ساتھ دوسری وابستگیاں یاد نہیں رہتیں۔ وہ صرف علاج چاہتا ہے۔ معالج چاہتا ہے۔ شفا چاہتا ہے۔ غریب کی دعا غریبی سے نجات کے لیے ہے۔ محبّت کرنے والے اللہ سے محبوب کا قرب مانگتے ہیں۔ غرضیکہ ہر انسان ایک الگ خواہش لے کر اللہ کو پکارتا ہے۔

اگر گوشِ باطن سے سنا جائے تو یہ کائنات ایک مجسم فریاد کی صُورت نظر آئے گی۔ دعا کا شعور فطری طور پر ودیعت کیا گیا ہے۔ آدابِ دُعا اور فضیلتِ دعا مذہب نے سکھائے ہیں، لیکن یہ شعور زندگی میں موجُود ہے۔

بچّہ بیمار ہو جائے، تو ماں کو آدابِ دعا خود بخود آ جاتے ہیں۔ جہاز خطرے میں ہو تو مسافروں کو دعا سکھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ دعا ان کے دل سے نکلتی ہے، بلکہ ان کی آنکھ سے آنسو بن کر ٹپکتی ہے۔

دعا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جہاں دعا مانگنے والا ہے، وہیں دعا منظور کرنے والا ہے۔

اگر آپ بآوازِ بلند دعا مانگیں تو وہ دُور سے سنتا ہے۔ اگر آپ دل میں دعا مانگیں، تو وہ وہیں موجود ہوتا ہے۔ دعا کا انداز، تقرب کے اظہار کا اعلان ہے۔ دعا الفاظ کی محتاج بھی ہے اور الفاظ سے بے نیاز بھی۔ دعا منظور فرمانے والا خود ہی اندازِ عطا فرماتا ہے۔ ہاتھ اٹھانا بھی دعا ہے۔ مُلتجی نگاہ کا اٹھنا بھی دعا ہے۔

ہم اللہ سے وہ چیز مانگتے ہیں، جسے ہم خود نہ حاصل کر سکیں، لیکن جس کا حاصل کرنا ممکن ہو۔ مثلاً ہم یہ نہیں مانگتے کہ اللہ ہمیں پرندوں جیسے پَر عطا کر، کیونکہ یہ ممکن نہیں۔ ہاں البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ ہمیں عشق کے پَر لگا کر اُڑا، کیونکہ یہ ممکن ہے۔

دعا پر اعتماد، ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے۔ یہ بڑے نصیب کی بات ہے کہ انسان دعا کا سہارا ہاتھ سے نہ جانے دے۔ جب کسی قوم یا فرد کا دعا سے اعتماد اُٹھ جاتا ہے تو آنے والا وقت مصیبت کا زمانہ ہوتا ہے۔ گناہ اور ظلم انسان سے دعا کا حق چھین لیتے ہیں۔

دعا مانگنا شرط ہے، منظوری شرط نہیں۔ اللہ کریم کے پاس مکمل اختیار ہے۔ چاہے تو گنہگار کی دعا منظور فرما لے، نہ چاہے تو پیغمبر کی دعا بھی منظور نہ فرمائے۔ نوحؑ سینکڑوں برس اللہ کے دین کی خدمت کرتے رہے، آخر اُن کا بیٹا بھی طوفان کی نذر ہو گیا، لیکن ان کے ایمان میں فرق نہ آیا۔ دعا آخر سوال ہی تو ہے۔ ماننے والا مانے یا نہ مانے۔ صاحبِ دعا خود بھی ابتلا سے گزرتا ہے۔ یہ زندگی ہے۔ اس میں غم ضرور آئے گا، تکلیف ضرور آئے گی، بیماری ضرور آئے گی اور پھر موت بھی ضرور آئے گی۔

ان حالات میں دعا کا مقام کیا رہ گیا؟ دعا کا یہی مقام ہے کہ انسان تقربِ الٰہی کی خواہش کو کمزور نہ ہونے دے۔ دعا یہ ہے کہ اللہ ہمیں اپنی رحمت سے مایوس نہ ہونے دے۔ دعا یہ ہے کہ ہمارا دل نورِ ایمان سے روشن ہو۔ دعا یہ ہے کہ اتنا کرم نہ ہو کہ ہم اس کی یاد سے غافل ہو جائیں اور اتنا ستم نہ ہو کہ ہم اس کی رحمت سے مایوس ہو جائیں۔ دعا یہ ہے کہ اللہ ہمیں منظور ہونے والی دعاؤں کی آگہی عطا فرمائے اور وہ دعائیں جن پر بابِ قبول بند ہو، ان کی توفیق عطا نہ فرمائے۔

انسان اکثر اُن چیزوں کو پسند کرتا ہے' جو اُس کے لیے نقصان دہ ہیں اور اکثر اُن چیزوں کو ناپسند کرتا ہے جو اُس کے لیے مفید ہیں۔ ہم اپنی پسند کی چیزیں مانگتے ہیں اور جب وہ حاصل نہیں ہوتیں تو ہم شکوہ کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا حاصل نہ ہونا ہی ہمارے لیے مفید ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مسنون دعائیں مانگی جائیں۔ ہمیں دعاؤں کی تعلیم دی گئی ہے۔ بچے کے پیدا ہونے سے لے کر میت کے دفن کرنے تک ہر مقام پر دعا کا طریقہ کار بتایا گیا ہے۔ مثلاً معمولی سا واقعہ ہے آئینہ دیکھنا' اس کے لیے بھی دعا ہے کہ "اے اللہ میرے چہرے کی طرح میرے کردار کو بھی خوب صورت بنا۔"

روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک آدمی دعا مانگ رہا تھا، گڑگڑا کر۔ ایک مقرب فرشتے کا وہاں سے گزر ہوا۔ عابد پہچان گیا کہ فرشتہ ہے۔ بولا "بھئی میری چند دعائیں اللہ میاں کے ہاں پہنچا دو۔" پھر اس نے آرزوئیں گنوانی شروع کیں۔ فرشتہ بولا "بس بس۔ میں سمجھ گیا" وہ بولا "کیا سمجھ گئے ہو۔ ابھی تو بات بھی مکمل نہیں ہوئی۔" فرشتے نے کہا "میں اللہ میاں سے کہہ دوں گا کہ تیرا فلاں بندہ کہہ رہا تھا کہ اے مالک! مجھے اپنے علاوہ سب کچھ دے دو۔"

بس بات اتنی سی ہے کہ ہم اُس سے اُس کے تقرب کے علاوہ سب کچھ مانگتے رہتے ہیں۔ اور پھر گلہ کرتے ہیں کہ دعا منظور نہیں ہوتی۔ ہم دوسروں کی تباہی اور ہلاکت کی دعا مانگتے ہیں' کیسے منظور ہو؟

دعا سے بلا ٹلتی ہے، زمانہ بدلتا ہے، انسان اپنے اعمال کی عبرت سے بچ سکتا ہے۔ ماں کی دعا دشتِ ہستی میں سایۂ ابر ہے۔ پیغمبر کی دُعا اُمّت کی فلاح ہے۔ دعا کی افادیت برحق ہے۔

دعا سے حاصل کی ہُوئی نعمت کی قدر ایسے کرنی چاہیے جیسے مُنعم کی۔ دعا منظور ہونے کے بعد شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہماری دعاؤں کو قبول فرمایا۔ یہ اس کا احسان ہے۔ کسی کے احسان کو اپنا حق نہ سمجھ لینا چاہیے۔

نیک آدمی کو چاہیے کہ وہ گنہگاروں کی بخشش کی دعا کرے۔ جاگنے والے کو چاہیے کہ سونے والوں کی فلاح کی دعا کرے۔ قوم کے ہر فرد کو قوم اور ملک کی سرفرازی کی دعا کرنی چاہیے۔

صاحبِ دعا صاحبِ محبت ہوتا ہے۔ اُسی کی دعا مقبول ہے جس کو انسانوں سے جانوروں سے، پرندوں سے غرضیکہ ہر ذی جان سے محبت ہو۔ محبت نہ ہو تو دعا محض تکلف ہے۔ زمین و آسمان اور اس کے مابین جو کچھ بھی ہے اُس کی خیریت کی دعا مانگی جائے تو اپنی زندگی خیریت سے گزر جاتی ہے۔ نفرت کرنے والا انسان دعا سے محروم ہو جاتا ہے۔ سب کی بھلائی چاہنے والا ہی مقبولِ بارگاہ ہے۔ اللہ کو سب سے زیادہ وہ ہستی محبوب ہے جس کو رحمتِ ہر دو عالم بنا کر بھیجا گیا۔ حضورؐ کے وسیلے اور واسطے سے دعاؤں کو مقبولیت عطا ہو جاتی ہے۔

اب احتساب میرے گناہوں کا کس لیے

اب واسطہ دیا ہے تمہارے حبیبؐ کا

بہر حال جب تک زندگی ہے دُعا رہے گی۔ دعا آہ ہے، فریاد ہے۔ شبِ تاریک کی تنہائیوں میں ٹپکنے والا آنسو بھی دعا ہے۔ سرِ نیاز کا بے نیاز کے سامنے جُھک جانا بھی دعا ہے۔ کسی بے بس کی نگاہ کا خاموشی سے سُوئے فلک اُٹھنا بھی دعا ہے، بلکہ مضطرب دل کی دھڑکن بھی دعا ہے۔ کسی دُور رہنے والے کو محبت سے یاد کرنا بھی دعا ہے۔ رُوح کی مخلصانہ آرزو بھی دعا ہے۔ دعا دینے والے کے در پر کبھی ہم سائل بن کر جاتے ہیں اور کبھی دعا دینے والا سائل بن کر ہمارے در پر دستک دیتا ہے۔ ہم کسی کی دعا کی تاثیر ہیں۔ ہماری دعائیں کسی اور زمانے کو اثر دیں گی۔ منظور ہو یا نامنظور، دعا بدستور جاری رہنی چاہیے۔



خاموش انسان خاموش پانی کی طرح گہرے ہوتے ہیں۔

خاموشی خود ایک راز ہے اور ہر صاحبِ اسرار خاموش رہنا پسند کرتا ہے۔ خاموشی دانا کا زیور ہے اور احمق کا بھرم۔

چہرہ

جس طرح آسمان کی بسیط وسعتوں اور عمیق پہنائیوں میں کروڑوں ستارے اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں، جمیل وجیم ستارے اور سیارے حسنِ کائنات کے انوکھے پُرتاثیر مظاہر ہیں، اسی طرح حیاتِ ارضی میں کروڑوں چہرے اپنے اپنے خیال اور اپنی اپنی ضرورت کے مدار میں سرگرمِ عمل ہیں، مصروفِ عمل ہیں، مصروفِ سفر ہیں۔ پُرتاثیر مؤثر چہرے حسنِ زندگی کی تفسیرِ مقدس کے مظاہر ہیں۔

چہرہ اور پھر انسان کا چہرہ، اللہ اللہ ایک عجیب داستان ہے، ایک پُرکیف مشاہدہ ہے، ایک مؤثر حقیقت ہے، ایک عظیم شاہکار ہے۔ احسنِ تقویم کی شرحِ دلپذیر ہے۔ احسن الخالقین کا حسنِ تخلیق انسانی چہرے سے عیاں ہے۔

چہروں کا مشاہدہ، ان کا مطالعہ، کتابوں کے مطالعہ سے کہیں زیادہ دانائی اور حکمت عطا کرتا ہے۔ زندگی کی کھلی کتاب میں ہر چہرہ ایک الگ باب ہے، ایک الگ انداز، ایک الگ تاثیر، ایک الگ مدار، ایک الگ عنوان ہے۔ خیر و شر کی تقسیم چہروں کے دم سے ہے۔ حکم ہے باری تعالیٰ کا کہ مجرم اپنے چہروں سے پہچانے جائیں گے اور پیشانیوں پر داغِ سجود منور کرے گا چہروں کو۔

جب ہم چہروں کی تلاوت و تسبیح شروع کرتے ہیں تو ہمیں عجیب و غریب مکاشفات حاصل ہوتے ہیں۔ چہرہ گویائی نہ بھی رکھتا ہو تب بھی پُرکشش اور پُرتاثیر ہے۔

انسان کو اگر دنیا میں کسی شے سے محبت ہوتی ہے تو وہ انسانی چہرہ ہی ہے۔ بچہ ایامِ طفل ہی

یں ماں کے چہرے کو مظہرِ ربوبیت اور مظہرِ محبت سمجھتا ہے۔ ماں کا چہرہ، ماں کی نگاہیں، ماں کی مسکراہٹیں بچے کے لیے اس اجنبی دیس میں انسیت، مانوسیت اور اپنائیت کا واحد ذریعہ ہے۔ ماں د ہو تو بچہ ہجوم میں بھی تنہائی محسوس کرتا ہے۔ ماں کا مقدس چہرہ بچے کے لیے کل کائنات ہے محبت کی عظیم داستانیں چہروں کی تاثیر کی داستانیں ہیں۔ چہرہ ہی جنتِ نگاہ ہے۔ انسان کی آنکھ جس منظر پر کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے وہ چہرہ ہی ہے صرف چہرہ، عقائد و نظریات سے بے نیاز۔

ایک پُر ہجوم سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر چہروں کا مشاہدہ کریں تو چہروں کا ایک کہکشاں ہے کہ جھلمل جھلمل کرتا ہے۔ تیزی سے رواں دواں چہرے ایک عجیب کہانی ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے ایک طاقتور مقناطیس لوہے کے ذروں کو کھینچے چلا جا رہا ہے۔ اور یہ ہے بھی حقیقت۔ آگے آگے لوبھ لالچ ہے، جسے مقصد بھی کہہ سکتے ہیں اور پیچھے پیچھے چہرے متحرک ہیں۔

کبھی ایسے محسوس ہوتا ہے کہ خوف کا کالا ناگ ان کے پیچھے بھاگ رہا ہے، غریب ہونے کا خوف۔ اور پیسہ کمانے کے لیے گھر سے چہرے نکل آتے ہیں۔ ان سہمے ہوئے لالچ زدہ چہروں میں ایسے چہرے بھی ملیں گے جو شانت ہیں، مطمئن ہیں۔ ان کا منظر الگ ہے۔ وہ ہجوم کے چہروں اور چہروں کے ہجوم سے الگ چہرے ہوتے ہیں۔ وہ بھی رواں دواں ہیں لیکن اپنی رفتار کے ساتھ۔ ان کو لوبھ اور خوف سے نجات مل چکی ہوتی ہے۔

اسی ہجوم میں ایسے چہرے بھی مل سکتے ہیں جو اپنے ناظرین کرام کی رفتارِ سفر بدل دیتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی مقصدِ سفر بھی بدل جاتا ہے۔ بجھے ہوئے افسردہ چہروں میں ایسے چہرے جگمگاتے ہیں یہ منور چہرے رنگ و نور کے مظاہر ہیں۔ فطرت کے کام ہیں، کسی کو کیا بنا دیا کسی کو کیا۔ یہاں امیری اور غریبی کی بات نہیں ہو رہی، حُسنِ تخلیق کا ذکر ہو رہا ہے۔

چہرہ عقدہ کشا بھی ہے۔ یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ طالب علم کو بھولا ہوا سبق استاد کا چہرہ دیکھتے ہی یاد آ جاتا ہے۔ مریدوں کو پیر کا چہرہ بلکہ تصورِ چہرہ دشت و جبل میں رہنما نظر آتا ہے گناہوں کی وادیوں میں سے گزرنے والے انسان کو ماں باپ کے چہرے محفوظ کرتے ہیں، باپ کا

چہرہ استاد کا چہرہ، پیر کا چہرہ ضمیر کی آواز ہے۔ انہی پاکیزہ چہروں کی یاد سے ضمیر زندہ ہوتا ہے۔ رات کے تاریک سناٹوں میں چہروں کی یاد نغمات کا کام دیتی ہے۔

ایک دفعہ ایک شخص زندگی کی نامناسب مصروفیتوں سے یک لخت تائب ہوگیا۔ اس کے دوستوں نے پوچھا "بھائی! تم کل تک رنگیلے تھے، آج کیا ہوگیا" اس نے کہا "میں عجیب حال میں پہنچ گیا ہوں۔ ہر وقت میری آنکھوں میں میری بیٹی کا چہرہ رہتا ہے۔ میری ناپاک نگاہوں کو میری بیٹی نے پاکیزہ کر دیا ہے"

انسان کے کردار کا اس کے گرد جمع ہونے والے چہروں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چہرہ ہی کردار، مرتبہ، تشخص کی اصل "وردی" ہے۔ چہرے پر سب کچھ لکھا ہوتا ہے۔ مسافر کے سفر کی صعُوبتیں اس کے چہرے پر بہت کچھ لکھ جاتی ہیں۔ گزرا ہوا زمانہ چہرے پر جھرُیوں کی شکل میں موجُود رہتا ہے۔ آنکھوں سے بہنے والے آنسو رخساروں پر بہت کچھ مرتسم کر جاتے ہیں۔

چہرہ آئینہ ہے انسان کے باطن کا۔ دل کی بات، دل کا حال چہرے پر ضرور نمایاں ہوتا ہے۔ محتاج کا چہرہ اور ہے اور سخی کا اور۔

بعض اوقات چہرہ انسان کی اصلیت کو چھپانا چاہتا ہے لیکن دیکھنے والی آنکھ چاہیے۔ پہچان رکھنے والے کے سامنے سب عیاں ہیں اور اگر پہچان نہ ہو تو چہرے کی تاثیر بے معنی ہے۔

کچھ لوگوں کو صرف ایک ہی چہرہ پسند ہوتا ہے۔ وہ اپنا چہرہ ہے۔ وہ اپنے چہرے کی سُرخی پر مست ہو کر اپنا خون سفید کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو کائنات میں اور کوئی چہرہ نظر ہی نہیں آتا۔

چہرے الرجی بھی پیدا کرتے ہیں۔ ایسا ہوتا آیا ہے کہ کسی کا چہرہ دیکھتے ہی کسی کے ہاتھ پاؤں پھُول جاتے ہیں۔ یہ محاورہ نہیں حقیقت ہے۔ کوئی چہرہ انسان کے لیے اعصاب شکن ہوتا ہے ناپسندیدہ چہروں میں زندگی گزارنے والے کا اکثر ہارٹ فیل ہو جایا کرتا ہے۔ چہروں کو خالق کی نسبت سے ہی دیکھنا عافیت ہے۔

چہرہ ثواب بھی ہے اور عذاب بھی۔ وصال کے انتظار میں جدائیاں کٹ جاتی ہیں۔ محبوب

کا چہرہ مصحف ہے اور نامحبوب چہرہ استغفر اللہ عذاب ہے مظلوم کے لیے ظالم کا چہرہ قہرِ خداوندی سے کم نہیں۔ عجیب بات ہے کہ کوئی چہرہ بیماری دے جاتا ہے اور کوئی چہرہ شفا عطا فرماجاتا ہے۔

وحدت الوجود پر بہت کچھ کہا گیا ہے۔ اس کے حق میں بھی اور اس کی مخالفت میں بھی چہروں کے علم میں وحدت الوجود مشاہدے کا ایک ایسا مقام ہے جہاں ہر چہرہ ایک ہی چہرہ نظر آنے لگتا ہے۔ احباب و اغیار کے چہرے سب ایک ہی چہرہ ہیں۔ وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت سب ایک ہی چہرے کی آنکھ مچولیاں ہیں۔ ایک ہی جلوہ ہے، بلکہ جلوہ ہی جلوہ ہے۔ اگر ایسا مشاہدہ نہ ہو تو ہمہ اوست خطرے سے خالی نہیں۔

چہرہ، تقویتِ ایمان کا باعث بھی ہے اور ایمان شکن بھی ہے۔ محبوب چہرہ دار سے پکارے تو سر کٹوانا مشکل نہیں۔ کافر چہرہ نگاہ میں آجائے تو انسان کو کعبے کا راستہ بھول جائے۔ چہروں کا طلسم زمان و مکاں کے سب طلسمات سے زیادہ قوی ہے۔ چہرہ خواب کی تعبیر ہے۔ زندگی کے بہتے ہوئے دریا میں انسانی چہرے حباب کی صورت ابھرتے اور ڈوبتے رہتے ہیں۔

چہروں کی کائنات میں ہر چہرہ ایک الگ کائنات ہے۔ ہر چہرہ الگ مضمون ہے، الگ صفت ہے۔ چہرہ مظہرِ انوار بھی ہے، حدتِ نار بھی۔ چہرہ فرشتہ صفت بھی ہے، شیطان صورت بھی۔ چہرہ رحمانی بھی، حیوانی بھی، شیر کی طرح دلیر چہرہ، سہما ہوا بزدل چہرہ، آئینہ رُو چہرہ، بے کیف پتھر چہرہ، خوش خبر چہرہ، بدشگون چہرہ، محتاج چہرہ، غنی چہرہ، خوش حال چہرہ، پائمال چہرہ، آسودہ چہرہ، آزردہ چہرہ، دل میں بسنے والا گلاب چہرہ، آنکھوں میں کھٹکنے والا خار چہرہ، مشتاق چہرہ، بے زار چہرہ، اپنا چہرہ، بیگانہ چہرہ، کافر چہرہ، مومن چہرہ، کرگس چہرہ، شہباز چہرہ، گلنار چہرہ، بیمار چہرہ، خوابیدہ چہرہ، شب بیدار چہرہ، فانی چہرہ، باقی چہرہ غرضیکہ ہر چہرے کی ایک صفت ہے اور ہر صفت کا ایک چہرہ ہے۔

چہرہ دل میں اُترتا ہے۔ چہرہ تخیل کو پرواز دیتا ہے۔ چہرہ رعنائی خیال پیدا کرتا ہے۔ چہرہ ہی آشوبِ تیرگی سے بچاتا ہے۔ اگر کوئی چہرہ نظر میں آئے تو سب سے پہلے اپنی بینائی کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ محبوب چہروں کو قدر شناس نگاہوں کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اگر بینائی ختم ہو جائے تو چہروں

کے چراغ، بجھ جاتے ہیں۔

خوش شکل چہرہ، قدرت کی طرف سے عطا ہونے والا پاکیزہ رزق ہے۔

چہروں کی کائنات میں سب سے زیادہ حسین چہرہ اس مقدس ہستی کا ہے جس پر اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں۔ آپؐ کا چہرۂ مبارک صورتِ حق کا آئینہ ہے۔ آپؐ کا رُوئے انور اتنی حقیقت ہے کہ خواب میں بھی نظر آئے تو عین حقیقت ہے۔ جس نے آپ کے چہرے کو دیکھا اس نے چہرۂ حق دیکھا۔ آپؐ کے چہرے کے لیے پیر مہر علی شاہؒ فرماتے ہیں:

سُبْحَانَ اللہ مَا اَجْمَلک مَا اَحْسَنکَ مَا اَکمَلک

آپؐ کا چہرۂ مبارک دیکھنے کے لیے اگر اللہ آنکھ عطا فرمائے تو بات ہے۔ ورنہ ہر آنکھ کی رسائی آپؐ کے چہرے کی رعنائی تک کہاں؟

ہر مسلمان کی مرتے وقت آخری خواہش یہی ہوتی ہے کہ "میرے مولا! مجھے آپؐ کا چہرہ دکھا۔ رحمت، شفقت، انوار سے بھرا ہوا چہرہ۔ جو موت کی کربناکیوں سے محفوظ فرمائے۔"

نہ آپؐ کے چہرے سے بہتر کوئی چہرہ ہے نہ آپؐ کی آنکھ سے بہتر کوئی آنکھ ہو سکتی ہے۔ آپؐ نے چہرۂ حق دیکھا اور چشمِ حق میں آپ ہی محبوب ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ

یہی چہرہ نشانِ وجہ اللہ
ورنہ رکھتا ہے کیا خدا چہرہ
مُصطفےٰؐ آنکھ ہو خدا صُورت
ہو خدا آنکھ، مُصطفےٰؐ چہرہ

سلام و درود ہو والضحیٰ کے چہرے کے لیے اور تعظیم اور سجدہ آپؐ کے بنانے اور چاہنے والے احسن الخالقین کے لیے۔

علم

ہم معلوم کو علم کہتے ہیں، حالانکہ نامعلوم اور لامعلوم بھی علم ہے، اُتنا ہی اہم جتنا معلوم۔ اگر ہم یہ کہہ دیں کہ معلوم کی نفی کا نام علم ہے، تو علم کی تعریف صرف یہ ہو سکتی ہے کہ اپنی لاعلمی کے احساس کا نام علم ہے۔ جتنا معلوم زیادہ ہوگا، اتنا ہی احساسِ لاعلمی زیادہ ہوگا۔ اس لیے جاننے والے اکثر یہی کہتے رہے کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔

کائنات میں اتنے علوم ہیں کہ ان کی اقسام گنوانا دشوار اور ناممکن ہے۔ کچھ چیزوں کے بارے میں بہت کچھ جاننا ممکن ہے۔ بہت سی چیزوں کے بارے میں کچھ کچھ جاننا ممکن ہے۔ سب چیزوں کے بارے میں سب کچھ جاننا ناممکن ہے۔

دراصل علم معلوم سے نجات کا نام ہے۔ یادداشت کا تعلق ماضی سے ہے اور ماضی کی حاصل کردہ معلومات حال کا علم نہیں ہو سکتا۔ آج کی کثیر المقاصد زندگی میں یادداشت کا محفوظ رہنا ناممکن سا ہے۔ ہمارا حافظہ ترجیحات کے بدلتے ہی کمزور ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ معلوم یا انفارمیشن، جو حافظے میں ہوتی ہے، دھندلا جاتی ہے۔ زندگی کے پیہم انقلابات، حادثات اور سانحات حافظے کو مفلوج کر دیتے ہیں اور حافظے کا علم حافظے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا گیا ہے کہ کسی مصنف کو اپنی ہی تصنیف کچھ عرصہ بعد اجنبی سی لگتی ہے۔ انسانی حافظے کا یہ عالم ہے کہ انسان کو پرانے چہرے تو یاد رہتے ہیں، پرانے دوستوں کے نام بھول جاتے ہیں۔ اپنی آنکھوں سے گزرے ہوئے جلوے بھول جاتے ہیں۔ انسان موت دیکھے تو زندگی بھول جاتی ہے، زندگی دیکھے تو موت یاد نہیں رہتی۔ آج کا انسان کمپیوٹر میں یادداشت محفوظ کرتا ہے اور کمپیوٹر سے علم لینے والا

خود ہی ایک کمپیوٹر بن کے رہ جاتا ہے۔

علم لائبریریوں سے دست بردار ہونے کا نام ہے۔ لائبریریاں بلاشبہ معلومات کا خزانہ ہیں۔ کتابوں کا مطالعہ ایک اعلیٰ مصروفیت ہے، لیکن کتاب زندگی نہیں ہے۔ زندگی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہی ہے۔ زندگی سانس کی نازک ڈوری ہے۔ پل پل کٹتی جا رہی ہے۔ زندگی اپنے گرد و پیش کی حرکات و اعمال کا نام ہے۔ سکالر زندگی کے میدان میں کمزور رہ جاتا ہے، علم کتاب کا نام نہیں۔ کتاب حقیقت کا عکس تو ہے لیکن حقیقت کے برعکس ہے۔ حقیقت کا ذکر کتاب میں ہے اور حقیقت کا مشاہدہ کتاب سے باہر ہے۔ نظارہ علم کا نہیں، نظر کا محتاج ہے بلکہ اندازِ نظر کا محتاج ہے۔ زاویۂ نظر بدل جائے تو منظر اور پس منظر بدل جاتے ہیں، لیکن کتاب نہیں بدلتی۔ کتاب کا نہ بدلنا اس کا حسن ہے اور زندگی کا بدلتے رہنا اس کا جمال ہے۔ کتاب زندگی کے خدوخال واضح کرتی ہے، لیکن زندگی کا لطف زندگی کے قرب میں ہے، کتاب کے تقرب میں نہیں۔

مقدس کتابیں نازل فرمانے والے نے زندگی بھی نازل فرمائی ہے۔ حسن بھی نازل فرمایا ہے۔ بینائی بھی عطا فرمائی ہے۔ نظاروں کی رعنائی بھی نازل فرمائی ہے۔ کتاب قانون ہے، پہچان کا لیکن پہچان کتاب کی نہیں، کتاب بھیجنے والے کی درکار ہے۔ کتابِ فطرت کا مطالعہ ضروری ہے۔ علم کتاب سے نہیں، نصیب سے ملتا ہے۔

سورج کے پاس علم نہیں، روشن نصیب ہے۔ علم بادِ صبحگاہی اور آہِ سحر گاہی سے ملتا ہے۔ تحیّر سے ملتا ہے۔ تعلّق سے ملتا ہے اور تقرب سے ملتا ہے۔ کتاب کا علم فیضِ نظر تک نہیں پہنچا سکتا۔ ایک معمولی سا کھِلنے والا پھُول علم دے سکتا ہے۔

شب تاریک کی گہرائیوں میں آنکھ سے ٹپکنے والے آنسو علم کے خزانے عطا کرتے ہیں۔ اللہ کا فضل ہی انشراحِ صدر عطا فرماتا ہے۔ ہر عارف عالم ہوتا ہے اور ضروری نہیں کہ ہر عالم عارف بھی ہو۔ بغیر تزکیہ کے کتاب کا علم خطرے سے خالی نہیں۔ شیکسپیئر اور غالب کو پڑھنے والا نہ ویسا ڈرامہ لکھ سکتا ہے نہ ویسا شعر کہہ سکتا ہے۔ غزالی کو پڑھنا بھلا، لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ غزالی نے کسی کو پڑھ کر یہ رتبہ نہیں

پایا۔ علم کوشش سے نہیں مقدر سے ملتا ہے۔ علم اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا، جب تک کوئی عطا کرنے والا نہ ہو۔ علم نگاہ سے ملتا ہے، کتاب سے نہیں۔ علم کا مخرج نگاہ ہے اور اس کا مدفن کتاب۔

تعلیم بھی علم نہیں۔ تعلیم کا تعلق ڈگری سے ہے۔ علم ڈگریوں اور یونیورسٹیوں سے بے نیاز ہے۔ جن لوگوں کی کتابیں یونیورسٹی میں پڑھائی جاتی ہیں، وہ خود کس یونیورسٹی کے طالب علم تھے؟ تعلیم ضروری ہے، نوکری کے لیے۔ نوکری ضروری ہے، حصولِ رزق اور سماجی مرتبے کے لیے، لیکن علم نوکری نہیں، علم روٹی نہیں، علم حکومت نہیں۔ علم پہچان ہے، عرفان ہے۔ ضرورت کا علم اور شے ہے، علم کی ضرورت اور شے۔

آج کی تعلیم، عیاں را چہ بیاں۔ آج ہی نتیجہ دے رہی ہے۔ طالب علموں کے حالات تعلیم کے ناقص ہونے کا ثبوت ہے۔ آج کا طالب علم، علم سے بیزار ہے۔ آج وہ استاد کہاں ملیں گے، جو طالب علموں کو فیضِ نگاہ سے آدابِ فرزندی سکھاتے تھے۔ آج کے طالب علم سے آج کی تعلیم نے علم کی محبت چھین لی ہے۔ ابھی وقت ہے۔ پانی سر سے نہیں گزرا۔ اس کا تدارک ہونا چاہیے۔ بدعلمی سے بے علمی ہی بہتر ہے۔

پیغمبروں کے پاس تعلیم نہیں، علم ہوتا ہے، بلکہ مکمل علم ہوتا ہے۔ زمانے کے معلم مکتب سے نہیں، رحمان سے علم حاصل کرتے ہیں۔

آج ہمیں اُسی علم کی ضرورت ہے۔ وہی ہماری اساس ہے اور وہی عاقبت۔ ہمیں زندگی کا علم چاہیے اور مابعد کا علم بھی چاہیے۔ ہمیں ظاہر کے علم کی ضرورت بھی ہے اور باطن کے علم کی بھی۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ چند روزہ زندگی میں بہت کچھ حاصل کرنا ہے اور پھر اسے چھوڑنا بھی ہے۔ پھیلنا بھی ہے، سمٹنا بھی ہے۔ آج کے تعلیمی اداروں سے محمدؐ بن قاسم پیدا نہیں ہو سکتے۔ یہی تعلیم کا المیہ ہے کہ تعلیم تلاشِ رزگار کے لیے ہے، تقربِ پروردگار کے لیے نہیں۔

ہم اُمّی رسولؐ کی اُمّت ہیں۔ ہمیں بے جہت اور بے سمت تعلیم کہاں لے جائے گی؟ مغربی تعلیم اسلامی نتیجہ کیسے پیدا کرے گی۔ اور اسلام کی تعلیم بھی اسلام نہیں۔ اسلام عمل ہے۔ اسلام

بتانے والی بات نہیں، کرنے والا کام ہے۔

بہرحال علم اُس کی عطا ہے، جس نے زندگی عطا فرمائی۔ عطا کو حاصل کرنے کے لیے دعا کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے۔ معلومات اور انفارمیشن کا علم آزمائش میں پورا نہیں اتر سکتا۔ کشتی کے مسافروں کو "صرف و نحو" کی ضرورت نہیں، انہیں تیرنا بھی آنا چاہیے۔

علم کو نور بھی کہا گیا ہے اور حجابِ اکبر بھی۔ نور اس لیے کہ علم پہچان کا ذریعہ ہے۔ آگہی اور ادراک کا باعث ہے۔ اسماء و اشیاء کا شعور ہے۔ ہمیں علم کی پہچان نہیں بلکہ مالک کی پہچان درکار ہے۔ خالق کو جاننا ہے۔ اپنے رازق سے باخبر ہونا ہے۔ کائنات کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہونا ہے۔ حیات و مرگ کے رموز دریافت کرنا ہیں۔ وہ علم جو ہمیں اِن سے آگاہ کرے، نورانی ہے۔ نورانی علم صرف یہ نہیں بتاتا کہ سبزہ و گُل کہاں سے آتے ہیں، بلکہ وہ علم ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون پالتا ہے۔ نورانی علم نشانِ منزل کا علم ہے۔ تزکیہ و حکمت کا علم ہے۔ اُلجھنوں سے نجات کا علم ہے۔ کیف و وجدان کا علم ہے۔ سراسر رحمان کا علم ہے۔

جس علم سے غرور پیدا ہو، اُسے حجاب کہا گیا ہے۔ جو علم نگاہ سے محروم ہو، وہ حجاب ہے۔ جو تعلق سے گریزاں ہو، وہ علم حجاب ہے۔ جو اپنی انا کے خول سے باہر نہ نکلے، وہ علم حجاب ہے۔ ابوجہل کے پاس علم تھا، لیکن نگاہ نہ تھی۔ اگر نظر نہ ہو تو علم جہالت سے بدتر ہے۔ انسان معلوم پر نازاں ہوتا ہے اور اسے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ہمہ وقت نامعلوم کی زد میں ہے۔ وہ خوش ہوتا ہے کہ اس کی دولت بڑھتی جا رہی ہے اور وہ بھول جاتا ہے کہ اس کی عمر گھٹتی جا رہی ہے، کٹتی جا رہی ہے۔ ایسے علم سے توبہ بہتر، جو صاحبِ علم کو نفع نہ دے۔

علم اگر خود آگہی کے قریب کرے تو نور، ورنہ حجاب۔ زیادہ جاننے کا غرور اگر نہ جاننے کی عاجزی میں بدل جائے تو حجاب اُٹھ جاتا ہے۔ فنا کا علم حجاب ہے، بقا کا علم نور۔ اگر علم کا مدعا خوشنودیٔ خلق ہے تو حجاب اور اگر علم کا منشاء رضائے حق ہے تو نور، بلکہ نورٌ علیٰ نور۔

اضطراب

اضطراب باعثِ ہستی ہے اور حاصلِ ہستی بھی۔ ہر زندہ انسان مضطرب ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ تڑپ رہا ہے۔ موجوں کا اضطراب تلاطمِ قلزم ہے اور یہی سمندر کی ہستی ہے۔ اضطراب ہی زندگی کو متحرک رکھتا ہے اور یہی تحریک، یہی حرکت ہستی کا ثبوت ہے۔ بے حرکت زندگی نباتات کی زندگی ہے۔

زندگی کا بیشتر حصہ وقفِ اضطراب رہتا ہے۔ انسان کی آرزوئیں، اس کی خواہشات، اس کے تقاضے، اس کے منصوبے اور اس کے عزائم اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ ان سب کا بیک وقت حصول ناممکن ہے۔ جب خواہشات دم توڑتی ہیں تو اضطراب پیدا ہوتا ہے۔

اضطراب اس لیے بھی پیدا ہوتا ہے کہ انسان کئی راستوں میں سے کسی ایک راہ کا انتخاب نہیں کر سکتا۔ قوتِ فیصلہ کی کمزوری انسان کو تذبذب میں ڈال دیتی ہے اور انجام کار وہ مضطرب رہنے لگتا ہے اور پھر انسان کا اضطراب اس سے سوچنے کی صلاحیت بھی چھین لیتا ہے۔

انسان علم حاصل کرتا ہے عمل کے لیے، لیکن جُوں جُوں علم پھیلتا ہے عمل کے مواقع سمٹنے شروع ہو جاتے ہیں۔ آج کے انسان کا سب سے بڑا عمل، حصولِ علم ہے اور یہ عمل اس کو فرائض کی بجا آوری کے عمل سے بہت دُور کر دیتا ہے۔ نتیجہ اضطراب ہے۔ سڑک کے کنارے کمرے میں بیٹھ کر زندگی کا مفہوم سمجھنے والا اُس زندگی کو بھی نہیں سمجھ سکتا، جو سڑک پر سے گزر رہی ہے۔ علم اور عمل کے فرق سے اضطراب پیدا ہوتا ہے۔

انسان کی کوشش جب متوقع نتیجہ حاصل نہیں کرتی، تو وہ مضطرب ہو جاتا ہے۔ پھُولوں کے خواب دیکھنے والا اپنے دامن میں خار دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے۔ خواب کی اونچی اڑانیں ہستی کو پستی سے نکال

نہیں سکتیں۔ انسان کی آرزو جب حسرت بن جائے اور اس کا حاصل لاحاصل ہو کے رہ جائے تو اس کا مضطرب ہونا بجا ہے۔ اپنے جب اجنبی بن کر پاس سے گزر جائیں تو انسان کیا کرے۔ وہ مضطرب ہوگا، بے قرار ہوگا، بے چین ہوگا۔

اگر اضطراب برداشت سے بڑھ جائے تو طرح طرح کی میڈیکل پریشانیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ اضطراب کو مایوسی نہ بننے دیا جائے، تو انسان بدلے ہوئے حالات سے گھبراتا نہیں۔ کچھ لوگ اضطراب میں چراغِ آرزو بجھا دیتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے خود کو ایک کرب میں مبتلا کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگ اضطراب کو تحریک بناتے ہوئے نئی راہیں دریافت کر لیتے ہیں اور اس طرح پرانے ڈھانچوں پر نئی تعمیر استوار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ دراصل اضطراب کا "سکن" ہونے اور "نہ ہونے" کے درمیان ہے۔ جانے والے زمانے کی یادیں آنے والے زمانے کا انتظار بھی تو شامل ہوتا ہے! اضطراب اس امر کا اعلان ہے کہ ایک دور ختم ہو گیا اور دوسرا دور جنم لینے والا ہے مضطرب انسان منتشر نہیں ہوتا مضطرب آدمی وجۂ اضطراب سے بہر حال باخبر ہے، جبکہ منتشر انسان وجہ انتشار سے بے خبر ہے۔

اضطراب ایک قوت ہے۔ تشخص کا ایک مقام ہے۔ پہچان کا ایک زاویہ ہے۔ شخصیت کا ایک پہلو ہے۔ مضطرب قومیں اپنے لیے نئے سورج تراش لینے میں اکثر کامیاب ہوتی ہیں۔ اضطراب ہی مجاز سے حقیقت کا راستہ دکھاتا ہے۔ انقباض سے نکل کر انبساط میں داخل ہونے کا اوّلیں سگنل اضطراب ہے۔ عہدِ رفتہ کے مرثیے اور عہدِ فردا کے قصیدے کے درمیان اضطراب گنگناتا ہے۔

اضطراب میں رہنے والے بڑے تخلیق کار ہوتے ہیں۔ اضطراب شب بیداری کا پیغام ہے اور کامیابی کا زینہ ہے۔ اضطراب سوز ہے اور یہی سوز جوہرِ تخلیق ہے۔

آج کی زندگی میں ایک گھٹن ہے۔ ایک حبس ہے۔ آج کی زندگی خود غرضی کی زندگی ہے۔ کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہیں۔ کسی کو کسی سے ہمدردی تو خیر دُور کی بات ہے، دلچسپی ہی نہیں۔ ظاہر کی رونقیں باطن کی وحشتوں سے خوفزدہ ہیں۔ ہر طرف انسانوں کی بھیڑ ہے اور اس بے پناہ ہجوم

میں کوئی انسان نظر نہیں آتا۔ بداعتمادی کے اس عہد میں ہر شخص مضطرب ہے، سرگرداں ہے، پریشان ہے، بے قرار ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ایک وبا پھیل چکی ہے: بے چینی کی وبا، بے بسی کی وبا، بے حسی کی وبا، بے کسی کی وبا، بے یقینی کی وبا، بے مروّتی کی وبا، بے حیائی اور بے وفائی کی وبا۔ ہر حسّاس آدمی کو معاشرتی انحطاط مضطرب کر رہا ہے۔

یہ دور بڑے کرب سے گزر رہا ہے۔ اذیت اور تنہائی انسان کی رُوح تک جا پہنچی ہے۔ انسان کو اندر سے گھُن لگ گیا ہے۔ چہروں کی نقلی مسکراہٹ ضبطِ غم کے سوا کچھ نہیں۔ آج کا اضطراب اس لیے ہے کہ زندگی کو تقویت دینے والے ادارے ختم ہوتے جا رہے ہیں، لیکن یہ اضطراب ایک نئے جہاں کے پیدا ہونے کی بشارت بھی رکھتا ہے۔ آج کا اضطراب کسی وقت کروٹ لے سکتا ہے اور ایک بار پھر وہی جذبے کارفرما ہو سکتے ہیں: جو آج سے چالیس سال پہلے ظاہر ہوئے تھے۔ اضطراب بے سبب نہیں ہوتا۔ اضطراب بھولا ہوا سبق، چھوڑی ہوئی منزل اور نظر انداز کیے ہوئے فرائض یاد دلاتا ہے اور اس طرح پیدا ہونے والا احساسِ غفلت بیداری کی اوّلین کرن ہے۔

جو لوگ دُنیاوی اشیاء اور ضروریات کے حصُول کے لیے مضطرب کہلاتے ہیں وہ دراصل مضطرب نہیں۔ وہ تکلیف میں ہوتے ہیں۔ اور تکلیف اور شے ہے اور اضطراب اور چیز۔ تکلیف کمی سے ہوتی ہے، اضطراب کوتاہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اضطراب روح کی بے تابی ہے اور تکلیف ذہن اور جسم کی پریشانی۔

جب انسان کا حق اس کی دسترس میں نہ ہو تو اضطراب پیدا ہوگا۔ جس زمانے میں انسان کو اپنی ضروریات کے حصول کے لیے دعا کے علاوہ کوئی چارہ میسّر نہ ہو وہ زمانہ اضطراب کا زمانہ ہے۔ آج کا عصری کرب انسان سے ذوقِ حیات بھی چھین رہا ہے۔ آج کے انسان کی ضروریات کے پاؤں اس کے وسائل کی چادر سے باہر ہیں۔ غریب کو امیر ہو جانے کی اُمید نے سہارا دیا ہوا ہے، لیکن امیر کو غریب ہونے کے ڈر نے مضطرب رکھا ہُوا ہے۔ دولت مند انسان کو دولت نے اضطراب سے نہیں بچایا۔ دولت اضطراب سے نہیں بچا سکتی۔ دولت کا پرستار ہمیشہ بے قرار رہے گا۔

بعض اوقات آنے والی ناگہانی آفات و بلیات بھی قبل از وقت اضطراب پیدا کرتی ہیں۔ زلزلے سے پہلے جانور اور پرندے مضطرب ہو جاتے ہیں۔ اندیشہ اضطراب کا ہم سفر ہے۔ ہمارے ہاں معمول کے حالات اتنے خوش کُن نہیں کہ اضطراب پیدا نہ ہو۔ لیکن یہ وہ اضطراب ہے جس کا حل ہمارے پاس نہیں۔ دشمنانِ اسلام متحد ہیں اور مسلمان متحد نہیں۔ دوستوں کی لاپرواہی دشمن کی اصل قوت ہے۔ ہم لوگ وحدتِ فکر اور وحدتِ کردار سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔

آج ہمیں بیک وقت اقبالؒ اور جناحؒ کی ضرورت ہے۔ آج کوئی جگانے والا چاہیے۔ کوئی چلانے والا چاہیے تاکہ شمع حریت ہر طوفان سے محفوظ رہے۔ آندھیاں اور آگہی کے چراغ برسرپیکار ہیں۔ آج قوم کو عہدِ کہن تازہ کرنے کی ضرورت ہے۔

صرف بزرگوں کی یاد منانے سے بزرگوں کا فیض نہیں ملتا۔ بزرگوں کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے سے بات بنتی ہے۔ ذکرِ بہار تو فصلِ بہار نہیں۔ آج کا اضطراب ترکِ عمل سے دور ہو گا، مسلسل عمل۔ دریا کا مقصد اگر وصالِ بحر ہے، تو یہ منزل صرف سمندر کے نام کا وظیفہ پڑھنے سے نہیں حاصل ہوتی۔ دریا کا اضطراب اس کی قوت ہے۔ اس کی روانی ہے۔ وہ اضطراب میں پہاڑوں کو کاٹتا ہے۔ میدانوں سے راستہ لیتا ہے اور ایک طویل جدوجہد کے بعد آغوشِ قلزم میں راحت و سکون حاصل کرتا ہے۔ اضطراب کو روانی بنانے والا دریا آسودۂ منزل ہوتا ہے۔ قوموں کا سفر دریا کے سفر کی طرح ہے موجوں اور قطروں کی ایک عظیم وحدت اپنی منزل کی طرف رواں دواں انجام کار بحرِ بے کنار سے ہم کنار ہوتی ہے۔

قوم کے افراد اگر وحدت کے تصوّر سے محروم ہو جائیں تو ان کا اضطراب انہیں مایوس کر کے ہلاک کر دیتا ہے۔ اگر وحدت قائم ہو جائے تو یہی اضطراب یم بہ یم منزلِ مقصود ہے۔

انفرادی اضطراب کو اجتماعی فکر میں ڈھالنے والا ہی قوم کا رہنما ہوتا ہے۔ میرِ کارواں وہی ہے جو افرادِ کارواں میں یکجہتی، یک سمتی، یک نظری پیدا کرے۔ قوم میں وحدتِ فکر پیدا ہو جائے، تو وحدتِ عمل منطقی نتیجہ ہے۔ یعنی اقبالؒ مل جائے تو جناحؒ کا ملنا لازمی ہے۔ آج کے اضطراب کو

چینل درکار ہے۔ اضطراب تلاشِ عمل کا نام ہے اور عمل علم کی وضاحتوں سے نجات کا نام ہے لیکن یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ اضطراب زیادہ دیر تک منتظر نہیں رہ سکتا۔ اسے بہرحال کچھ کرنا ہے، اچھا یا بُرا۔ اضطراب کو اُمید نہ میسّر ہوئی تو مایوسی اس کا نصیب۔

ٹمٹماتے ہوئے مضطرب چراغ اکٹھے کر دیے جائیں تو ایک عظیم چراغاں پیدا ہو سکتا ہے، ورنہ چراغوں کے بجھ جانے کا اندیشہ ہے۔

اضطراب کی وجہ کچھ بھی ہو، اس سے نجات کی صورت وحدتِ افکار و کردار ہے اور اس وحدت کا حصول ہی فضلِ الٰہی ہے اور اس کا طریقہ کار ذکرِ الٰہی ہے۔ ذکرِ الٰہی ہر اس عمل کو کہیں گے جس کا مدعا رضائے حق ہو۔ اپنی منشا کو منشائے ایزدی کے حوالے کر دینے سے ہی اضطراب دور ہو سکتا ہے۔ یہ بے عملی نہیں۔ یہ عظیم عمل ہے۔ انسانوں کا اتحاد رضائے الٰہی کے حصول کے لیے تاکہ یہ زندگی بھی بامراد ہو اور آنے والی زندگی بھی بانصیب۔



سفر زمین کا فرمان آسماں سے ملے
سکوں ملے بھی تو انسان کو کہاں سے ملے

○

کب رات کٹے کب ہو سحر کہہ نہیں سکتے
کب ہوگا دعاؤں میں اثر کہہ نہیں سکتے

سکونِ قلب

دولتِ تسکین دولتِ حسن کی طرح عطائے رحمانی ہے۔ اس کا کوئی فارمولا نہیں۔ سکونِ قلب، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، قلب کی ایک حالت ہے، ایسی حالت جس میں اضطراب نہ ہو۔ سکون کی ضد اضطراب ہے۔

اضطراب خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔ کسی چیز کو حاصل کرنے کی خواہش یا کسی شے سے نجات کی خواہش ہی باعثِ بے قراری ہے۔ خواہشِ دنیا ہو یا خواہشِ عقبیٰ، انسان کو ضرور بے چین کرے گی۔ یاد رہے کہ سکون کی خواہش بذاتِ خود ایک اضطراب ہے۔ سکون خواہش سے نہیں، نصیب سے ملتا ہے۔

جسے سکونِ قلب حاصل ہو جائے، اس کی زندگی میں نہ شکوہ رہتا ہے نہ تقاضا۔ وہ نہ خدا کا گلہ مخلوق کے سامنے کرتا ہے، نہ مخلوق کی شکایت خدا کے سامنے۔ وہ نہ زندگی سے غافل ہوتا ہے، نہ موت سے۔ وہ ہر حال میں راضی رہتا ہے۔ پُرسکون انسان مقامِ صبر کو بھی مقامِ شکر بنا دیتا ہے۔

آج کے دور میں سکونِ قلب اس لیے مشکل ہوتا جا رہا ہے کہ زندگی کے تقاضوں اور مذہب کے تقاضوں میں فرق آ گیا ہے۔ زمین کا مسافر سمجھ نہیں سکتا کہ آسمان سے احکام کیوں نازل ہوتے ہیں۔ زندگی کی مسرتوں میں عاقبت کا خوف سکون سے محروم کر دیتا ہے۔ آج کے انسان کی شخصیت میں انتشار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سکون نہیں ملتا۔

سکون کی خاطر سفر کرنے والا سکون حاصل نہیں کر سکتا۔ سفر میں سکون کہاں؟ سکون کی تلاش

اپنے حالات، اپنے ماحول اور اپنی زندگی سے بیزاری کا اعلان ہے۔

انسان جس حال میں بے سکون ہوا ہے، اسے اس حال میں سکون چاہیے لیکن وہ غلطی سے کسی اور حال میں سکون دریافت کرنا چاہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسے سکون نہیں ملتا۔ آج کا انسان سکون کی خاطر آسمانوں کے دروازے کھولنے چلا گیا ہے، لیکن اس سے دل کا دروازہ نہیں کھلتا۔ من کی چنتا دُور نہ ہو تو سکون نہیں مل سکتا۔

آج کا سب سے بڑا المیہ خود گریزی ہے اور سکون کے لیے خود شناسی اور خود آگہی درکار ہے۔ ایک دفعہ ایک آدمی جسے اپنے گھر میں سکون نہیں ملتا تھا، اپنی بیوی سے کہنے لگا "بیگم! میں چاہتا ہوں کہ سکونِ قلب کی خاطر مقدّس سفر اختیار کر دوں۔" بیوی سمجھ گئی کہ اس کا خاوند اس سے بیزار ہے۔ بولی "اتنے نیک سفر میں دیر کیا ہے۔ چلیے میں بھی اس نیکی کی تلاش میں آپ کے ہمراہ چلتی ہوں" خاوند نے کچھ دیر سوچا، بولا "چلو جانے دو۔ میرے نصیب میں سکون نہیں۔ میں اسی جہنم میں گزر اوقات کر لوں گا۔"

بات دراصل اتنی سی ہے کہ سکونِ قلب اپنے موجودہ حالات ہی میں مل سکتا ہے۔ جسے اپنے دیس میں سکون نہیں ملا، اسے پردیس میں کیا اطمینان حاصل ہوگا۔ جسے اپنے گھر میں راحت نہ ملی، اسے اور کون سے گھر میں فرحت ملے گی۔ سکونِ قلب اپنی زندگی ہے، اپنا اندازِ فکر ہے۔

جو انسان یہ سمجھتا ہے کہ اچھا زمانہ یا تو گزر گیا ہے یا ابھی آیا ہی نہیں، وہ کیسے سکون حاصل کر سکتا ہے۔ ایک دفعہ ایک جگہ کچھ دوست خوش بیٹھے تھے۔ ایک بے سکون انسان وہاں آیا، بولا "آپ کیوں خوش ہیں؟" انہوں نے کہا "کتنا اچھا موسم ہے۔" آنے والے نے آہ بھری، بولا "اچھے موسم کب تک بھائی!"

اگر خواہش اور حاصل کا فرق مٹ جائے، تو سکون مل جاتا ہے۔ انسان کو جو پسند ہے، حاصل کر لے یا پھر جو حاصل ہے اسے پسند کر لے تو سکون مل جاتا ہے۔ جب ہماری تمنا کے پاؤں حاصل کی چادر سے باہر نکل جاتے ہیں تو ہمیں سکون نہیں ملتا۔ سکون حاصل کرنے والے تختۂ دار پر بھی پُرسکون رہے اور مضطرب رہنے والے تختِ شاہی پر بھی سسکیاں بھرتے رہے۔ خواہش کا بے ہنگم پھیلاؤ سکون سے محروم کر دیتا ہے۔ خواہش کی داستان کبھی مکمل نہیں ہوتی۔ آغاز رہ گیا، کبھی انجام رہ گیا۔ اور اسی کش مکش

میں یہ چند مقدس ایام بھی ختم ہو جاتے ہیں۔

تمنا کا سفر دشتِ بے اماں کا سفر ہے۔ سکون کا سفر اپنی ذات کا سفر ہے۔ اپنے باطن کا سفر ہے۔ سکون کے مسافر گھر ہی میں منزلیں طے کرتے ہیں۔ سکون والا انسان اپنے دل میں ہی وہ روشن نقطہ دریافت کر لیتا ہے، جس کی ضیا اُسے نورِ بصیرت عطا کر کے سکون بخشتی ہے۔

جس انسان کی اپنے ماحول سے، اپنے آپ سے صُلح ہو وہ پُرسکون رہے گا۔ بُرائی کو نیکی سے رفع کرنے والا پُرسکون رہے گا۔ اپنے دل سے کدورت کے داغ صاف کرنے والا پُرسکون رہے گا۔ اپنی زندگی کو کسی کا احسان سمجھنے والا پُرسکون رہتا ہے۔

سکون حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ انسان سکون کے حصول کی تمنا چھوڑ کر دوسروں کو سکون پہنچانے کی کوشش کرے۔ سکون دینے والے کو ہی سکون ملتا ہے۔ کسی کا سکون برباد کرنے والا سکون سے محروم رہتا ہے۔ اگر فرض اور شوق یکجا ہو جائیں، تو زندگی پُرسکون ہو جاتی ہے۔

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ دولت سے سکون ملتا ہے لیکن دولت اور مال نے کبھی کسی کو سکون نہیں دیا۔ بادشاہوں نے بادشاہی چھوڑ کر درویشی تو قبول کی ہے لیکن کسی درویش نے درویشی چھوڑ کر بادشاہی قبول نہیں کی۔ مال جمع کرنے والے اور مال گننے والے پر عذاب ہے۔ وہ مال جو خدا کی راہ میں خرچ کیا جائے، باعث اطمینان ہو سکتا ہے۔

نفرت، کینہ، بغض، جذبۂ انتقام، حسد، لالچ، جسم پرستی سکونِ قلب کے دشمن ہیں۔ سکون والا انسان دوسروں کی زندگی اور خوشی کا احترام کرتا ہے۔ وہ علم حاصل کرتا ہے، جاہلوں کی خدمت کے لیے۔ دولت کماتا ہے، غریبوں کی مدد کے لیے۔ وہ گناہ سے نفرت کرتا ہے، گنہگاروں سے نہیں۔ وہ ان کی بخشش کی دعا کرتا ہے۔ خود جاگتا ہے اور سونے والوں کی سلامتی کی تمنا کرتا ہے وہ مرتبہ حاصل کرتا ہے، مظلوم اور محروم کی اعانت کے لیے۔ وہ اپنے گھر اور دل کے دروازے کسی پر بند نہیں کرتا۔ وہ اپنے مرتبے سے کسی کو ڈراتا نہیں۔ وہ مخلوق کو خالق کا عمل سمجھ کر اس کی

عزت کرتا ہے۔

سکون کا راہی ہر حال میں پُر سکون رہتا ہے۔ وہ خوف اور حزن سے آزاد ہے۔ وہ غم اور غصّے سے بے نیاز ہے۔ وہ حسرتوں اور مایوسیوں کو تیاگ چکا ہوتا ہے۔ دراصل سکونِ قلب تقربِ حق کا وہ مقام ہے، جہاں انسان نعمتوں سے مُنعم کی طرف رجوع کر کے اس کے ذکر میں محویت حاصل کرتا ہے۔ زندگی کے متلاطم سمندر میں سکونِ قلب ہی عافیت کا ایک جزیرہ ہے اور نصیب والے ہی اسے دریافت کرتے ہیں۔

سکونِ قلب اس وقت تک نہیں ملتا جب تک کوئی عطا کرنے والا نہ ملے۔ عطا کرنے والا ایک نگاہ سے دولتِ تسکین بخشتا ہے۔ اس کا ایک لفظ ہی دل کا قفل کھول کر اُسے سکون سے مالا مال کر دیتا ہے۔

والدین کی خدمت، استاد کا ادب، سائل اور یتیم کی دعا، سکونِ قلب کے ذرائع ہیں۔ یتیم کا مال کھانے والا ہزار یتیم خانے بنائے، سکون نہیں پائے گا۔ پیٹ میں آگ ہو تو دل میں سکون کہاں۔ رزق صالح نہ ہو تو سکونِ قلب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

امانت میں خیانت کرنے والا سکون نہیں پا سکتا۔ فطرت سے حاصل ہونے والی پہلی امانت معصومیت ہے۔ کسی کا اعتماد امانت ہے۔ منصف کا منصب امانت ہے۔ خیانت کرنے والا سکون نہ پائے گا۔ الفاظ امانت ہیں۔ ابہام پیدا کرنے والا مصنف سکون نہ پائے گا۔ کم وزن، معیار سے گری ہوئی اشیاء بیچنے والا اور زیادہ منافع کا کاروبار کرنے والا دنیا ہی میں عذاب سے دوچار ہوگا۔ اسے سکون نہیں ملے گا۔

دوسروں کا حق غصب کرنے والا زندگی بھر سکون نہ پا سکے گا۔ وہ سکون کے لیے بھاگے گا۔ اس کو مکافات کے بچھو اندر ہی اندر ڈسیں گے۔ وہ چلّائے گا۔ اس کی چیخ حلق سے باہر نہ نکل سکے گی۔ جس نے محسنوں سے وفا نہ کی، اس کو بھی سکون نہیں ملے گا۔ محسن کا حق ہے کہ اس کا شکر ادا کیا جائے اس کے ساتھ وفا کی جائے۔

ہمارے ملک میں اس شخص پر سکونِ قلب حرام ہے جس کو اسلام اور پاکستان سے محبت نہ ہو۔ اسی طرح اپنے اسلاف سے وابستہ رہنے سے سکون ملتا ہے، نہیں تو نہیں۔

آج اگر ہم ایک دوسرے کو معاف کر دیں اور ایک دوسرے سے معافی مانگ لیں تو ہمارا مستقبل سکونِ قلب کے خزانوں سے بھر جائے گا۔ کمزور پر رحم کرنا باعثِ تسکین ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر چڑیا مالک کے گھر میں پنجرے کے اندر بھوک سے مر جائے تو چڑیا کا بنانے والا آسمانوں سے قہر نازل کرتا ہے۔ اپنے سے کمتر کا خیال رکھنا سکونِ قلب کا ذریعہ ہے۔ سکونِ قلب مالک کا قرب ہے اور قربِ الٰہی کا واحد ذریعہ سجدۂ شکر ہے۔



میں ایک فرد ہوں مجھ سے ہے ملّتوں کا ظہور
حقیقتوں کو جنم دینے والا خواب ہوں میں
ورق ورق مری نظروں میں کائنات کا ہے
کہ دستِ غیب سے لکھی ہوئی کتاب ہوں میں
درِ عطا پہ ہوں میں آخری سوال ، مگر
اُسی سوال کا اک آخری جواب ہوں میں
کسی نظر میں علامت ہوں خود پسندی کی
کسی نگاہ میں اک ذرۂ تُراب ہوں میں

تضاد و اضداد

جس طرح یہ کائنات مجموعۂ اضداد ہے، اسی طرح ہماری زندگی بھی اضداد و تضاد کا مرقّع ہے۔

نور و ظلمات کے حسین امتزاج سے یہ کائنات جلوہ آرا ہے۔

دن اور رات کی تقسیم میں زمانے کا لامتناہی سفر جاری ہے۔ اسی میں بود و نابود کی عظیم کارفرمائیاں ہو رہی ہیں۔ وقت کا سلسلہ مستقبل اور ماضی سے قائم ہے۔ مستقبل کو ماضی بنانے والے زمانے کو حال کہتے ہیں۔ یہ حال موجود لمحے کا نام ہے۔ یہ لمحہ کئی صدیاں نگل چکا ہے اور اس نے ابھی کئی اور صدیوں کو نگلنا ہے۔

یہ کائنات ہمہ وقت تبدیل ہو رہی ہے، لیکن یہ کائنات کبھی بدلتی نہیں۔ یہی اس کا تضاد ہے اور یہی اس کا حسن ہے۔ رات کے دامن سے نورِ آفتاب نکلتا ہے اور شام اس سورج کو نقاب پہنانے چلی آتی ہے۔ ہر مقام بیک وقت مشرق بھی ہے اور مغرب بھی اور کوئی مقام نہ مشرق ہے نہ مغرب۔ اس تضاد میں کوئی تضاد نہیں۔

اسی طرح قوس اور خطِ مستقیم دو مختلف قسم کے خطوط ہیں، لیکن ایک حد سے پرے قوس اور خطِ مستقیم میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

تخلیق میں تضادات نفرت کے لیے نہیں، پہچان کے لیے پیدا فرمائے گئے ہیں۔ تضادات سے ہی افراد، احوال اور اشیاء کی پہچان ممکن ہے۔

خیر کو سمجھنے کے لیے شر اور شر کو جاننے کے لیے خیر کو تخلیق کیا گیا۔ ایک دوسرے کی ضد کے ساتھ ساتھ خیر اور شر کا اپنا الگ وجود موجود ہے۔ اگر خیر کا تصوّر نہ بھی ہو تو شر کسی اور نام سے

موجود رہے گا۔ دونوں کو تخلیق کرنے والی ایک ہی ذات ہے۔

اسی طرح ازل کو جاننے کے لیے ابد اور ابد کی پہچان کے لیے ازل کا علم ضروری ہے، لیکن ازل اور ابد الگ الگ وجود میں موجود ہیں۔ زندگی ازل ہے تو موت ابد۔ یہاں زندگی سے مُراد ابتدائے حیات ہے اور موت اس مقام کو کہیں گے جہاں تصورِ مرگ وحیات مرتا ہے۔ جس مقام کے بعد کوئی موت نہ ہو، وہی ابد ہے۔

تضادات کو جاننے کے لیے علم الاضداد کا جاننا ضروری ہے۔ یہ وسیع علم ہے۔ نفی اور اثبات' لا اور الا، عزت اور ذلت، ظلم اور رحم، ظاہر اور باطن، خارج اور داخل، روح اور مادہ، غم اور خوشی' زندگی اور موت' غرضیکہ ہر اسم اور صفت کے مقابل ایک اور اسم، ایک اور صفت موجود رہتی ہے' جس سے اس اسم اور اس صفت کی پہچان ممکن ہوتی ہے۔

لامحدود کی پہچان محدود سے ہے۔ انسان اپنے نفس کی پہچان کرے تو اسے رب کی پہچان اور اس کائنات کی پہچان ممکن ہو جاتی ہے۔

اپنی پہچان کے سفر میں تضادات سے آشنائی ہوتی ہے۔ ہنسنا اور رونا، جاگنا اور سونا، پانا اور کھونا، ہونا اور نہ ہونا ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہ تضادات تفسیرِ حیات کے حسین ابواب ہیں۔ استقامت ہو تو یہ تضادات ختم ہو جاتے ہیں۔

رنگوں کا تضاد بے رنگی میں ختم ہو جاتا ہے اور الفاظ و آواز کا تضاد سکوت میں قائم نہیں رہ سکتا۔ پہچان ہو جائے تو حاصل ومحرومی اور کامیابی وناکامی کا فرق مٹ جاتا ہے۔ کامیابیوں کی منزلیں طے کرنے والا ناکامی کے عبرت کدے میں دم توڑ سکتا ہے۔ ناکامی کی افتاد سے نکلتا ہوا انسان کامیابی کی چوٹی تک پہنچ سکتا ہے۔

غریب الوطنی میں مرنے والا اسکندرِ عظیم فاتح بھی تھا۔ ہکلانے والی زبان اللہ سے ہمکلام بھی ہو سکتی ہے۔ غریبی میں بادشاہی بھی ہو سکتی ہے اور بادشاہی میں فقیری بھی ممکن ہے۔ ایسا ہوتا رہا ہے۔

بغاوت کامیاب ہو جائے تو انقلاب کہلاتی ہے اور انقلاب ناکام ہو جائے تو بغاوت کہلاتا

ہے۔ بلند مقاصد کا سفر بھی تضادات سے مبرا نہیں ہوتا۔ ایک مقصد کی کامیابی دوسرے مقاصد کی ناکامی بھی ہے۔ ایک آرزو کو پُورا کرنے کے لیے کتنی آرزوؤں کا خون کرنا پڑتا ہے۔ اگر معیار بدل جائے تو حاصل اور محرومی میں فرق نہیں رہتا۔ فرعون کامیاب بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے پاس دولت بھی، لوگوں میں عزت تھی۔ صاحبِ امر بھی تھا۔ اس کا حکم نافذ بھی تھا اور موسیٰ گھر سے بے گھر، صحرا بہ صحرا، جُو بہ جُو پھرنے والے اللہ کے رسُول تھے۔ کون کامیاب تھا اور کون ناکام، اس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

یُوسفؑ کے لیے پیغمبری کا سفر کنوئیں میں گرنے سے شروع ہُوا۔ کتنی بلندی اور کتنی ابتلا۔ تضاد ہے، لیکن تضاد نہیں ہے۔

ہماری زندگی میں تضادات کا ہونا کوئی غیر فطری بات نہیں۔ تضادات کائنات میں ہیں بلکہ فاطرِ حقیقی کی صفاتِ عالیہ پر غور کیا جائے تو ہمیں ہمارے تضادات کچھ اجنبی نہیں محسوس ہوں گے۔

زندگی عطا فرمانے والا کچھ عرصہ کے بعد موت عطا فرماتا ہے۔ زندگی واپس لے لیتا ہے۔ وہ خود ہی کسی کو ملک عطا فرماتا ہے اور خود اسے معزول کر دیتا ہے۔ وہ عزت دیتا ہے وہی ذلت دیتا ہے۔ حساب کرنے پر آئے تو رائی کے دانے تک کا حساب کر لے۔ بخشش کرنے پر آئے تو سیّات کو حسنات میں بدل دے۔ محنتوں کو فاقے سے گزار دے اور چاہے تو کم محنت کرنے والوں کو بے حساب عطا فرما دے۔ وہ کبھی خزانے عطا فرماتا ہے اور کبھی وہ قرضِ حسنہ بھی مانگتا ہے۔ اس کے کام عجب ہیں۔

وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کے قبضۂ قدرت سے کسی شے کے باہر ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے باوجُود آدھی سے زیادہ دُنیا اس کو نہیں مانتی۔ اس کا دعویٰ ہے کہ ہر وجود کا رزق اس کے ذمہ ہے۔ لیکن ہمارا مشاہدہ اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا، جہاں ان تضادات میں کوئی تضاد نہیں رہتا۔

غور کرنے والی بات یہ ہے کہ اللہ نے اپنے مخالف، اپنے دشمن کو مارا نہیں۔ وہ قادر ہے۔

اس نے شیطان کو زندہ رکھا ہے۔ یہی سب سے بڑا تضاد ہے اور یہی اس کا حل۔

ہمیں تضادات سے جنگ نہیں کرنا۔ تضادات کو احسن طریقے سے حل کرنا ہے۔ ہمارا نظریہ اپنی جگہ پر درست، لیکن دوسروں کے نظریات ان کے لیے اتنے ہی مقدس و بامعنی ہیں۔ اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کا حق تو ہے۔ دوسروں کو قتل کرنے کا حق نہیں۔

اللہ نے اپنی زمین میں اپنے نہ ماننے والوں کو جس طرح برداشت فرمایا ہوا ہے، اسی طرح ہم بھی دوسروں کو ان کے عقائد کے اختلاف کے باوجود برداشت کیوں نہیں کرتے؟ زندگی میں مختلف نظریات کا ہونا زندگی کا حسن ہے۔ کسی انسان سے اس لیے نفرت نہیں کرنا چاہیے کہ اس کا لباس ہمارے لباس سے مختلف ہے۔

تضادات کو برداشت کرنے کے لیے عظیم دل چاہیے۔ کمزور عقیدہ الجھتا ہے، لڑتا ہے، جھگڑتا ہے۔ لیکن طاقتور اور صحت مند عقائد دوسرے عقیدوں کو اپنے ساتھ اس طرح ملاتے ہیں، جیسے سمندر دریاؤں کو اپنے اندر سمیٹتا ہے۔

ایک انداز کی صداقت دوسرے انداز کی صداقت کو غلط سمجھتی ہے، باطل سمجھتی ہے، حالانکہ سب سے بڑی صداقت یہ ہے کہ اس کائنات میں کچھ بھی باطل نہیں۔

ہمیں تحمل سے دوسرے کے نقطۂ نظر کو سننا چاہیے۔ اس کی خامی کی اصلاح کرنا چاہیے۔ اس سے محبت کرنا چاہیے۔ کوئی شخص بیمار ہو جائے تو اس سے نفرت نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طرح کسی کا عقیدہ بیمار ہو جائے، تو اس کے لیے زیادہ توجّہ اور رحم کی ضرورت ہے۔

عقائد و نظریات پر اتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ دنیا کا کسی ایک عقیدہ پر متفق ہونا مشکل ہے ایک گروہ نے ایک کتاب پڑھ لی ہے، دوسرے نے دوسری۔ یہی اختلاف کی وجہ ہے۔ کتابی علم کے علاوہ دیکھا جائے تو ہر انسان کے دل کی دھڑکن ایک جیسی ہے۔ سب کی آنکھوں میں ایک جیسے آنسو ہیں اور ہر انسان نے اس دنیا میں چند معدود ایّام گزارنے ہیں۔

جو انسان ہماری نگاہ میں خار بن کر کھٹکتا ہے، وہ بھی کسی کا منظورِ نظر ہے۔ عقیدتوں کا فرق

بھی مقدر کے فرق کی طرح انسان کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی الجھاؤ نہیں۔

یہ عقائد، بیان بلکہ حسنِ بیان کی باتیں ہیں۔ اصل عقیدہ ہمارا عمل ہے۔ دوسرے کا عمل اس کا عقیدہ ہے۔ فریقین میں محبت ہو، تو عقیدے کا اختلاف ختم ہو جاتا ہے۔ ڈوبنے والے سے اس کی مدد سے پہلے عقیدہ پوچھنا ظلم ہے۔

زندگی کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ زندگی وجودیت ہے، روحانیت ہے، جنسیت ہے، حسیت ہے، وحدت الوجود ہے، وحدت الشہود ہے، معاشی استحکام کا نام ہے، حقیقت ہے، خواب ہے، تقدیر ہے، تدبیر ہے، یہ عقیدہ ہے وہ عقیدہ ہے۔ یہ سب صحیح ہے۔ اس میں اُلجھاؤ نہیں؛ لیکن میری زندگی میرا ہی نام ہے، میرا عمل ہے، مجھ سے میرے بارے میں سوال ہوگا۔

سورج کا مذہب نہیں پُوچھا جاتا، اس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے۔ ہر انسان ہر دوسرے انسان کی ضرورت کا خیال رکھے، تو عقائد کا تضاد ختم ہو جاتا ہے۔

تضادِ تخلیق ہی حسنِ تخلیق ہے۔ تضادِ فکر حُسن ہے۔ تضادِ اعتقاد ہی زمین پر حُسنِ عقیدت ہے۔ شاہین اپنی بلند پروازی میں کوتاہی نہ کرے، اپنی بلند نگاہی کا لطف اُٹھائے، اسے گِدھ کی مُردار خوری سے کیا عناد؟ مور اپنے پروں کو پھیلا کر رقص کرے، اسے کوّوں سے کیا ضد؟

جو انسان اللہ کے جتنا قریب ہوگا، اتنا ہی انسانوں کے قریب ہوگا۔ اللہ سے محبّت کرنے والے ہر انسان سے محبت کرتے ہیں۔ جو ذات اللہ کے بہت ہی قریب ہے، وہی کائنات کے لیے رحمت ہے۔ پستیوں کی خدمت سے بلندی حاصل ہوتی ہے۔ تضادات کو خالق کے حوالے سے پہچانا جائے، تو تضادات میں کوئی الجھاؤ نہیں۔ یہ تضادات نفرت کے لیے نہیں، محبت اور پہچان کے لیے ہیں۔ خالق حق ہے۔ تخلیق اپنے ہمہ رنگ جلووں سمیت برحق ہے۔ مخلوق اپنے عقائد و نظریات کے تضادات کے باوجود عین حقیقت ہے۔ نجات، عمل اور حُسنِ سلوک میں ہے۔

○

خوشی اور غم

غم اور خوشی انسان کی اپنی کیفیات کے نام ہیں۔ یہ انسان کی اپنی وابستگی اور خواہش کے روپ ہیں۔ ایک انسان کا غم ضروری نہیں کہ دوسرے کا بھی غم ہو، بلکہ اس کے بالکل برعکس ایک کا غم دوسرے کی خوشی بن سکتا ہے۔ غم کے گیت میٹھے اور سریلے ہونے کی وجہ سے سننے والوں کو خوشی عطا کرتے ہیں۔ اندازِ نظر بدل جائے تو نظارہ بدل جاتا ہے۔ کل کا غم آج کی مسرت ہے اور آج کی خوشی نہ جانے کب آنسو بن کر بہہ جائے۔

انسان کا اپنا احساس واقعات کو غم اور خوشی سے تعبیر کرتا ہے۔ شبنم کے قطرے رات کے آنسو بھی ہیں اور صبح کی مسکراہٹ بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ غم اور خوشی ایک ہی شے کے نام ہیں۔ ہر خوشی، غم بنتی ہے۔ جتنی بڑی خوشی اتنا بڑا غم۔ غم آخر خوشی کے چھن جانے کا ہی تو نام ہے۔ جو شے زندگی میں خوشی بن کے داخل ہوتی ہے، وہ غم بن کے رخصت ہوتی ہے۔ وصال و فراق کی اصل داستانیں اصل میں غم اور خوشی کے قصے ہیں۔ وصال نہ ہو تو فراق بے معنی ہے۔ چونکہ خوشی سے مفر نہیں، اس لیے غم سے مفر نہیں۔ جس طرح ہستی سے مفر نہ ہو تو موت سے مفر نہیں۔ پیدا ہونے والا مرتا ضرور ہے۔ خوشی پیدا ہوتی ہے اور اس کی موت غم کا جنم ہے۔ ہمارے لیے ہماری وابستگیاں غم اور خوشی پیدا کرتی رہتی ہیں۔ اگر باپ نے بیٹے کا ماتم نہیں کیا تو بیٹا اپنے کاندھے پر باپ کا جنازہ اٹھاتا ہے۔

کون سی ہے آنکھ جو غم سے یہاں روتی نہیں
جانے والوں کی مگر رفتار کم ہوتی نہیں

انسان فانی اشیاء سے محبت کرتا ہے، ان کی تمنا کرتا ہے، انہیں جمع کرتا ہے اور فانی شے

ختم ہو جاتی ہے تو وہ غمزدہ ہو جاتا ہے۔ انسان خرمن جمع کرتا ہے، دانہ دانہ چن کے اور پھر ایک دن برقِ خرمن سے آشنا ہو جاتا ہے۔ خوشی بیٹی کی طرح گھر میں پلتی ہے اور جب جوان ہو جائے تو رخصت کر دی جاتی ہے۔ تمام مذاہب ایسے مقامات کی نشاندہی کراتے رہے ہیں، جہاں انسان کو خوف اور حزن نہیں ہوتا۔ دراصل یہ رُوح کا مقام ہے۔ ایسا مقام جہاں تعلق نصیب ہوتا ہے، بڑی رُوح سے کائناتی رُوح سے اور یہ تعلق فراق و وصال سے بے نیاز ہوتا ہے۔ قطرے کو سمندر سے تعلق ہو جائے تو وہ فنا اور بقا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اگر خواہش اور آرزو ہی نہ رہے تو غم اور خوشی کیا۔ حقیقی خوشی اور حقیقی غم ایک ہی سے ہیں۔ ہم جس کو یاد کر رہے ہیں، وہ تو ہمارے پاس ہے۔ جو دل میں پنہاں ہے، نظر سے اوجھل ہے، جس کی یاد بے قرار کر رہی ہے' وہی تو آنکھ سے آنسو بن کر ٹپک رہا ہے۔ یہ بڑے نصیب کی بات ہے، بڑی دُور کی منزل ہے۔ بڑا بلند مقام ہے کہ دن اور رات ایک ہی سورج کے روپ نظر آئیں۔ فراق اور وصال محبوب کی ادا ٹھہریں، اپنا اور غیر یکساں نظر آئے۔ کرّا اور مور ایک ہی جلوے کے پہلو نظر آئیں۔ غم اور خوشی ایک ہی شے کے نام ہو کر رہ جائیں۔ انسان روتے روتے ہنس پڑے اور ہنستے ہنستے رونا شروع کر دے۔ حاصل و محرومی سے بے نیاز ہو کر انسان معراجِ تعلق تک پہنچتا ہے اور تعلق کے حصول کے بعد ستم اور کرم دونوں ہی محبوب کی دلبری کے انداز ہیں۔

دنیا میں خوشی حاصل نہیں ہو سکتی، جب تک ہم دوسروں کو خوش نہ کریں۔ خوش کرنے والا ہی خوشی سے آشنا کرایا جاتا ہے۔ اور ہر خوش کرنے والا اور خوش رہنے والا تنہائیوں میں آنسوؤں سے دل بہلاتا ہے لذتِ ستم مل جائے تو اور کرم کیا ہے۔ آہِ سحر گاہی انعام ہے' اُن کے لیے جو بارگاہِ صمدیت میں مقرب ہوں۔ بے قرار روحیں سرشار ہوتی ہیں بلکہ زمانوں کو سرشار کرتی ہیں۔ روہی میں رونے والا فریدؔ آخر پکار اُٹھتا ہے۔ (دنیا والو! جس کو تلاش کر رہے ہو وہ ہمہ وقت میرے پاس ہے۔

خلقت کوں جیندی گول اے

ہر دم فرید دے کول اے

کسی انسان کے غم کا اندازہ اس کے ظرف سے لگایا جاتا ہے۔ کم ظرف آدمی دوسروں کو خوش دیکھ کر ہی غم زدہ ہو جاتا ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ لوگ خوش رہیں۔ وہ ان کی خوشیوں کو برباد کرنے پر تُل جاتا ہے۔ اس کی خوشی یہ ہے کہ لوگ خوشی سے محروم ہو جائیں۔ وہ اپنے لیے جنّت کو وقف سمجھتا ہے اور دوسروں کو دوزخ سے ڈراتا ہے۔ ایک بخیل انسان نہ خوش رہ سکتا ہے، نہ خوش کر سکتا ہے۔ سخی سدا بہار رہتا ہے۔ سخی ضروری نہیں کہ امیر ہی ہو۔ ایک غریب آدمی بھی سخی ہو سکتا ہے، اگر وہ دوسروں کے مال کی تمنا چھوڑ دے۔ اسی طرح جن لوگوں کا ایمان ہے کہ اللہ کا رحم اس کے غضب سے وسیع ہے، وہ کبھی مغموم نہیں ہوتے۔ وہ جانتے ہیں کہ غربت کدے میں پلنے والا غم اس کے فضل سے ایک دن چراغِ مسرت بن کر دلوں کے اندھیرے دُور کر سکتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ پیغمبر بھی تکالیف سے گزارے گئے لیکن پیغمبر کا غم اُمّت کی فلاح کے لیے ہے۔ غم سزا نہیں۔ غم انعام بھی ہے۔ یوسفؑ کنویں میں گرائے گئے، ان پر الزام لگا، انہیں قید خانے سے گزرنا پڑا لیکن ان کے تقرب اور ان کے حسن میں کمی نہ آئی۔ ان کا بیان احسن القصص ہے۔ دراصل قریب کر دینے والا غم دُور کر دینے والی خوشیوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ منزل نصیب ہو جائے تو سفر کی صعوبتیں کامیابی کا حصّہ کہلائیں گی اور اگر انجام محرومیٔ منزل ہے تو راستے کے جشن ناعاقبت اندیشی کے سوا کیا ہو سکتے ہیں۔ انسان اگر باشعور ہو جائے تو وہ پہچان لیتا ہے کہ ایک غم اور دوسرے غم میں کوئی فرق نہیں۔ کل کے آنسو اور آج کے آنسو ایک جیسے ہیں۔ باشعور انسان غور کرتا ہے کہ کوئی خوشی، زندگی کے چراغ کو فنا کی آندھی سے نہیں بچا سکتی۔ زندگی کا انجام اگر موت ہی ہے تو غم کیا اور خوشی کیا۔ کچھ لوگ غصّے کو غم سمجھتے ہیں۔ وہ زندگی بھر ناراض رہتے ہیں، کبھی دوسروں پر کبھی اپنے آپ پر۔ انہیں ماضی کا غم ہوتا ہے۔ حال کا غم ہوتا ہے اور مستقبل کی تاریکیوں کا غم۔ یہ غم آشنا لوگ دراصل کم آشنا ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ گزرے ہوئے زمانے کا غم دل میں رکھنے والا کبھی آنے والی خوشی کا استقبال کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ ان کا غم امربیل کی طرح ان کی زندگی کو ویران کر دیتا ہے۔ یہ غم غم نہیں، یہ غصّہ ہے یا نفرت ہے۔ غم تو دعوتِ مژگاں ساتھ لاتا ہے اور چشمِ نم آلودہ ہی

چشم بینا بنائی جاتی ہے۔ غم کمزور فطرتوں کا راکب ہے اور طاقتور انسان کا مرکب۔

یہاں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کچھ لوگ افسوس اور حسرت کو غم سمجھتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے افسوس کوتاہیٔ عمل کا نام ہے، غلط روی کے احساس کا نام ہے۔ افسوس سے نکلنے کا راستہ "توبہ اور معافی" کا راستہ ہے۔ حسرت، ناتمام آرزو کا نام ہے۔ یہ ایک الگ مقام ہے۔ آرزو اور استعداد کے فرق سے حسرت پیدا ہوتی ہے۔ آرزو جب استعداد سے بڑھ جائے، تو حسرت شروع ہو جاتی ہے۔ باعلم انسان حسرت سے محفوظ رہتے ہیں۔ انسان اپنی پسند کو حاصل کر لے یا اپنے حاصل کو پسند کر لے، تو حسرت نہیں رہتی۔

بہتر انسان وہی ہے جو دوسروں کے غم میں شامل ہو کر اسے کم کرے اور دوسروں کی خوشی میں شریک ہو کر اس میں اضافہ کرے۔ اپنی صلاحیتوں کو محروم لوگوں کی خدمت کے لیے وقف کرنے والا غم سے نڈھال نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ غم شخصیت ساز ہے اور غم اسی کی عطا ہے جس نے خوشی دی تھی، تو انسان کی زندگی آسان سی ہو جاتی ہے۔ اندیشوں کو بھی غم نہیں کہنا چاہیے۔ اندیشہ آنے والے زمانے سے ہوتا ہے۔ اگر حال پر نگاہ رکھی جائے تو مستقبل کے اندیشے کم ہو جاتے ہیں۔ اندیشہ ایک "نا سمجھی" کا نام ہے۔ اندیشہ امید سے ٹلتا ہے۔ امید، رحمت پر ایمان سے حاصل ہوتی ہے اور رحمت خالق کا عمل ہے، بلکہ خالق کا دعویٰ ہے کہ اس کی رحمت اس کے غضب سے وسیع ہے۔ وہ خالق جو اپنے محبوب کو رحمۃ اللعالمین صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم بنا کر بھیجتا ہے، مخلوق پر غضب نہیں کرتا۔ لہٰذا ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ خالق کی طرف سے مخلوق پر ظلم کا اندیشہ محض وسوسہ ہے۔ خالق نے ہدایت بھیجی، پیغمبر بھیجے، سلامتی کے پیغامات بھیجے، رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائیں، مبارک صحیفے اور مقدس کتابیں نازل فرمائیں اور سب سے بڑی بات اپنی رحمتوں کو رحمتِ عالم کی ذات میں مجتمع فرما کر مخلوق کے لیے آسرا بنا کر بھیجا۔ سرکش و باغی انسان ہی اندیشوں میں مبتلا ہو کر غمزدہ و افسردہ رہتا ہے۔ جو لوگ اپنے نفس کے شر اور ظلم سے بچ گئے، وہ غم سے بچ گئے۔ ان کے لیے بشارت ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے

شاداب و سرسبز جنت کی۔ اندیشہ دوری ہے اور امید خواہش تقرب ہے۔ جس انسان نے استقامت اختیار کی، حقیقت کی راہ میں وہ مایوس نہیں کیا جاتا۔

سوچنا چاہیے کہ انسان اس زندگی میں نہ کچھ کھوتا ہے، نہ پاتا ہے۔ وہ تو صرف آتا ہے اور جاتا ہے۔ کیا حاصل اور کیا محرومی۔ کسی کا چہرہ کسی کی زندگی میں خوشی پیدا کر جاتا ہے اور کسی کی زندگی میں غم دے جاتا ہے۔ یہ سب قدرت کے کھیل ہیں۔

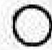
لوگ حالات اور ترقی سے خوشی حاصل کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ خوشی کا تعلق حالات سے نہیں۔ خوشی ایک حالت کا نام ہے، اپنی حالت، اپنا احساس، اپنا اندازِ فکر۔ احساس کی اصلاح ہو جائے تو غم اور خوشی کی بحث ختم ہو جاتی ہے۔ دلبر، دل کے پاس نظروں کے سامنے ہو تو تختۂ دار جنت سے کم نہیں۔ دلبر دُور ہو تو جنت بھی جہنم۔ دلبر کی یاد سرمایہ ہے اور اس کے کوچہ کی گدائی بھی تاجِ شاہی سے کم نہیں۔ تو حاصل یہ ہُوا کہ غم اور خوشی اپنے اندازِ فکر کے نام ہیں۔ نیکی کے راستے میں محرومی بھی خوشی کا باعث ہے اور گناہ کا حاصل ہو جانا بھی غم کا باعث ہے۔ دن کو لٹنے والا اگر رات کو آرام سے سو جائے تو راہزن کے لیے دعا کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے۔ اگر زندگی کسی اور کی خوشنودی کا باعث ہو جائے تو غم نہیں ہوگا۔ اگر خود غرضی مقصدِ حیات ہو، تو کبھی خوشی نصیب نہ ہوگی۔ خوشی اور غم موسموں کی طرح آتے جاتے رہتے ہیں۔

غم خوشی بن کر زندگی میں داخل ہوتا ہے اور خوشی غم بن کر زندگی سے نکل جاتی ہے اور پھر محروم زندگی آشنائے لذت و کیف کرا دی جاتی ہے۔ اسی طرح جیسے خزاں زدہ باغ ایک دن سرسبز و شاداب کر دیا جاتا ہے۔ بہار دو خزاؤں کے درمیانی وقفہ کا نام ہے اور خزاں دو بہاروں کے درمیانی زمانے کا۔ ایک دفعہ ایک انسان اپنے کسی عزیز کی موت پر رو رہا تھا۔ لوگوں نے کہا روتے کیوں ہو۔ اب آنسوؤں کا کیا فائدہ۔" اس نے جواب دیا "روتا اسی بات پر ہی ہوں کہ اب رونے کا فائدہ ہی نہیں"۔ جو شے رونے سے واپس نہیں ہو سکتی اس پر رونا آگیا۔ اور رونا ہوتا ہی اسی شے پر ہے جو رونے سے بھی واپس نہ آئے۔

خوشی کا تعاقب کرنے والا خوشی نہیں پا سکتا۔ یہ عطا ہے مالک کی جو اس کی یاد اور اس کی مقرر کی ہوئی تقدیر پر راضی رہنے سے ملتی ہے۔ کپل دستو کا راجہ خوشی حاصل نہ کر سکا۔ لیکن "گیان" کا گیانی خوشی سے سرشار ہو کر لوگوں کو خوشی کی منزل دکھاتا رہا۔ اسلام نے استقامت کو ذریعہ مسرت کہا ہے اور بجا کہا ہے۔ مستقل مزاج انسان غم اور خوشی کے حجابات سے نکلتا ہوا حقیقت کے نور تک پہنچ جاتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں نہ غم ہے نہ خوشی۔ بس ایک سرشاری ہے، ایک ایسی حالت کہ جہاں نہ دولت کی خواہش ہوتی ہے نہ وجود کی تسکین کی آرزو۔ یہاں انسان بارگاہِ حسن میں محوِ نظارہ ہوتا ہے۔ نہ حاصل نہ محرومی، نہ غم نہ خوشی، نہ آرزو نہ شکستِ آرزو۔ یہ بڑی خوش نصیبی ہے۔ اپنے نصیب پر خوش رہنا چاہیے۔ اپنی کوششوں پر راضی رہنا چاہیے اور کوششوں کے انجام پر بھی راضی رہنا چاہیے۔ دوسرے انسانوں کے نصیب سے مقابلہ نہیں کرنا چاہیے۔

جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔

اللہ ہمیں حقیقی خوشیاں عطا فرمائے اور حقیقی غم سے بھی آشنا کرے۔ ابدی غم اور ابدی خوشی ازلی نصیب ہے۔



جو شے چلنے سے حاصل نہیں ہوتی، وہ ٹھہرنے سے حاصل ہو جاتی ہے۔ جو واز پیسے جمع کرنے میں نہ پایا جائے، وہ خرچ کرنے میں ضرور پایا جائے گا۔ جسے سونے والا دریافت نہ کر سکے، اسے جاگنے والا ضرور دریافت کرے گا۔

مَیں اور مَیں

مَیں نے آئینے میں دیکھا، میرا عکس تھا، ہُو بہُو مجھ جیسا۔ مَیں اس میں محو ہو گیا۔ اس کی حرکات و سکنات میرے جیسی تھیں۔ مَیں آگے بڑھتا گیا، وہ آگے بڑھتا گیا۔ مَیں پیچھے ہٹا، وہ پیچھے ہٹ گیا۔ مَیں چھُپ گیا، وہ چھُپ گیا۔ یہ عجیب کھیل تھا۔ مَیں سوچتا کہ اصل "مَیں" کون ہے۔ آئینے کے اندر یا باہر۔ ایک اصل ہے، دوسرا عکس ہے اور اصل عکس کا عکس ہے۔ یہ سوچ بڑی اذیّت ناک تھی۔ مَیں اس سے ہمکلام ہُوا، وہ خاموش تھا۔ مجھے عجیب محسوس ہُوا۔ عکس اصل سے مختلف معلوم ہُوا۔ وہ ہمیشہ خاموش رہا اور مَیں ہمیشہ بولتا رہا۔

ایک دن مَیں نے اس سے پُوچھا "تم بولتے کیوں نہیں؟" وہ مسکرایا اور چُپ رہا۔ کمرے میں سناٹا تھا۔ مَیں نے پھر سوال کیا "تم بولتے کیوں نہیں؟" اس نے کہا "مَیں بولوں گا تو تم برداشت نہ کر سکو گے"۔ بس اتنا سن کر ہیبت طاری ہو گئی۔ کپکپی طاری ہو گئی اور پھر معلوم نہیں کیا ہُوا۔ نہ معلوم مَیں آئینے میں سما گیا یا وہ آئینے سے باہر نکل آیا۔ بہر حال برداشت سے باہر تھا جو ہُوا سو ہُوا۔

اس دن سے آئینہ ٹوٹ گیا۔ آئینے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ اور مَیں ساتھ ساتھ تھے۔ اس دن سے مجھے ہر شے بدلی بدلی نظر آنے لگی۔ مشرق سے نکل کر مغرب میں ڈوبنے والا سورج یوں معلوم ہوا کہ یہ نہ کہیں سے نکلتا ہے، نہ ڈوبتا ہے۔ ہر مقام بیک وقت مشرق بھی ہے اور مغرب بھی اور ان مشارق و مغارب سے ماورا ایک کائنات ہے، جہاں نہ دن ہے نہ رات، نہ ہونا ہے اور نہ نہ ہونا۔

اس دن سے مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں ایک طویل ماضی کی انتہا ہوں اور ایک طویل مستقبل کی ابتدا بھی میں ہی ہوں۔ میرے کندھوں پر ماضی اور مستقبل کا بوجھ ہے۔

مجھے محسوس ہُوا کہ میں ہر انسان کا حصّہ ہوں اور ہر انسان میرا حصّہ۔ میں ہر وجود میں موجود ہوں اور ہر وجود مجھ میں موجود ہے۔ دنیا میں ہونے والے ہر جرم کی ذمّہ داری مجھ پر ہے اور نیکی کا بھرم میرے ہی دَم سے ہے۔

میری سوچ بھی عجیب ہو گئی۔ مَیں کبھی رات کو آفتاب دیکھتا ہوں اور کبھی دن کو تارے نظر آتے ہیں۔ خوابوں میں جاگتا ہوں اور بیداری میں خواب دیکھتا ہوں۔

مَیں خود ہی آخری سوال ہوں اور خود ہی اس کا آخری جواب۔ میرے لیے ہر حاصل محرومی ہے اور ہر محرومی حاصل۔ اب میں جانتا ہوں کہ خوشی غم دینے کے لیے آتی ہے اور غم خوشی کا پیش خیمہ ہے۔

مَیں اس بڑھیا کے بارے میں بہت سوچتا ہوں جس نے ساری عمر سوت کاتا اور آخر کو اُسے اُلجھا دیا۔ مَیں ان محنتوں پر روتا ہوں جو رائیگاں کر دی گئیں۔ میں اس عابد کے بارے میں بھی متفکر ہوں، جس کو عبادت کے زعم نے محرومیاں عطا کیں۔ مَیں جانتا ہوں کہ مَیں کچھ نہیں جانتا لیکن مغرور عالم کی عاقبت پر مجھے افسوس ہے۔ مَیں ان کی حماقت پر حیران ہوں جن کے سر پر کتابوں کا گٹھا ہے اور جن کے دماغ اور دل خالی ہیں۔

مَیں سوچتا ہوں کہ پہاڑوں کے دامن میں مٹی کس طرح آئی اور یہ کہ دریا رواں کیوں ہیں۔ سمندر ساکن کیوں ہے۔ آنکھ بنانے والا کتنا بصیر ہو گا اور کان بنانے والا کس طرح کی سماعت رکھتا ہوگا۔ مَیں تحیّر میں ہوں کہ کسی درخت کا کوئی پتّا کسی پتّے سے نہیں ملتا۔ ہاتھی کو پیدا فرمانے والا چیونٹی کو کس طرح تخلیق کرتا ہے۔

مَیں اپنے دوسرے مَیں سے نجات چاہتا ہوں لیکن اس کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی ہے وہ مجھے عجیب داستانیں سناتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کائنات ایک راز ہے۔ گہرا راز۔ رنگ آواز پیدا کرتے ہیں اور آواز کا رنگ ہوتا ہے۔

عجیب کش مکش کا عالم ہے۔ سوچتا ہوں تو خیالات تھک جاتے ہیں۔ انسان دنیا میں

کیوں آتا ہے اور اگر آیا ہے تو جاتا کیوں ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ لامکاں میں رہنے والا ہر مکان میں موجود کیسے ہے۔ اگر موجود ہے تو لامکاں کیا ہے؟

میں غور کرتا ہوں کہ اگر میں آزاد ہوں، تو مجبور کون ہے۔ میرا آنا اور جانا میرے بس میں نہیں تو میرا ہونا کس کام کا؟ میں حصارِ وقت کو توڑ سکتا ہوں، لیکن میرے گرد آرزوؤں کے پہرے ہیں۔ میری خواہشات مجھے جکڑ رہی ہیں۔ میں اپنی ملکیت کی ملکیت بن چکا ہوں۔ میں جسے چھوڑ نہیں سکتا، اسے میں نے حاصل کیوں کیا ہے اور میں جسے حاصل نہیں کر سکتا، اس کا خیال چھوڑتا کیوں نہیں ہوں۔

عجیب مخمصے کا عالم ہے۔ کل تک میں تاریخ ساز تھا، آج میں تاریخ کا طالب علم ہوں۔ میری تاریخ جمود کا شکار کیوں ہے، اس کے کچھ اوراق پھٹ گئے ہیں۔ اُن پر کیا لکھا ہوا تھا، اب مجھے کون بتائے گا۔

میں سوچتا ہوں کہ وحدتِ ملت اور تفریقِ ملت میں کیا فرق ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ دولت کی محبت انسان کو بے حس کیوں کر دیتی ہے۔ میرا بھائی جس کارخانے میں ملازم ہے، میں اس کا مالک ہوں، پھر بھی میں اس کا بھائی ہوں۔ اس کو چیتھڑوں میں دیکھ کر میرا قیمتی لباس جھلس کیوں نہیں جاتا۔ میں بے بس ہوں، مجبور ہوں کہ میں اعلیٰ قسم کے کھانے کھاؤں اور بھائی اپنے کمزور نصیب پر صبر کرے۔

میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ وہ لوگ کہاں ہیں، کرامات کا دعویٰ کرنے والے۔ میرے گرد و پیش کیا ہو چکا ہے، کیا ہو رہا ہے۔ مجھے اپنے بارے میں فکر کیوں نہیں۔ دروازے بند کر لینے سے طوفان تھم تو نہیں جاتے۔ حقائق کو دیکھ کر تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ایک طرف مہمانوں کی یلغار ہے۔ دوسری طرف گھر میں بھی وحدتِ فکر کم ہے، کیا بنے گا۔ گھر والوں کو ایک خیال میں اکٹھا کرنا ضروری ہے۔ بدنصیب لوگ ملک کو بدنصیب سمجھ رہے ہیں، خوش نصیب اسے خوش نصیب کیوں نہیں بناتے؟

میری دعا بھی بدل گئی ہے۔ مَیں دعا کرتا ہوں' اے اللہ! مریضوں کو ظالم ڈاکٹروں کے عذاب سے بچا، شریعت کو عُلمائے سُوء سے بچا، طریقت کو خرقۂ سالوس کی دسترس سے بچا۔ میرے اللہ! ہمیں ہمارے اعمال اور خیال کی عبرت سے بچا۔

مَیں یہ دعا نہیں کرتا کہ دشمن مرجائے۔ مَیں کہتا ہوں کہ دوست زندہ ہوجائیں۔ جذبے بیدار ہوجائیں۔ عزم پیدا ہوجائے۔ وحدتِ افکار و کردار حاصل ہوجائے۔ اس قوم میں یقین کی دولت عام ہوجائے۔ میرے اللہ! ہمیں ہمارے وسوسوں سے بچا۔ ہمارے اندیشوں کا منہ کالا کر۔ ہمیں اپنے دعووں کی عظمت سے متعارف کرا۔ میرے مولا! تاریخ کی رُسوائی سے بچا۔ ہمیں معانی کا راستہ دکھا۔

میرے مولا! اس ملک کے نوجوان طالب علموں کو اس ملک کی صحیح خدمت کرنے کی توفیق عطا فرما۔ مَیں خواب دیکھنے کا قائل نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ خواب دیکھنا یا خواب دیکھنے کے خواب دیکھنا درحقیقت' حقیقت کو نہ دیکھ سکنے کے اضطراب کا نتیجہ ہے۔ خواب اس وقت تک حقیقت نظر آتا ہے جب تک ختم نہ ہو۔ خواب میں خواب کو خواب سمجھنا اتنا ہی مشکل ہے' جتنا اپنے آپ میں ڈوب جانا۔

خواب جھوٹا ہو تو عذاب ہے، مصیبت ہے اور اگر خواب سچّا ہو تو بھی تعبیر کا انتظار بےقرار رکھتا ہے۔ ایسا خواب بھی کیا دیکھنا، جس کی تعبیر سمجھ میں نہ آئے۔ خواب کی اونچی اڑان زندگی کے تنگ ہونے والے دائرے کو توڑ نہیں سکتی۔

بہرحال مَیں خواب کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ یہ زندگی ایک خوابِ گراں ہے۔ ہم سب نیند کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جب آنکھ بند ہوگی تو آنکھ کھلے گی۔ مَیں بہت کم خواب دیکھتا ہوں۔ وہ مجھے سونے ہی نہیں دیتا۔ ہاں البتہ ایک دفعہ میں نے خواب دیکھا مَیں قائدِ اعظمؒ سے ملاقات کے لیے جارہا ہوں۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ مَیں بہت سے سوالات کو جوابات کے حوالے سے پہچانتا ہوں۔ لیکن اگر قائدِ اعظمؒ نے مجھ سے کوئی سوال پوچھ لیا تو شاید میرے پاس کوئی جواب نہ ہوگا۔

ئی ملاقات کیے بغیر واپس لوٹ آتا ہوں۔ بڑا نادم ہوتا ہوں کہ میرا علم ناقص تو نہیں؟

میں عجیب تکلیف میں ہوں۔ اس کا شاید علاج نہیں ہو سکتا۔ میں فکر کی وادیوں میں سرگرداں ہوں۔ مجھے اس عمل کی تلاش ہے، جو مجھے میرے فکر سے نجات دلائے۔ لیکن یہ سوچ کر کہ اب میرا فکر ہی میرا عمل ہے، میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ اپنی تلاش ترک کر دیتا ہوں۔ مجھے مستقبل پر اعتماد ہے۔ مجھے اس کی رحمت پر یقین ہے۔ میرے عمل کی کوتاہی مجھے اس کے فضل سے محروم نہیں کر سکتی۔ اس کی عطا میری خطا سے بہت وسیع ہے۔ میرے ملک کی عزت اس کے نام کی عزت سے وابستہ ہے۔ اس لیے مجھے مایوسی نہیں ہو سکتی۔ ملک عطا کرنے والا اس کی بقا کا انتظام فرمائے گا۔ مجھے ہر انسان دکھی نظر آتا ہے اور ہر انسان دکھ کا باعث بھی اور دکھ کا مداوا بھی۔ ہر بیماری اپنے قریب ہی اپنا علاج رکھتی ہے۔

اب میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے اس ساتھی سے نجات حاصل کرنی چاہیے۔ جس نے میری سوچ کو پراگندہ کر دیا ہے۔ مجھے دوسروں سے مختلف خیال کا کیا حق ہے۔ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں ٹھیک ہی ہوگا۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ میں تو اپنے بارے میں ہی سوچتا ہوں۔ مجھے بھی غافل ہونے کا حق ہے۔ یہ حق مجھے ملنا چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ آئینے والے "میں" کو واپس بھیج دوں، لیکن کیسے؟ آئینہ تو ٹوٹ چکا ہے!!



تقربِ الٰہی کے مختلف ذرائع اپنی اپنی جگہ پر مستند و معتبر ہیں، لیکن تقربِ الٰہی کا آسان ترین راستہ کسی کے فیضِ نظر سے ملتا ہے۔

آرزو

انسان جب تک زندہ ہے، بے آرزو نہیں ہو سکتا۔ شاید آرزو ہی زندگی ہے۔ ہر انسان صاحب آرزو ہے۔ ہر دل آرزو پیدا کرتا ہے۔ آرزو نہ ہو تو زندگی بے معنی سی ہو کر رہ جائے۔

آرزوئیں انسان کو بے بس کر دیتی ہیں۔ انسان انہی آرزوؤں کے حصار میں اس طرح جکڑا جاتا ہے جیسے شہد میں مکھی۔ اور پھر انسان ڈوبتا ہی جاتا ہے۔ ایک آرزو کا تعاقب ہمیں دوسری آرزو سے متعارف کراتا ہے اور اس طرح سلسلہ در سلسلہ زنجیر بنتی چلی جاتی ہے اور اس سے نجات کی راہ ممکن ہی نہیں۔

ہماری زندگی کی اکثر وابستگیاں آرزو کے دم سے ہیں۔ محبت آرزوئے قربِ محبوب کا نام ہے۔ نفرت آرزوئے فنائے عدو ہے۔ حصولِ زر آرزوئے آسائش ہے۔ اسی طرح عبادت آرزوئے تقربِ حق ہے۔ غرضیکہ ہر عمل کے ساتھ آرزو کا وابستہ ہونا لازمی ہے۔ یہ آرزو عمل مجبوری ہے، لاچاری ہے، بلکہ بیماری ہے۔

آرزو مر جائے تو اس کی لاش سے نئی آرزو پیدا ہوتی ہے۔ یہ وہ قُقنس ہے جو جلتا ہے اور اپنی راکھ سے نئے ققنس کو جنم دیتا ہے۔ آرزو تلاش پیدا کرتی ہے اور تلاش سفر پیدا کرتی ہے۔ سفر انسان کے لیے نئے نئے مسائل پیدا کرتا ہے اور ان مسائل کے حل کے لیے نئی تلاش شروع ہو جاتی ہے اور اس طرح چلتے چلتے راستہ بدل جاتا ہے اور انسان حیران و پریشان سوچتا ہے کہ اس نے جو چاہا تھا، وہ یوں تو نہ تھا۔ وہ غور کرتا ہے کہ اس نے جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر کا سفر ایک نیا خواب بن کر سامنے آیا ہے، جو اپنے لیے کسی نئی تعبیر کا انتظار کرے گا۔ نیا خواب پُرانے

خواب سے مختلف ہوتا ہے اور نئی تعبیر اتنی ہی دُور ہوتی ہے، جتنی پہلے خواب کی۔ آرزوؤں کے سلسلے در سلسلے اتنے پیچیدہ ہیں کہ ان سے نکلنا یا ان کو سمجھنا دشوار ہے۔

ہماری اکثر آرزوئیں ضرورت کی آرزوئیں ہیں۔ مثلاً خوراک، مکان، لباس۔ ہر آدمی خوراک کا محتاج ہے۔ خوراک صرف روٹی کا نام نہیں جس سے ہم پیٹ بھرتے ہیں۔ خوراک نگاہ کے لیے نظارے کی تمنا بھی ہے۔ آنکھ کی خوراک حسین منظر ہے۔ ذہن کی خوراک حُسنِ خیال ہے۔ دل کی خوراک پرِ جمال ہے۔ رُوح کی خوراک ذوقِ خود آگہی کے ساتھ ساتھ لطافتِ احساسِ حقیقت ہے۔ ہر اشتہا خوراک کی تلاش پر مجبور کرتی ہے۔ ہم جس کیفیت میں ہوتے ہیں ویسی ہی خوراک کی ضرورت ہوتی ہے اور اس ضرورت کو پُورا کرنے کے لیے انسان سرگرداں ہوتا ہے۔ یہ آرزو ہماری سرشت میں ہے فطرت میں ہے۔ جب بہشت میں ضرورت شجرِ ممنوعہ ہو، اس بہشت سے انسان جلد ہی نکل جانا پسند کرتا ہے۔ انسان بہشت چھوڑ دیتا ہے، لیکن آرزو نہیں چھوڑتا۔ آرزوؤں پر پہرہ، جبر، قدغن ممکن ہی نہیں کوئی کسی کی خوراک کی ضرورت پُوری کیے بغیر اس سے خوراک کی آرزو چھین نہیں سکتا۔ خوراک کی ضرورت کو پُورا کرنے کے لیے انسان کو بڑی بڑی صفات عطا کی گئیں۔ انسان صبح گھر سے نکلتا ہے، پرندوں کی طرح اپنے آشیانے سے باہر تلاشِ خوراک کے لیے۔ طرح طرح کی حرکات کرتا ہے اور پھر شام کو گھر لوٹتا ہے۔ حسرت لے کر یا سرشاری و سرخوشی لے کر اور اس طرح زندگی ایک دائرے میں مقید ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس ضرورت کی خواہش کی تکمیل کو انسان کامیابی کہتا ہے۔ پھر ایک دن اُسے ایک نئی صُورتِ حال سے تعارف ہوتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ یہ ضرورت ہی اس کی واحد ضرورت نہیں۔ اسے کچھ اور بھی چاہیے۔ اس طرح پُرانی آرزو ایک نیا جذبہ بن کر اُبھرتی ہے اور انسان پھر مصروف ہو جاتا ہے۔ ایک نئے انداز کے ساتھ وہی پُرانا انسان نئی حرکت میں نظر آتا ہے۔

مکان میں رہنے کی آرزو، اپنے ذاتی مکان کے حصول کی آرزو، انسان کو بے چین کر دیتی ہے۔ وہ مکان بناتا ہے، کیسے کیسے جتن کرتا ہے، کہاں کہاں سے کیا کیا کچھ اکٹھا کرتا ہے۔ انسان سکون کی خاطر بے سکون ہوتا ہے۔ آرام کی تمنا میں بے آرام ہوتا ہے اور کبھی کبھی قیام گاہ کی

خاطر سفر اختیار کرتا ہے۔ وطن میں خوبصورت آشیانہ بنانے کے لیے بے وطن ہونا بھی گوارا کر لیتا ہے۔ یہ آرزو بڑے رنگ دکھاتی ہے۔ عمر پردیس میں گزر جاتی ہے اور امید یہ کہ دیس میں ریٹائر ہو۔ پردیسی دور سے گزرنے والے طیاروں کو سلام کرتا ہے کہ وطن کی ہواؤں کو سلام۔ باعزت

آرزو انسان کو کیسے کیسے دن دکھاتی ہے۔ اس کا جاننا مشکل نہیں۔ ایک بہتر مستقبل کی آرزو حال کو بدحال کر دیتی ہے اور پھر مستقبل اسی حال کا حصہ بن کے رہ جاتا ہے۔

انسان سماج میں عزت چاہتا ہے، وقار چاہتا ہے، سرفرازی چاہتا ہے۔ اسی لیے تو محنت کرتا ہے۔ اس کا مرتبہ اس کو عزت نہ دلائے تو یہ محنت بھی رائیگاں ہو جاتی ہے۔ وہ لوگوں کو اپنے ماتحت کام کرتا دیکھ کر اپنے آپ کو اپنے قد سے بڑا سمجھنے لگ جاتا ہے۔ لیکن یہی لوگ جو اس کے ماتحت ہیں اس کی عزت اور شہرت کو گھن کی طرح کھا جاتے ہیں۔ اس کے پاس سماجی مقام ہوتا ہے، لیکن عزت نہیں۔ شاید عزت سماج پر رُعب کا نام نہیں، سماج کی خدمت کا نام ہے اور خدمت کے لیے اور طرح کی آرزو چاہیے۔ سیاست کے میدان میں ہم دیکھتے آ رہے ہیں کہ حکمرانی کی خواہش اور تخت و تاج کی آرزو کیا انجام لاتی ہے۔ یہ آرزو کہاں کہاں سے گزرتی ہے۔ عزت کی آرزو کوئے ملامت سے بھی گزرتی ہے۔ لوگوں کو مرعوب کرنے اور متاثر کرنے کی آرزو انسان کو ہلاک کر دیتی ہے اور وہ نہ لوگوں کو مرعوب کر سکتا ہے نہ متاثر۔ یہ لوگ بس عجیب لوگ ہیں۔ جہاں یہ بے فیض فوقیت دیکھتے ہیں بس وہیں پیج پا ہوتے ہیں۔ ان پر احسان انہیں جتا کر کیا جائے تو بھی یہ ناپسند کرتے ہیں۔ لوگوں کو ممنون کرنا ان پر ظلم کرنا ہے۔

لوگ تو اس مالک کا بھی شکریہ ادا نہیں کرتے جو انہیں مفت بینائیاں عطا کرتا ہے اور ان کے دیکھنے کے لیے نظارے پیدا کرتا ہے، جو آسمانوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے خوراک مہیا کرتا ہے۔ لوگ حصولِ نعمت کو اپنا حق سمجھتے ہیں اور دینے والے سے تعلق اتنا ہی ہے کہ وہ دیتا چلا جاتے اور لوگ لیتے چلے جائیں۔ وصولی کی رسید اور شکریہ کی ضرورت نہیں۔ بہرحال عطا کرنے والے کی آرزو عطا کرنا اور حاصل کرنے والے کی آرزو حاصل کرنا، اس میں رُعب کس بات کا؟

یہی تو انسان اور خدا میں فرق ہے۔ وہ دیتا ہی چلا جاتا ہے۔ غافلوں کو، کافروں کو، منکروں کو بلکہ ہر ایک کو، بد و نیک کو۔ اس کی رحمت آسمان کی طرح سب پر چھائی ہوئی ہے لیکن انسان کسی کو راستہ بتاتے تو ساتھ ہی اپنا تعارفی کارڈ اس کو دیتا ہے کہ مجھے اس پتہ پر خط لکھنا۔ خدا خدا ہے اور انسان انسان۔

انسان کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ اسے بہت سے انسان پہچان لیں۔ اس کے خیال میں شریک ہوں۔ اس کی صفات کی تعریف کریں۔ اس کے تشخص کا ادراک کریں۔ اس کے الفاظ کی قدر کریں، اس کے چہرے کو مشتاق نگاہوں سے دیکھیں، اس کا انتظار کریں، اسے آنسوؤں کے ساتھ الوداع کریں اور اس کی زندگی کو مقدس مانیں اور مرنے پر اس کے جنازے میں شامل ہوں اور اس کے جانے کے بعد اس کے دن منائے جائیں۔ اس کی یادیں زندہ رہیں۔ اس کے بعد کچھ بھی نہ ہو سوائے اس کی یاد کے .... اور .... یہی آرزو، بربادی اور تباہی کا باعث ہے ظلم کا پیش خیمہ ہے۔ انسان اپنی آرزو کے حصول میں یہ بھول جاتا ہے کہ دوسرے انسان بھی آرزو رکھتے ہیں۔ ایسی ہی آرزو، بالکل ایسی۔ وہ بھی تشخص کی پہچان چاہتے ہیں، جلسہ گاہ میں سامعین اپنا مقام رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ نہ ہوں تو کوئی مقرر پیدا ہی نہ ہو۔ گرمیٔ بازار دکاندار کے دم سے نہیں خریدار کی مرہونِ منت ہے۔

انسان کی آرزو اسے نیکی اور بدی کے راستے دکھاتی ہے۔ تکمیلِ آرزو کے مراحل بڑے کٹھن ہیں۔ خوش رہنے کی آرزو غم سے آشنا کراتی ہے۔ حاصل کی آرزو محرومیوں کے دامن سے وابستہ کرتی ہے۔ جینے کی آرزو موت کے شکنجے میں لاتی ہے۔

آرزو کا سفر مرگِ آرزو تک ہے۔ جو حاصل ہو گیا، اس کی تمنا ختم ہو جاتی ہے اور جو نہ حاصل ہو سکے وہ ایک حسرتِ ناتمام بن کر دم توڑتی ہے۔

آرزو کا مسافر رکتا نہیں۔ وہ چلتا ہی رہتا ہے۔ اگر اسے کسی ایسی ہستی سے تعارف ہو جائے جو اس کو اس کی آرزو کا چہرہ دکھا کر اسے آرزو سے بے آرزو کر دے، تو یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔

آرزوؤں کا طویل سلسلہ انسان کے لیے عذاب سے کم نہیں۔

آرزو کا فسانہ کبھی مکمل نہیں ہو سکتا۔ کبھی آغاز رہ جاتا ہے، کبھی انجام رہ جاتا ہے۔

بعض اوقات جب ہم اپنی آرزو کو حاصل کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو وہ چیز نہیں جو ہم نے چاہی تھی۔ ہم نے یوں تو نہ چاہا تھا۔ تمنا اور حاصل میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ خوابوں اور تعبیروں میں بڑے فاصلے ہوتے ہیں۔

زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ انسان محسوس کرتا ہے جیسے اس کی آرزو میں اس کا حاصل لاحاصل ہو۔ اسے ناکام ارادوں پر خوشی سی ہونے لگتی ہے اور کامیاب آرزوؤں کے انجام سے وحشت سی ہونے لگتی ہے۔ کامیاب آرزو گناہ ہو سکتی ہے، لیکن ناکام آرزو کبھی گناہ نہیں ہو سکتی۔ نیکی کی آرزو ناکام ہو، تب بھی نیکی ہی ہے۔ بدی کی آرزو بدی ہے، بدی کا سفر بدی ہے اور انجام تو خیر بدی ہے ہی سہی۔

اللہ کا ارشاد ہے کہ عین ممکن ہے کہ انسان ایسی چیز کو پسند کرے جو اس کے لیے نقصان دہ ہو اور عین ممکن ہے کہ وہ ایسی چیز کو ناپسند کرے جو اس کے لیے مفید ہو۔

لہٰذا یہ ضروری ہے کہ کامیابیوں اور کامرانیوں کی آرزو سے پہلے ان کے انجام اور ان کی عاقبت کے بارے میں کسی جاننے والے سے پوچھ لیا جائے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بظاہر کامیاب زندگی ایک ناکام بلکہ عبرت ناک انجام سے دوچار ہوتی ہے۔ وہ مسافر جسے گاڑی میں سیٹ نہ ملی اپنے آپ کو بدقسمت سمجھتا ہے اور جب گاڑی حادثے کا شکار ہوتی ہے، تو وہی انسان اپنی خوش نصیبی پر فخر کرتا ہے۔ آرزوؤں کو انجام کے حوالے سے دیکھنا اور پہچاننا ہی باعثِ رحمت اور باعثِ عافیت ہے۔ یہ جاننا چاہیے کہ نیک آرزو میں ناکامی بُری آرزو میں کامیابی سے بدرجہا بہتر ہے۔ اچھی آرزو میں خوش نصیبی کی ضمانت ہیں لیکن سب سے زیادہ خوش قسمت انسان شاید وہ ہے جو بے نیازِ آرزو ہو جس کی اپنی منشا منشائے ایزدی کے تابع ہو۔



فیصلہ

انسان کی زندگی فیصلہ کرنے کی اہمیت کے سبب سے اہم ہے۔ انسان کو عقل دی گئی، قوا دیے گئے۔ اُس کے سامنے زندگی کی کتاب کھلی ہے۔ اُس کے سامنے کائنات جلوہ آرا ہے۔ اُس کے سامنے قوموں کا ماضی ہے مستقبل کے اندازے اور پروگرام ہیں۔ وہ سوچ سکتا ہے اس لیے وہ حق رکھتا ہے کہ فیصلہ کرے اور وہ فیصلہ کرتا ہے۔ . . . مگر افسوس تو یہ ہے کہ وہ ایک فیصلہ کرنے کے بجائے فیصلے ہی کرتا رہتا ہے اور یوں لکھ لکھ کر مٹاتا ہے اور مٹا مٹا کے لکھتا ہے، اپنی قسمت کے الفاظ۔ . . .

انسان کو جب بھی کوئی مشکل اور صحیح معنوں میں مشکل درپیش آئے تو وہ فیصلے کی گھڑی ہوتی ہے اور یہ گھڑی کسی وقت بھی راہ میں کھڑی ہو سکتی ہے۔ ہم چھوٹی چھوٹی باتوں سے لے کر بڑے بڑے کارناموں تک فیصلوں کی مدد سے چلتے ہیں۔ فیصلوں کے دم سے عروج حاصل کرتے ہیں اور فیصلوں کے دم سے ہی زوال۔

انسان فیصلہ ایک لمحے میں کرتا ہے اور پھر اس فیصلے کا نتیجہ ساری عمر ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ روشنی کی طرح کبھی آسیب کی طرح۔ ایک بار کیا گیا فیصلہ کبھی بدلا نہیں جا سکتا۔ وقت دوبارہ نہیں آتا۔ زندگی میں کوئی لمحہ دوبارہ نہیں آتا۔ فیصلے کے لمحے کہاں دہرائے جا سکتے ہیں۔

دوستوں کو تحفہ دینے کا وقت آئے تو ہم فیصلے کے کرب سے دوچار رہتے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ دوست کو سب سے قیمتی تحفہ پیش کیا جائے۔ انسان سوچتا ہے اور سوچتا ہی رہتا ہے اور جب فیصلہ کرتا ہے تو تحفہ دینے کا وقت گزر چکا ہوتا ہے اور یوں دوستی ختم ہونا شروع ہوتی ہے۔ دراصل دوستی میں تحائف کا تبادلہ ہی دوستی کی کمزوری ہے۔ اس رشتے کو رشوت کا ذریعہ نہ بننے دیا

جائے تو بہتر ہے۔ امیر اور غریب آدمی دوستی اس لیے نہیں کر سکتے کہ تحائف کا تبادلہ ناممکن ہے۔ آج کل انسان کے پاس وقت ہی نہیں کہ وہ سوچتا رہے کہ اسے کیا چیز کس کو کب دینا ہے۔ اس کام کے لیے ایکسپرٹ ادارے موجود ہیں۔ وہ آپ کا فیصلہ کر کے آپ کو بِل دے دیں گے اور بس کام تمام ہو گیا۔

ہم لوگ فیصلہ کرنے کا شوق تو زمانۂ قدیم سے رکھتے ہیں یعنی بچپن سے ہر آدمی کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ بڑے بڑے فیصلے کرے، اپنے فیصلے، اور اگر اپنے نہ کر سکے تو قوموں کے فیصلے، ملکوں کے فیصلے۔

یہ عجیب بات ہے کہ ہماری زندگی کو بے حد متاثر کرنے والے فیصلے اتفاقاً ہو جاتے ہیں، بس اتفاقاً جیسے اتفاقاً نظر سے نظر مل جائے اور پھر زندگی بھر کا ساتھ ہنس کر یا رو کر، لیکن زندگی بھر! یہ فیصلہ کچھ لوگوں کی زندگی میں آناً فاناً نازل ہوتا ہے۔ اِدھر منگنی اُدھر بیاہ.... اور پھر بات آئی گئی ہو گئی....

کچھ لوگوں کے لیے یہی فیصلہ اتنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ بیچارے سوچتے ہی رہتے ہیں۔ ان کے سامنے بہت سے راستے ہوتے ہیں اور وہ سوچتے ہیں کہ کونسا راستہ بہتر رہے گا۔ یہ سوچ ان کو کسی فیصلے پر پہنچنے ہی نہیں دیتی اور نتیجہ یہ کہ سفر کا وقت ہی نکل جاتا ہے اور پھر یہ لوگ اپنی تنہائیوں میں اپنے ماضی کے ممکنات کو دہراتے ہیں اور یہ سوچ کر حیران ہوتے ہیں کہ ممکنات ناممکن کیسے ہو گئے.....! فیصلے، اتنے اہم فیصلے اور اتنی دیر کہ فیصلے ہی بے اثر ہو گئے... جوانی کے فیصلے جوانی میں ہی چلے لگتے ہیں اور جوانی سوچ بیچار کی نذر کرنے والے کیا فیصلے کریں گے...

انسان کو جینے کا حق ملا ہوا ہے کہ وہ اپنی پسند کی زندگی اختیار کرے۔ انسان پر چناؤ کا لمحہ ہی تو فیصلے کا لمحہ بن کر آتا ہے اور پھر یہ لمحہ زندگی بدل کے رخصت ہوتا ہے۔

خوش نصیب ہیں وہ لوگ، جن کو صرف ایک راستے کا سفر ملا ہے۔ ان کو کسی موڑ پر کسی دوراہے پر کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

تکلیف اُن لوگوں کے لیے جو شعور رکھتے ہیں اور پھر چنتے ہیں اور پھر سوچتے ہیں اور پھر کبھی کبھی پچھتاتے ہیں۔ زندگی کے اکثر مسافر صرف آدھا راستہ ہی طے کرتے ہیں۔ وہ ایک فیصلہ کرتے ہیں اور کچھ عرصہ کے بعد اس فیصلے کی غلطی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور پھر ان کی سوچ ان کے پاؤں کی زنجیر

بن جاتی ہے۔ مشورہ دینے والا ذہن ہی ساتھ نہیں دیتا۔ جذبات بھرا دل جذبات سے محروم ہو چکا ہوتا ہے۔ پھر یہی لوگ سوچتے ہیں کہ یہ سفر غلط سمت میں جا رہا ہے۔ اب واپس جانا ممکن نہیں ہوتا۔ آگے جانے کا حوصلہ نہیں ہوتا کہ پرانا فیصلہ ہی غلط نکلا۔ تب یہ لوگ ایک مقام پر کھڑے ہو کر کبھی ماضی کو دیکھتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں، کبھی ممکن مستقبل کی طرف دیکھتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں، کبھی آسمان کی طرف دیکھتے ہیں حسرت بھری نگاہ سے کبھی زمین کو دیکھتے ہیں کہ شاید کوئی نیا راستہ نکلے۔ پھر وہ اپنے آپ کو دیکھتے ہیں کبھی غصے سے کبھی رحم کے ساتھ ..... مگر اُن کے نصیب میں صرف آدھا راستہ ہی تو ہوتا ہے۔ ایسے مسافروں کو صرف ایمان کا نور ہی راستہ دکھا سکتا ہے، ورنہ نہیں۔!!

فیصلے کا لمحہ بڑا مبارک لمحہ ہوتا ہے۔ زندگی میں بار بار یہ لمحات نہیں آتے۔ صحیح وقت پر مناسب فیصلہ ہی کامیاب زندگی کی ضمانت ہے۔

اگر غلطی سے کوئی غلط فیصلہ بھی ہو جائے، تو اس کی ذمہ داری سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے فیصلے اپنی اولاد کی طرح ہیں، جیسے ہیں اُن کی حفاظت تو ہوگی۔ دنیا کی تاریخ کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ تاریخی فیصلے اکثر غلط فیصلے تھے۔ لیکن تاریخ تھے۔

تقدیر اپنا بیشتر کام انسانوں کے اپنے فیصلے میں ہی مکمل کر لیتی ہے۔ انسان راہ چلتے چلتے دوزخ تک جا پہنچتا ہے یا وہ فیصلے کرتے کرتے بہشت میں داخل ہو جاتا ہے۔ بہشت یا دوزخ انسان کا مقدر ہے، لیکن یہ مقدر انسان کے اپنے فیصلے کے اندر ہے۔

ہم فیصلہ کرتے وقت صرف ایک آدھ چیز پر غور کرتے ہیں حالانکہ اس فیصلے سے متعلق کتنے اور واقعات رونما ہونا شروع ہو جاتے ہیں، جن کا ہمیں اندازہ ہی نہیں ہوتا۔

شادی، خانہ آبادی ہمارا فیصلہ ہوتا ہے۔ ہم اور کچھ نہیں جانتے، زیادہ سے زیادہ ہم ایک دوسرے کے حالات جان سکتے ہیں، ایک دوسرے کا ماضی جان سکتے ہیں۔ اب ماضی کے علم سے مستقبل کا سفر شروع کرتے ہیں۔ یہیں ہمارا فیصلہ غلطی کا شکار ہو جاتا ہے۔

اپنے کام اللہ کے سپرد کر دینے والے مطمئن رہتے ہیں۔ جو ہو سو ہو، سب ٹھیک۔ ان کا فیصلہ

ہوتا ہے کہ جو ہوا اچھا تھا، جو ہو رہا ہے اچھا ہے اور جو ہوگا اچھا ہوگا۔ ایسے لوگوں کو فیصلہ کیا تکلیف دے سکتا ہے۔

فیصلے کا ایک اہم موڑ ہماری قومی اور سیاسی زندگی میں آچکا ہے۔ عجیب صورت حال ہے۔ جمہوریت اور مارشل لا کا کھیل ہے۔ مارشل لا جمہوریت پر رخصت ہوتا ہے اور جمہوریت مارشل لا پر ختم ہوتی ہے۔

نفاذِ اسلام کا فیصلہ تھا، اس کا کیا ہُوا....؟.... نفاذِ اسلام ہو چکا ہوگا! مارشل لا اپنی طویل شبِ غم گزار کے جا رہا ہے.... جمہوریت کا سورج طلوع ہونے والا ہے.... اس فیصلے کا اعلان ہو چکا۔

ہم فیصلوں والی قوم بنتے جا رہے ہیں۔ بہت بڑے فیصلے، بہت جلد فیصلے.... زیادہ فیصلے.... فیصلے ہی فیصلے، اور جب عمل کا وقت آئے تو نئے فیصلے کرنے لگ جاتے ہیں۔ ہم لوگ بڑی دیر سے فیصلوں کا کھیل کھیلتے آ رہے ہیں۔ ہم شاید جانتے نہیں کہ ہمارے فیصلوں کے اوپر ایک اور فیصلہ نافذ ہو جایا کرتا ہے۔ یہ وقت کا فیصلہ ہوتا ہے اور وقت کے سامنے ہمارے سارے فیصلے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

صاحبانِ بصیرت غور کریں کہ ہم کیا فیصلے کرتے رہتے ہیں۔ ہم سب غیر معین مدت تک فیصلوں کے مقام پر نہیں رہ سکتے اور پھر ہمارے پاس فیصلے کا نہ وقت ہوتا ہے نہ حق.... وقت اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ ہمارے فیصلوں پر فیصلہ.... وقت کے پاس آخری اختیار ہے۔ آخری فیصلہ.... دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی....

ہمیں اپنے فیصلے اللہ کے حضور پیش کرتے رہنا چاہیے تاکہ ہم بہک نہ جائیں.... لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب لانے کے فیصلے کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ ان کی اپنی زندگی کسی اور کے فیصلے کے تابع ہے۔ زندگیوں کے فیصلے کرتے کرتے انسان کی اپنی رخصت کا فیصلہ سنا دیا جاتا ہے.... اور پھر سب فیصلے اکارت....!! سب حاصل لاحاصل!!



رات

انسان کی زندگی میں جتنے دن ہوتے ہیں اتنی ہی راتیں ہوتی ہیں۔ یوں انسان کی نصف زندگی روشنی میں گزرتی ہے اور نصف اندھیرے میں۔

دن کے اجالے اپنے ساتھ اپنے مسائل لاتے ہیں۔ انسان پر کسبِ معاش کی فکر سورج سے روشنی کے ساتھ ہی نازل ہوتی ہے۔ انسان تلاشِ معاش کے سلسلے میں گھر سے نکلتا ہے جس طرح پرندے آشیانوں سے نکلتے ہیں۔ دن کی روشنی حقائق کی روشنی ہے تلخ ہے۔ انسان کچھ بھی تو نہیں چھپا سکتا۔ اس کا چہرہ اس کے حالات اور اس کی حالت کا آئینہ بن کر احباب و اغیار کے رُوبرو ہوتا ہے۔ انسان کا سہما ہوا خوف زدہ دل ہرن کی طرح اوٹ اور پناہ تلاش کرتا ہے لیکن سورج کی روشنی اس کے تعاقب میں ہوتی ہے اور یُوں انسان بھاگتا ہے، اپنے سائے سے ڈرتا ہُوا۔ اپنے سائے کی تلاش میں کوسوں فاصلے طے کرتا ہے۔ اپنے حاصل کی آرزو میں اپنی محرومیوں کا مسافر دن کی روشنی میں بے چین رہتا ہے۔

رات آتی ہے، محنت کے زخموں سے چُور جسموں کو نیند کی مرہم عطا کرنے کے لیے۔ انسان کے لیے دھوپ سے تپتے صحرا میں نخلستان کی راحت رات کے دم سے ہے۔ رات اپنے پُراسرار دامن میں بے پناہ خزانے سمیٹ کر لاتی ہے جنہیں وہ اہلِ دل حضرات کی خدمت میں پیش کرتی ہے۔

سونے والوں کو رات لوری دیتی ہے۔ جاگنے والوں کی حُدی خواں ہے۔ رات عجب راز ہے۔ یہ راز سب پر آشکار نہیں ہوتا۔ رات انکشافِ زمان و مکاں کرتی ہے۔ رات کو وقت کے لامحدود فاصلے سمٹ جاتے ہیں۔ رات کے پاس بڑے طلسمات ہیں۔ یہ کبھی لمحے کو صدیاں بنا دیتی ہے، کبھی

صدیوں کو ایک لمحہ۔ رات کے پاس وہ قوت ہے کہ یہ ازل اور ابد کو بیک وقت ایک نقطے پر اکٹھا کر دیتی ہے۔

راتوں کو جاگنے والے ماضی، حال اور مستقبل کی تقسیم سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ غواصانِ شب رات کی گہرائیوں سے انمول موتی نکالتے ہیں، مشاہدات و حقائق کے موتی۔

یہ حقیقت ہے کہ انسانی زندگی کو احساس و لطافت کی دولت رات کو ملتی ہے۔ انسانیت کا عروج راتوں کو ہوتا ہے۔ بیدار راتیں، اشکبار راتیں۔ اور پھر ہر عروج کا انتہائی عروج۔ معراج "رات کا عطیہ ہے۔ اللہ نے اپنے بندے کو رات کے عالم میں ہُو کے عالم میں سیر کرائی مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک بلکہ مکاں سے لامکاں تک۔ اللہ سیر کرائے اپنے محبوبؐ کو، تو کیا کیا کرشمہ نہ دکھایا ہوگا۔ کون سا زمانہ ہے جو آپؐ کے روبرو نہ لایا گیا ہوگا۔ راکبِ وقت جب زمامِ گردش کھینچ لے، تو کونسی وسعت ہے جو دامنِ رحمت کے سائے سے نہ گزرے اور کونسا زمانہ ہے جو محتاجِ نگاہِ رحمتِ عالمؐ نہ ہو۔ رفعتوں اور وسعتوں کو طے کرنے والی نگاہ میں آج بھی وقت کے فاصلے حائل نہیں۔

رات کا اعجاز یہ ہے کہ آج بھی پکارنے والوں کو جواب ملتا ہے۔ چشمِ تمنا رات کو چشمِ گوہر بار بنتی ہے، چشمِ بینا بنتی ہے۔ انسان اور حق کی ذات کا تقرب رات کو ہوتا ہے۔ سجدوں کو قبولیت کی سرفرازی حاصل ہوتی ہے۔ مضطرب پیشانیوں کو راحتِ سنگِ در نصیب ہوتی ہے۔

رات کا عالم عجب عالم ہے۔ خاموشی گویا ہوتی ہے۔ سکوت نغمہ سرا ہوتا ہے۔ سناٹے بولتے ہیں، ہم کلام ہوتے ہیں۔ آئینوں سے عکس آئینہ باہر نکلتا ہے اور صحرائے تشنہ بھی قلزمِ رحمت سے ہم کنار ہوتا ہُوا سیراب ہوتا ہے، سرشار ہوتا ہے۔

رات کی نوازشات کے قصے اہلِ دل اور اہلِ باطن کی زندگی کا اثاثہ ہیں۔ رات کی تنہائی میں انسان کی آنکھ سے ٹپکنے والے آنسو زمانے بدل دیتے ہیں، طوفانوں کا رُخ موڑ دیتے ہیں۔ آہ و فغانِ نیم شب کے سامنے کوئی مشکل مقام مشکل نہیں رہتا۔ ہر ناممکن، ممکن ہو جاتا ہے۔

رات کی خوشبو ہر خوشبو سے بہتر ہے۔ یہ خوشبو افلاک سے نازل ہوتی ہے۔ رحمت کی خوشبو،

کائنات کی خوشبو بلکہ حسنِ ذات کی خوشبو۔ یہ خوشبو کاروانِ شوق کی رہنما ہے۔ جذب و مستی کی تمام رنگین داستانوں کا حرفِ اوّل اور حرفِ آخر یہی خوشبو ہے۔

جب انسان اپنے درد و کرب اور غم و اندوہ کے بوجھ رات کے خاموش آنگن میں اتارتا ہے، تو اسے عجیب احساس ہوتا ہے۔ رات ہی اسے سمجھاتی ہے کہ اے ناسمجھ انسان! جسے تو اپنے لیے کرب و ابتلا سمجھ رہا ہے، یہی تو تیرا حاصل ہے۔ یہی ہے تیرے لیے تیرے مالک کی طرف سے دولتِ گرانمایہ۔ انسان رات کی گود میں ہنستا ہے اور روتا ہے اور رات اسے پیش کرتی ہے اس ہستی کے رُوبرو، جس کو غم زدوں سے پیار ہے اور یُوں رات ایک عظیم محسن بن کر شعور کی زندگی میں داخل ہوتی ہے۔ محدود کو لامحدود سے نسبت راتوں کو پیدا ہوتی ہے۔

انسان رات کے عالم میں کائنات کے بہت قریب ہوتا ہے۔ وہ کائنات سے واصل ہوتا ہے۔ وہ ذرّے ذرّے کے ساتھ شامل ہوتا ہے۔ وہ ہر ستارے کی جھلملاہٹ سے جلتا بجھتا رہتا ہے۔ وہ چاند دیکھتا ہے اور چاندنی سے کھیلتا ہے۔ وہ اداس موسم کا خوشگوار پھل حاصل کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ستارے، کروڑوں ستارے پاس پاس نظر آتے ہیں اور ایک دوسرے سے کتنے دُور رہتے ہیں۔

اپنے اپنے مدار میں گردش کرنے والے ہمیشہ اپنے اپنے مدار میں ہی رہتے ہیں۔ یہی کائنات کا حسن ہے اور یہی اس کی بقا کا راز، لیکن انسان کی دنیا اور اس کا رازِ بقا الگ ہے۔ یہاں اپنا مدار اپنا نہیں ہوتا۔ اپنی ذات اپنی نہیں ہوتی۔ کچھ بھی تو اپنا نہیں ہوتا۔

کسی کا کہا ہُوا کسی اور کا علم ہے۔ ایک کا چہرہ دوسرے کی تمنا ہے۔ دل اپنا ہوتا ہے اور اس میں درد دوسروں کا ہوتا ہے۔ یاد کسی کی ہوتی ہے، سرمایۂ حیات کسی اور کا . . .

انسان کی کائنات تو یہ ہے کہ اس کی کمائی بھی اُس کی اپنی نہیں۔ اُس کی ذات بھی اس کی اپنی نہیں۔ اس کی خلوت بھی اس کی اپنی نہیں، اس کی جلوت بھی اس کی اپنی نہیں۔ جبینِ شوق اس کی ہے، سنگِ در کسی اور کا۔ دل اُس کا، دلبری کسی اور کی۔ آنسو اُس کے، عاقبت کسی اور کی۔ رتجگے کسی کے، چراغ کسی کے۔ انسانی کائنات مربوط ہے، مبسوط ہے۔ ستاروں کی کائنات تنہا۔ ہر ستارے کا

راہگذر الگ۔ سب کے مدار الگ۔ یہ حسن کائنات ہے۔ لیکن انسان کی کائنات، کائنات حسن ہے ہمہ رنگ، ہمہ جہت اور ہمہ سمت۔ سب کی کائنات سب کے لیے۔

رات انسان پر نزولِ افکار کا ذریعہ ہے۔ رات کی عبادت افضل عبادت ہے۔ جس کی رات بیدار ہو جائے، اس کا نصیب جاگ اٹھتا ہے۔ رات انسان کا لباس ہے۔ انسان پر تیرگی کا لباس ہر لباس کو یکساں کر دیتا ہے۔

رات کو رُوح کے حجابات اٹھتے ہیں۔ انسان کی رُوح رات کو انسان سے ہم کلام ہوتی ہے۔ خود شناسی اور خود فہمی کے مراحل رات کو آسان ہوتے ہیں۔ رات بہت بڑا راز ہے۔

صحرا کے مسافر پر جب رات اترتی ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ کون ہے اس خوبصورت کائنات کو بنانے والا۔ اتنی بڑی تنہائی میں انسان رات سے باتیں کرتا ہے۔ رات سُنتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔ یہ عمل جاری رہتا ہے اور پھر یکایک۔ رات بولتی ہے اور انسان سنتا ہے۔ سنتا ہے اور خاموش رہتا ہے۔ دیکھتا ہے اور کسی کو دکھا نہیں سکتا کہ اس نے کیا دیکھا۔ رات کا راز پہاڑوں پر آشکار ہوتا ہے۔ اونچے اونچے، پتھریلے پہاڑ، ہوا کی سائیں سائیں، انسان اور رات۔ رات اور انسان، ہم کلامی کا دور جاری رہتا ہے۔

رات خود کسی معصوم کی رُوح ہے، کائنات پر محیط روح۔ انسان سے ہم کلام ہونے کے لیے بیتاب روح انسان کو پکارتی ہے۔ نیند میں ڈوبے ہوئے انسان کو جاگنے والی رات پکارتی ہے، اس کا نام لے کر کہ ”اے غافل! سن مَیں بول رہی ہوں۔ دیکھ مَیں جلوہ آرا ہوں۔ محسوس کر مَیں تیرے قریب ہوں، بہت قریب اور تو نیند میں مجھ سے دُور ہے، بہت دُور۔“

رات کا اعجاز، عجب اعجاز ہے۔ انسان پر دعا اور دعا کی مقبولیت کا راز منکشف ہوتا ہے۔ رات کے پاس بڑے خزانے ہیں۔ بیدار راتیں قوموں کے روشن مستقبل کی ضامن ہیں۔ انسان پر عرفانِ ذات کی منزلیں آسان کرنے کا دعویٰ ہے، رات کے پاس۔

رات کو زمین اور آسمان کے فاصلے ختم ہو جاتے ہیں۔ یہاں وہاں کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔

خاموش الفاظ بولتے ہیں۔ رات کو خوش نصیبوں کی آنکھ تر ہوتی ہے اور ان کا دل معمور ہوتا ہے۔ ان کے اذہان روشن ہوتے ہیں۔ اُن پر لوح و قلم کے رموز، مخفی رموز آشکار ہوتے ہیں۔ دنیائے علم و عرفان کے عظیم شاہکار رات کی تخلیق ہیں۔

خوش بختوں کی رات نجات و مناجات کی رات ہے۔ شبِ فراق ہو یا شبِ وصال، بیدار رات انسان کے عروج کا قصہ ہے۔ سکوتِ دو جہاں میں انسان کی فغانِ مکین لامکاں کے حضور پہنچتی ہے اور پھر یہ رات لیلۃ القدر بن کر انسان کے مقدر کو بناتی ہے۔ آسمان سے فرشتے نازل ہوتے ہیں، افکار نازل ہوتے ہیں۔ کبھی مثنوی اور کبھی سیف الملوک تحریر ہوتی ہے۔ شاعر صرف جاگتا ہے، باقی کام رات خود کرتی ہے۔ فقیر بیدار ہوتا ہے، فقر خود نازل ہوتا ہے۔

رات کو سجدہ گاہ، جلوہ گاہ بنتی ہے۔ بگڑی سنور جاتی ہے۔ رات کبھی کبھی ناراض بھی ہو جاتی ہے۔ پھر غضب ڈھاتی ہے [illegible] کی رات انسان کے سر پر آسمان گرتا ہے اور وہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ انسان درد میں مبتلا ہوتا ہے۔ وہ کراہتا ہے۔ کرب و درد میں تفکرات میں، اندیشوں میں۔ رات بے حس ہوتی ہے . . . بے یقین انسان، رحمت سے مایوس انسان، ایمان سے عاری انسان رات کی بات نہیں سمجھ سکتا۔ اس کے لیے صرف دعا ہے۔

یہ دعا صاحبانِ نصیب پر فرض ہے۔ صاحبانِ علم و عرفان دعا ہی تو کرتے ہیں۔ درد سے تو وہ بھی گزرتے ہیں لیکن ان کو یقین کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ ان کے باطن [illegible] ایمان و اُمید کے چراغ جلتے ہیں۔ وہ درد کو متاعِ بے بہا سمجھ کر سینے سے لگاتے ہیں اور اپنے محسنوں کو دعا دیتے ہیں۔

رات انسان کو درد کی بھٹی سے ہی تو گزارتی ہے۔ جو اصل ہے کندن بن جاتا ہے اور نقل بھسم ہو جاتا ہے۔ یقین عرفان بن جاتا ہے اور بے یقینی محرومِ ایمان ہو جاتی ہے اور مایوسی بن کر اپنی نوحہ گر ہوتی ہے۔

اپنے مستقبل پر یقین نہ ہو، تو شبِ بیداری عذاب ہے۔ شب بیداری بیدار مغز، بیدار

بخت انسان کے لیے نعمت ہے، عطائے پروردگار ہے۔

احسان ہے خالق کا اُن لوگوں پر جن کو بیدار راتوں کا نصیب ملا ہے۔ نالہ ہائے نیم شبی وجودِ آدم کی مقدس ترین عبادات کا نام ہے۔ انسان، دل والے انسان، یقین وایمان والے انسان کے آنسو، نیم شب کے آنسو، ستاروں سے زیادہ روشن اور شبنم سے زیادہ پاکیزہ ہوتے ہیں۔ انہی اشکوں کے دم سے آباد ہے یہ دنیا، دنیائے علم و آگہی، دنیائے عرفان، دُنیائے باطن اور دُنیائے حقیقت !!



گناہ دینی حکم کے خلاف عمل کا نام ہے۔ جُرم حکومت کے حکم کے خلاف عمل کا نام ہے۔ گناہ کی سزا اللہ دیتا ہے اور جرم کی سزا حکومت۔ گناہ سے توبہ کر لی جائے تو اس کی سزا نہیں ہوتی۔ لیکن جرم کی معافی نہیں ہوتی۔ گناہ کی سزا آخرت میں اور جرم کی سزا اسی دُنیا میں ہے۔ گناہوں کی سزا وہ حکومت دے سکتی ہے جو حکومتِ الٰہیہ ہو۔ اگر توبہ کے بعد پھر گناہ سرزد ہو جائے تو پھر توبہ کر لینی چاہیے۔ مطلب یہ کہ اگر موت آئے تو حالتِ گناہ میں نہ آئے بلکہ حالتِ توبہ میں آئے۔ توبہ منظور ہو جائے تو وہ گناہ کبھی سرزد نہیں ہوتا اور نہ اس گناہ کی یاد باقی رہتی ہے۔ سچی توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے نوزائیدہ بچہ معصوم۔

تنہائی

آج کی زندگی کا المیہ تنہائی ہے۔ آج کا انسان وقت کے وسیع و لامحدود سمندر میں ایک جزیرے کی طرح تنہا ہے۔ ہم سب جزیرے ہیں —— ایک دوسرے کے آس پاس، لیکن ایک دوسرے سے ناشناس —— ایک دوسرے سے بے خبر، ایک دوسرے سے اجنبی اور اپنے آپ سے اجنبی۔ کروڑوں افراد ہجوم در ہجوم اور سارے تنہا۔ انسانوں کی بھیڑ ہے، انسانوں کا میلہ ہے، لیکن ہر انسان اکیلا ہے۔

ہم سب اپنے اپنے مفادات اور مقاصد کے تعاقب میں ہیں۔ ہم اپنی غرض اور خود غرضی کے غلام ہیں۔ کسی کو کسی سے کوئی سروکار نہیں۔ سب کامیابی کے پجاری ہیں: "کامیابی" آج کے انسان کا معبود ہے۔ کامیابی، جو حاصل نہیں ہوتی —— ایک خوبصورت تتلی، جو اڑتی ہے اور لوگ بچوں کی طرح اس کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں، اپنوں سے اور اپنے آپ سے۔

ہم سب مصروف ہیں۔ ہمیں بڑے کام کرنے ہیں۔ ہم بہت سی خواہشات رکھتے ہیں۔ ہم بڑی اذیت میں ہیں۔ ہم سب کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہمارے پاس وقت نہیں کہ ہم آرام کر سکیں۔ سکون کی تلاش میں ہم بے سکون ہیں۔ آرام کی تمنا ہمیں بے آرام کر رہی ہے۔ محفلوں کی آرزو ہمیں تنہائی تک لے آتی ہے۔ دل بجھ جائے، تو شہرِ تمنا کے چراغاں سے خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ ہم تیزی میں ہیں۔ ہم جلدی میں ہیں۔ ہم جمع کرتے ہیں مشکل وقت کے لیے پس انداز کرتے ہیں اور پھر مشکل وقت کا انتظار کرتے ہیں اور وہ مشکل وقت ضرور آتا ہے۔ ہم جلدی میں ہیں۔ ہم تیز رفتار ہیں۔ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی خواہش میں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ بھائی بھائی میں مقابلہ ہے۔ بھائی بھائی الگ ہیں۔ مقابلہ کرنے کی خواہش معاون سے محروم کر دیتی

ہے۔ ہم صرف اپنے لیے زندہ ہیں۔ اپنی ذات میں گم، اپنے اپنے سفر پر گامزن۔ آسمان کے کروڑوں ستاروں کی طرح اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ آدمی آدمی سے اجنبی ہو رہا ہے۔ یہ اجنبیت تنہائی میں اضافہ کر رہی ہے۔

ہم ایک دوسرے کو ہلاک کرتے جا رہے ہیں۔ وسائل کی ناہموار تقسیم محرومیاں پیدا کر رہی ہے۔ ہم اپنے آپ کو زندگی سے محروم کرتے جا رہے ہیں۔ ظاہری کامیابیاں اندر کی گھٹن کب تک چھپائیں گی۔ اندر کا انسان سسک رہا ہے، بلک رہا ہے، چیخ رہا ہے۔ ہم اس کی آواز سنتے ہیں، لیکن اپنے کانوں پر اعتبار نہیں۔ ہم اپنے باطن کو ہلاک کر کے کامرانیوں کے جشن مناتے ہیں۔ ہم اپنے رُوحانی وجود سے فرار کر رہے ہیں۔ ہم نے کئی چہرے رکھے ہوتے ہیں۔ ہمارے غم اور ہماری خوشیاں میکانکی ہیں۔ ہم ہمدردی سے ناآشنا ہیں۔ ہم اپنے اندر کی آواز کو خاموش کرا دیتے ہیں اور پھر ضمیر کے کسی دباؤ سے آزاد ہو کر ہم اپنی تنہائی کے سفر پر رواں رہتے ہیں۔

ہماری زمین خطوں، علاقوں اور ملکوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔ ایک ایک انچ تقسیم ہو چکا ہے۔ قوموں کے لیے ممالک ہیں لیکن انسان کے لیے کوئی خطہ نہیں۔ انسان اکیلا اپنے محروم ہے اپنی خلافت ارضی سے۔ پہاڑ، دریا، سمندر سب تقسیم ہو چکے ہیں۔ انسان کے لیے صرف آسمان ہی رہ گیا ہے۔

انسان خود قوموں میں بٹ چکا ہے، اپنے اسلاف سے کٹ چکا ہے، اپنے منصب سے ہٹ چکا ہے۔ انسان محبوس ہو گیا ہے۔ ہر انسان کے گرد ایک تاریخی اور جغرافیائی حصار ہے ایک نسلی تعصب ہے، ایک گروہی منفعت کا احساس ہے۔ شعور بین الاقوامی ہے اور مفادات قومی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ انسان وہ نہیں جو وہ ہے۔ انسان کثرت میں واحد ہے۔ اژدہام میں تنہا ہے۔

تنہائی روح کی گہرائی تک آ پہنچی۔ ہماری روحیں ایک دوسرے کے قرب سے محروم ہیں۔ روحیں محبت کی پیاسی ہیں۔ انسان، انسانی اقدار سے بے حس ہے۔ احساس مر چکا ہے۔ کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں چاہتا۔ ہم ایک دوسرے کو برداشت کر رہے ہیں، تسلیم نہیں کرتے۔

ہم اذیت میں ہیں۔ ہمیں اپنے علاوہ کوئی چہرہ پسند نہیں۔ ہم مفادات کے پجاری بھول گئے ہیں کہ زندگی حاصل ہی نہیں، ایثار بھی ہے۔ ہم اپنی فکر کو فکرِ بلند سمجھتے ہیں اور اپنے عمل کو عمل صالح۔ ہم نہیں جانتے کہ ہم کتنے کمزور ہیں۔ ہم اُس چراغ کی طرح ہیں جو آندھیوں کی زد میں ہے۔ ہم کئی چہرے رکھتے ہیں لیکن ہمارا اصل روپ تنہائیوں میں ہے۔ ہماری حقیقت تنہائی اور خاموشی میں ہے۔

ہماری محفلیں مسکراتی ہیں اور ہماری تنہائیاں روتی ہیں۔ ہمارے دن سورج کے ساتھ گزرتے ہیں اور رات سناٹوں میں۔ مہیب خاموشی، ایک مکمل تنہائی۔ جب ہم اپنی اصل شکل دیکھتے ہیں، ہم پہچان نہیں سکتے کہ ہم کون ہیں۔ ہمارا قیام عارضی ہے۔ ہمارے منصوبے ناپائدار۔ ہمارے عزائم ناقابلِ حصول۔ ہم اپنے دام میں ہیں اور یہی تنہائی کا سبب ہے۔ جب ہم کسی کے نہیں تو ہمارا کون ہوگا؟

ہم زندگی کا سفر تنہا شروع کرتے ہیں اور انجام کار تنہا ہی ختم کرتے ہیں۔ نہ کوئی ہمارے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور نہ کوئی ہمارے ساتھ مرتا ہے۔ ہمارے اجتماعات ضرورت کے ہیں اور ضرورتیں وفا سے ناآشنا ہوتی ہیں اور جب تک وفا نہ ملے تنہائی ختم نہیں ہوتی۔

آج کا انسان، انسانی نظروں سے گر رہا ہے۔ انسان، انسان کے دل سے دُور ہوگیا۔ آسمانوں سے راستہ لینے والا دل کا راستہ نہیں معلوم کر سکا۔ انسان، انسان کا مطالعہ چھوڑ کر کائنات دریافت کرنے چلا ہے اور کائنات کی عظیم و لامحدود وسعتوں میں تنہائیوں کے سوا کیا ملے گا؟

رفاقتوں سے محروم انسان بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور سب سے بڑی بیماری تنہائی بذاتِ خود ہے۔ یہ بیماری بھی ہے اور عذاب بھی!

آج کے انسان کی رُوح میں تنہائی کا زہر اُتر چکا ہے۔ انسان کے اعمال اس کے لیے تنہائی کا عذاب لکھ چکے ہیں۔ تن کی دُنیا کا پجاری من کی دنیا سے محروم ہو کر تنہا رہ گیا ہے۔ انسان انسان پر ظلم کر رہا ہے۔ بڑی قومیں چھوٹی قوموں کو نگل رہی ہیں۔ انسانوں کی خدمت کے نام پر انسان پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ غریب نوازیوں کے نام پر غریب کُشی ہو رہی ہے۔ امن کے نام پر جنگ کا الاؤ روشن ہو رہا ہے۔ انسان انسان سے خوفزدہ ہے۔ انسان اپنے آپ سے

گریزاں ہے۔ طاقتور کے قصیدے ہیں اور ظلم کے ہاتھ مضبوط ہوتے جا رہے ہیں۔ سُپر طاقتیں انسانوں کی تباہی کے منصوبے بنا چکی ہیں۔

آج کا انسان آتش فشاں کے دھانے پر کھڑا ہے۔ نہ جانے کب کیا ہو جائے۔ ایک ہولناک تنہائی نے انسان کو لپیٹ میں لے لیا ہے۔ ترقی و ارتقاء کے نام پر تباہی کے پروگرام بن چکے ہیں۔ انسان کی روح سہم گئی ہے۔ شاید یہ تہذیب اپنا دَور پُورا کر چکی ہے۔

شاید آج کا انسان کسی مستقبل کی امید سے نا آشنا ہے۔ مایوسی مقدر بن چکی ہے۔ ایک دَور ختم ہو رہا ہے۔ دوسرا دَور ابھی پیدا نہیں ہوا۔ یہ عرصہ، عرصۂ تنہائی ہے۔ ہم برزخ سے گزر رہے ہیں۔

ہمارے پاس آسائشیں ہیں' سکون نہیں۔ ہمارے پاس مال ہے، اطمینان نہیں۔ ہم سب ساتھ ساتھ چل رہے ہیں' لیکن منزلیں جدا جدا ہیں۔ ہم ہجوم میں ہیں' لیکن ہجوم سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہم سب آس پاس ہیں۔ ہم ایک دوسرے کا غم سنتے ہیں' لیکن محسوس نہیں کرتے۔ ہم اپنے علاوہ کسی کو اپنے جیسا نہیں سمجھتے۔

ہمیں اپنے آنسو مقدس نظر آتے ہیں' لیکن دوسروں کی آنکھ سے ٹپکنے والے آنسو ہمیں مگرمچھ کے آنسو نظر آتے ہیں۔

ہم نے تفکر و تدبّر چھوڑ دیا ہے۔ ہم اپنے علم پر نازاں ہیں۔ ہم اپنی آواز پر مسحور ہوتے ہیں۔ اپنے افکار پر مست ہوتے ہیں۔ اپنے لیے جو پسند کرتے ہیں' دوسروں کے لیے وہ چیز پسند نہیں کرتے۔ اس خوفناک جُرم کی خوفناک سزا یہی ہے کہ ہم اپنے اندر تنہا ہیں۔ ہم دوسروں کی نگاہ میں بلند ہونے کی خواہش میں اپنی نگاہ سے گرتے جا رہے ہیں۔ ہمارا وجود ہمارے اپنے لیے بوجھ بن گیا ہے۔ ہماری آواز، ہماری مصروفیت' ہماری تگ و تاز تنہائی کی اذیت سے بچنے کے لیے ہے اور یہ تنہائی ہمارے گرد جال بُنتی جا رہی ہے' جسے توڑنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

دیوتا بننے کی خواہش میں ہم انسان ہی نہ رہے۔ ہم اذیت میں ہیں۔ ہم اپنے گھروں میں مہمان

کی طرح رہ رہے ہیں، اپنے دیس میں غریب الدیار ہیں۔ ہم آج کی تہذیب ہیں۔ سہمی ہوئی تنہائی ـــــ صحرا کی شام اور تنہا مسافر ـــــ اپنی آواز سے خوف پیدا ہوتا ہے۔ اپنے وجود سے ڈر لگتا ہے ـــــ یادِ ماضی خوفزدہ کرتی ہے اور مستقبل ـــــ ایک اور تنہائی!

ہماری تنہائی پر رحم فرما میرے مولا ـــــ ہمیں انسان آشنا کر ـــــ ہمیں انسانوں کی قدر کرنا سکھا۔ ہمیں انسانوں سے محبت کرنا سکھا۔ ہمیں انسانوں کی خدمت کرنا سکھا۔ ہمیں پہچان عطا فرما۔ ہمیں زندگی کی عزت کرنا سکھا۔ ہمیں ہمارے غرور سے بچا۔ ہمیں ہماری ذات سے نجات دے۔ ہمیں عاقبت سے غافل نہ کر۔ ہمیں وفا سکھا۔ وفا تنہا نہیں ہوتی۔ ہمیں صداقتِ فکر دے۔ صداقتِ ذکر دے۔

ہم پر عظمتِ انسان آشکار کر ـــــ کہ یہی ایک راستہ ہے "تنہائی" کے کرب سے نجات کا ـــــ اے مالک! ہمیں ایک دوسرے پر بھروسہ کرنا سکھا۔ ہمارے باطن سے شکوک و شبہات دور کر۔ ہماری تنہائیوں کو آباد کر، محبت سے۔ ہمیں ایک عقیدہ دیا ہے، تو ایک منزل عطا فرما ـــــ ایک سفر، ایک منزل، ایک وحدت۔



قطعہ

اپنی محفل میں مجھے بلوا کے دیکھ
یا مری تنہائیوں میں آ کے دیکھ
میں تری تاریخ ہوں مجھ کو نہ چھوڑ
بھولنے والے مجھے دہرا کے دیکھ

ہر شے مُسافر

کہنے کو دو قدم کا فاصلہ ہے۔ لیکن عُمر کٹ جاتی ہے فاصلہ نہیں کٹتا۔ ہم چل رہے ہیں مسلسل۔ صبح کو چلتے ہیں، شام کو چلتے ہیں، خوابوں میں سفر کرتے ہیں۔ ہم ہی کیا، ہمارے ساتھ راستے بھی سفر میں ہیں۔ منزل ملے، تو منزل سفر میں ہوتی ہے۔ یہ کائنات بھی مسافر ہے۔ ہر شے راہی ہے۔ ہر شے سفر میں ہے۔ نامعلوم سفر، بے خبر مسافر، ناآشنا منزلیں۔

کوئی وجود ہمیشہ ایک جگہ موجود نہیں رہ سکتا۔ سفر ہی سفر ہے۔ سفر کا آغاز سفر سے ہوا اور سفر کا انجام ایک نئے سفر سے ہو گا۔ مسافرت بے بس ہے، مسافت کے سامنے۔

صدیوں اور قرنوں سے یہ سفر جاری ہے۔ یہ سفر کٹ نہیں سکتا، جیسے کسی کی نگاہ سے گزر کر رسائی کا سفر طے نہیں ہو سکتا، کبھی نہیں۔ یہ سفر بے جہت و بے سمت ہے، بلکہ لامحدود جہت و لامحدود سمت کا سفر ہے، کیسے کٹے۔

ہمارے ساتھ کائنات چل رہی ہے۔ سورج، چاند، ستارے، سیارے، کہکشائیں، نظامہائے شمسی، بلکہ خلائیں اس سفر میں شریک ہیں۔ سب کے سب گردش میں ہیں۔ جمیل و جسیم سیارے۔ مدار خود متحرک ہیں۔ گردش در گردش، حرکت در حرکت، سفر در سفر جاری ہے۔ لمحات سفر میں ہیں۔ وقت ہمہ وقت سفر میں ہے۔ کیا ہم لوگ گھر میں غریب الدّیار ہیں۔ ؟ ہمیں کہاں جانا ہے ؟ ہم کہاں سے آئے ہیں ؟ خیال بدل جاتا ہے۔ خیال رخصت ہو جاتا ہے۔ سانس سفر میں ہے۔ آتا ہے، جاتا ہے۔ رگوں میں شریانوں میں خون مسافر ہے۔ نظر مسافر ہے۔ منظر اور پس منظر مسافر ہیں۔

یہ سب کیا ہے ؟ کیوں ہے ؟ کب سے ہے ؟ کب تک ہے ؟

ہم بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں۔ اپنا بوجھ، دوسروں کا وزن، آخر کہاں جانا ہے ہمیں، ہمیں اتنا معلوم ہے کہ ہم جلدی میں ہیں۔ ہم تیزی میں ہیں۔ ہم عجلت میں ہیں۔ ہمیں فوراً جانا ہے لیکن کہاں؟ بس یہی تو معلوم نہیں۔ ہم بہت مصروف ہیں۔ سفر ضروری ہے، مقصد سفر سے آگہی ضروری نہیں ہے۔

ہم سوچ رہے ہیں کہ آخر ہمیں کیا کرنا ہے۔ سفر سے کیا حاصل ہے۔ سفر مسافروں کو کھا رہا ہے۔ راستہ راہ نوردوں کو نگل جاتا ہے۔ منزلیں راستوں کو نگل جاتی ہیں اور خود راستہ بھول جاتی ہیں۔ معلوم نہیں کس نے ہمیں گردشیں، بلکہ غلام گردشیں دی ہیں۔ سفر پر روانہ کرنے والی فطرت ہم سے کیا چاہتی ہے۔ ہم بیچارے دے ہی کیا سکتے ہیں۔ محدود کا لامحدود سفر کیا رنگ لائے گا۔

پرندے اُڑتے ہی چلے جاتے ہیں، فضائیں ختم نہیں ہوتیں۔ مچھلیاں تیرتی ہی چلی جاتی ہیں، سمندر ختم نہیں ہوتا۔ یہ سفر کب سے ہے۔ نہ ابتدا کی خبر ہے۔ نہ انتہا کا پتہ۔ قطرے قلزم بنتے جاتے ہیں اور قلزم قطروں میں بٹتا جاتا ہے، لیکن کسی کو کچھ خبر نہیں۔

بسیں، گاڑیاں، خلائی اور فضائی گاڑیاں، جہاز، ہوائی اور بحری سب متحرک ہیں۔ لوگ آ رہے ہیں جا رہے ہیں۔ آنسوؤں سے الوداع ہے، خوشی کے ساتھ خوش آمدید ہے۔ جانے والے بھی مسافر اور بھیجنے والے بھی مسافر، سب مسافر ہیں، آہستہ چلنے والے، تیز چلنے والے، ہمیشہ سفر ہی سفر۔

ایک نے دوسرے کا سامان چھین لیا۔ اسے اٹھایا، لے بھاگا اور کچھ دُور جا کر وہ سامان پھینک دیا اور خود کسی نامعلوم سفر پر خالی ہاتھ روانہ ہو گیا۔ اس نے سامان پھینکنا تھا، تو چھینا ہی کیوں؟ زمینوں کو۔ ملکوں کو۔ جاگیروں کو فتح کرنے والے تیز رفتار شہسوار آخر زمین کی پہنائیوں میں غائب ہو گئے، خاموش ہو گئے۔ فراموش ہو گئے۔ ایسے جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔

کارواں در کارواں لوگ آتے۔ اس زمین پر بڑے عمل کرتے رہے۔ بڑی محنتیں کرتے رہے۔ ایک دوسرے کو ہلاک کرتے رہے لیکن پھر وہی سکوت، وہی بے مائیگی، وہی بے نشان منزلیں، وہی گمنام انجام۔ یہ ناموری کیا ہے؟ یہ غرور و افتخار کیا ہے؟ یہ تاج و کلاہ کیا ہے؟ یہ لشکر و سپاہ کیا ہے؟ یہ

حرکتِ وجود کیا ہے؟ یہ مستقل عذاب مسافرت کیا ہے؟ ہر دل میں بھونچال ہے۔ ہر شخص بھاگ رہا ہے۔ شاہ و گدا بھاگ رہے ہیں۔ شاید خطرہ ہے۔ کس کو کس سے خطرہ ہے؟ زندگی کو خطرہ ہے؟ کس کا؟ موت کا خطرہ؟ زندگی ختم ہو رہی ہے۔ لیکن زندگی تو ختم نہیں ہوتی۔ ہم مر جاتے ہیں۔ ہم کب سے مر رہے ہیں لیکن ہم زندہ ہیں۔ کب تک زندہ ہیں؟ یہی تو معلوم نہیں۔ اسے معلوم کرنے کے لیے ہم بھاگ رہے ہیں۔ موت کے ڈر سے نہیں، راز جاننے کے لیے کہ یہ سب کیا ہے؟

ہم خواہشات اور بے معنی خواہشات کی خوبصورت تتلیاں پکڑنے نکلے ہیں۔ تتلیاں اُڑ جاتی ہیں اور ہم بچھڑ جاتے ہیں ایک دوسرے سے۔ ہم ویرانیوں میں کھو جاتے ہیں۔ تتلیاں واہمہ ہیں۔ کبھی ہم ماضی کی طرف بھاگتے ہیں کبھی مستقبل کی طرف۔ کبھی ہم اپنے اندر کو دوڑتے ہیں، کبھی ہم اپنے سے فرار کرتے ہیں اور خلاؤں کی تسخیر کو نکل جاتے ہیں۔

ہم جو کچھ حاصل کرتے ہیں، اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ تمنا، نیا حاصل، نئی آرزو، نئی منزل، نیا انتشار ہمارا مقدر ہے۔ یہ مقدر کیا ہے؟ مقدر کی چابک ہمیں ہانک رہی ہے۔ ہم خوف اور شوق کے درمیان رہتے ہیں۔ یہی چکّی ہمیں پیس رہی ہے۔ شوق حاصل نہیں ہوتا۔ خوف نظر نہیں آتا۔ بس ہم دوڑتے ہیں۔ سفر کرتے ہیں۔ واپسی کا وعدہ کر کے ہم رخصت ہوتے ہیں۔ واپس آنا ہے تو جانا ہی کیوں ہے۔ ہم ایک دوسرے کو انتظار کی منزل عطا کرتے ہیں۔ انتظار اُس فاصلے کا نام ہے جس کے کٹ جانے کی اُمید ہو، لیکن جو کبھی نہ کٹے۔ یہ فاصلے ہم نے خود پیدا کیے ہیں۔ ہم ایسے سفر میں مبتلا ہیں، جو انجام سے بے نیاز ہے۔ ایک موہوم اُمّید ہے کہ شاید اگلے موڑ پر ہم سب کچھ جان لیں، لیکن سانس کا سفر ختم ہو جاتا ہے، آس کا سفر باقی رہتا ہے۔ ہم نے سوچنا چھوڑ دیا۔ بس دوڑ لگا رہے ہیں، میراتھان دوڑ... MARATHON RACE جس میں سارا زمانہ شریک ہے۔ کب سے یہ دوڑ جاری ہے۔

میں اپنے پیشرو کی کرسی کا مالک ہوں اور میرے بعد آنے والا میری کرسی کے انتظار میں ہے۔ کرسی نشین غائب ہو جاتے ہیں اور کرسیاں خالی رہتی ہیں۔ لیڈر مر جاتے ہیں، قومیں

زندہ رہتی ہیں۔ لیکن کب تک؟ پرانی قومیں، پرانے لیڈر، پرانی تہذیب، پرانی آبادیاں، کہاں ہیں؟ تاریخ میں؟

ہم سب پرانے ہونے والے ہیں۔ ہم یادیں لے کر چلے ہیں اور یادیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ ہر پُرانی تہذیب اپنے زمانے میں نئی تھی اور ہر نئی تہذیب آنے والے دَور کی پرانی تہذیب ہے۔ پرانے مکان اور نئے مکان ایک ہی مکان ہیں۔ پرانے غم اور نئے غم ایک جیسے ہیں۔ پرانے آنسو اور نئے آنسو یکساں ہیں۔ پرانا سفر اور نیا سفر ایک ہی سفر ہے۔ پرانی منزل اور نئی منزل ایک ہی منزل ہے۔ پرانا انسان اور نیا انسان ایک ہی انسان ہے۔ پرانے زمانے اور نئے زمانے ایک ہی شے کے نام ہیں۔ سورج وہی، سورج کی روشنی وہی، چاند وہی اور چاندنی وہی، سفر وہی انجام وہی، لیکن ہر شے بدل گئی ہے۔ سب کچھ بدل گیا۔ کون کہتا ہے کہ سب کچھ بدل گیا؟

سفر ختم نہیں ہوتا۔ تبدیلی اور تغیر بدلتے نہیں۔ مسافر کی انا قائم ہے۔ انسان سفر کا راز معلوم کرنا چاہتا ہے۔ مسافر اپنی بے بسی پر غور کرتا ہے۔ مجبوریوں کا جائزہ لیتا ہے۔ لیکن سفر ترک نہیں کرتا۔ انسان سمندر کی اتھاہ گہرائیوں سے اپنے سفر کا راز پوچھتا ہے۔ اسے موتی ملتے ہیں۔ سوال کا انعام ملتا ہے، لیکن جواب نہیں ملتا۔ وہ پہاڑوں سے پوچھتا ہے۔ دیو ہیکل گنگے پہاڑ انسان کے سوال پر روتے ہیں۔ دریا آنسو بہاتے ہیں۔ ہوائیں چیختی ہیں کہ اس سوال کو ترک کر دو۔ اس کا جواب نہیں ہے۔ انسان خلا سے پوچھنے چلا ہے کہ یہ سفر کیا ہے؟ خلا وسیع ہے۔ انسان کی بات خلاؤں میں گم ہو جاتی ہے۔ سوال قائم ہے، جواب ندارد۔

مسافر مایوس نہیں ہوتا۔ وہ راستے سے پوچھتا ہے، لیکن راستہ اس کے سوال کو رستہ نہیں دیتا۔ وہ منزلوں کو پکارتا ہے۔ منزلیں اس کی ہم سفر ہو جاتی ہیں، لیکن اس سوال کا جواب نہیں دیتیں۔ مسافر ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں اور روتے ہیں کہ راستہ گم ہو گیا ہے۔ راستہ ساتھ ہی چل رہا ہے، مسافر بے خبر ہیں۔

مسافر فریاد کرتا ہے" اے وہ کہ جس نے مجھے لمبے سفروں پر گامزن کیا ہے' جس نے مجھے یہ ختم ہونے والی تلاش دی ہے۔ تلاش کا مقصد تو بتا دے"۔ لیکن سناٹا ہے۔ کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ سفر جاری رہتا ہے۔ قافلے تھک جاتے ہیں' لیکن سفر جاری رہتا ہے۔ اس سفر میں کوئی کسی کا ہمدرد نہیں۔ لاغر وجود کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور سفر جاری رہتا ہے۔ زمین سے چشمے اُبلتے رہتے ہیں اور آنسو نکلتے رہتے ہیں۔ یہ سفر بڑا طویل اور بڑا مختصر ہے۔ دو قدم کا فاصلہ ہے اور عمر بھر طے کرنا ہے' یہ فاصلہ ہونے اور نہ ہونے کے درمیان ہی سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ ہم اپنے بچوں کے پاس رہتے ہیں اور پھر اپنے بزرگوں کے پاس چلے جاتے ہیں۔ ہم جن کو رخصت کرتے ہیں' وہی تو ہمارا استقبال کریں گے۔ یہ سب حیران کن بات ہے۔ اگر یہی کچھ ہے تو یہ ہنگامۂ سُود و زیاں کیا ہے؟ یہ سب رفتار کیا ہے؟ یہ ترقی و ارتقاء کیا ہے؟ یہ علم و ادب کیا ہے؟ یہ جاہ طلبی و منصب پسندی کیا ہے؟ یہ حاصل و محرومی کیا ہے؟ یہ خیر و شر کے معرکے کیا ہیں؟ یہ گرمیٔ رخسار و گرمیٔ بازار کیا ہے؟ انسان پوچھتا ہے' سوچتا ہے' تڑپتا ہے' جاگتا ہے' روتا ہے' اپنے سوال کا جواب مانگتا ہے۔ سفر پر بھیجنے والا نہ ملے تو جواب دینے والا کہاں سے ملے گا۔

سوچنے والی بات یہ نہیں کہ یہ سفر کیا ہے' اس کا انجام کیا ہے۔ سوچنے والی بات تو یہ ہے کہ کون ہے جس نے مجھے مسافر بنایا؟ کون ہے جو میرے ساتھ چل رہا ہے؟ کون ہے جو مجھے بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے تک لاتا ہے؟ کون ہے جس نے مجھے ذوقِ آگہی دیا؟ کون ہے جو مجھے پکارتا ہے؟ اور کون ہے جسے میں پکارتا ہوں؟ منزلوں سے صدا دینے والا ہی منزلوں پر روانہ کرنے والا ہے۔ وہی سفر دیتا ہے' وہی شریکِ سفر ہے' وہی منزل ہے' وہی نشانِ منزل۔ میرے سفر سے پہلے بھی وہی تھا اور میرے بعد بھی وہی ہوگا۔

میرے سوال کا جواب دماغ کے پاس نہیں ہے۔ دماغ بتا سکتا ہے کہ یہ سب کیا ہے' لیکن دل بتاتا ہے کہ یہ سب کیوں ہے اور ایمان بتاتا ہے کہ یہ سب کس نے بنایا۔ سوال کے عذاب سے بچنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ ہم اُس طاقت اور اُس ذات پر ایمان لائیں جس نے پہاڑوں کو

استقامت دی اور دریا کو روانی۔ وہ جو بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور زمین سے پودے اگاتا ہے۔ وہ جس نے سورج کو منور کیا اور رات کو تاریکی دی۔ وہ جس نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے قائم رکھا اور جس نے پرندوں کو پرواز دی۔ وہ جس نے مجھے پیدا فرمایا، اسی نے مجھے گویائی اور بینائی دی۔ وہ کون ہے؟ بس وہی تو ہے۔ سوال بھی وہی، جواب بھی وہی۔ میرا ہونا اسی کے حکم سے اور میرا نہ ہونا اسی کی مرضی سے۔ وہ جو بھی ہے' اس کے لیے سجدہ ہے۔ !تسلیم کا اور تعظیم کا !!



انسان دوسرے کی دولت کو دیکھ کر اپنے حالات پر اس قدر شرمندہ کیوں ہوتا ہے؟ یہ تقسیم تقدیر ہے۔ ہمارے لیے ہمارے ماں باپ ہی باعثِ تکریم ہیں۔ ہماری پہچان ہمارا اپنا چہرہ ہے۔ ہماری عاقبت ہمارے اپنے دین میں ہے۔ اسی طرح ہماری خوشیاں ہمارے اپنے حالات اور اپنے ماحول میں ہیں۔ مور کو مور کا سقدر ملا، کوّے کو کوّے کا۔ ہم یہ نہیں پہچان سکتے کہ فلاں کے ساتھ ایسا کیوں اور ہمارے ساتھ ویسا کیوں ہوا۔ موسیٰ علیہ السّلام نے اللہ سے پوچھا "اے رب العالمین آپ نے چھپکلی کو کیوں پیدا فرمایا؟" اللہ نے جواب دیا "عجیب بات ہے' ابھی ابھی چھپکلی پوچھ رہی تھی کہ" اے رب! تم نے موسیٰ کو آخر کیوں پیدا کیا؟" بات وہی ہے کہ انسان اپنے نصیب پر راضی رہے تو اطمینان حاصل کرے گا۔ نصیب میں تقابلی جائزہ ناجائز ہے۔

انتظار

خواہش اور حصول کے درمیانی فاصلے کو انتظار کہہ سکتے ہیں۔ یہ بھی کہنا درست ہے کہ تمنا ہی انتظار پیدا کرتی ہے۔ جس دل میں تمنا نہ ہو، اسے انتظار کے کرب سے گزرنے کا تجربہ نہیں ہو سکتا۔ چونکہ کوئی انسان تمنا سے آزاد نہیں، اس لیے کوئی انسان انتظار سے نجات نہیں پا سکتا۔

ہم سب انتظار میں ہیں۔ ہر انسان کو کسی نہ کسی شے کا انتظار ہے۔ کسی نہ کسی سے ملنے کا انتظار ہوتا ہے۔ کسی واقعہ کا انتظار ہوتا ہے۔ انتظار تاریکی میں روشنی کا سفر طے کرتا رہتا ہے۔ شبِ فراق صبحِ اُمّید کے انتظار میں کٹتی رہتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے بلکہ عین ممکن ہے کہ زندگی کٹ جائے اور شبِ انتظار نہ کٹے۔

دیکھی ہوئی صُورت کو دوبارہ دیکھنے کی آرزو انتظار کی بیتا بیوں سے گزرتی ہے۔ آرزو ممکن ہو یا ناممکن، انتظار، آرزو کا مقدر ہے۔ انتظار ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس سے گریز ممکن نہیں ہے۔

ہر عمل اپنے نتیجے کے انتظار میں ہوتا ہے۔ عمل نہ ہو، تو ارادہ ہی انتظار میں داخل کر دیتا ہے۔ ہمارے ارادے، ہماری آرزوئیں، ہماری تمنائیں، ہمارے عزائم اپنے نتائج کی خوب صُورت شکل دیکھنے کو ترستے ہیں۔ اسی کا نام انتظار ہے۔

نیک انسان اپنے اعمال کا انعام حاصل کرنے کے لیے منتظر رہتے ہیں اور برے آدمی اپنی بُرائی کی عبرت سے بچنے کا انتظار کرتے ہیں۔ جو انسان کسی عاقبت کا قائل نہیں، اس کے لیے اللہ کریم کا ارشاد ہے کہ "تم ایک فیصلے کے دن کا انتظار کرو اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔"

محبت کی تمام عمر انتظار کی حدت اور شدّت سے گزرتی ہے۔ انتظار ہی قلوب کو گلنار کرتا ہے۔

ہم اپنے انداز سے ہی اپنے انتظار کی منزل طے کرتے ہیں۔ کچھ لوگ انتظار سے بڑے اضطراب میں گزرتے ہیں۔ وہ روتے ہیں، بلکتے ہیں، کراہتے ہیں، گنگناتے ہیں، تارے گنتے ہیں اور یادوں کے چراغ روشن کرتے ہیں۔ وہ دیارِ جاں میں جشنِ آرزو منانے کے لیے اشکوں سے چراغاں کرتے ہیں۔ جانے والوں کو صحرائے طلب میں ڈھونڈتے ہیں۔ نہ سننے والے کو پکارتے ہیں۔ نہ نظر آنے والوں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ خاموش تصاویر کی آوازیں سنتے ہیں اور اپنی شبِ تنہائی میں اپنے علاوہ وجُود کو بھی موجُود پاتے ہیں۔ ان کا خیال متجسم ہوتا ہے۔ ان کو ماضی کے ہم سفر، مستقبل کی مسافرت میں شامل نظر آتے ہیں۔ یہ واہمہ انہیں حقیقت نظر آتا ہے۔ اس طرح انتظار کے زمانے طلسمات کے زمانے بن جاتے ہیں۔

انسان کو اپنا عہدِ انتظار عہدِ جنوں نظر آتا ہے۔ انتظار کا دَور اذیت کا دَور ہے لیکن صاحبِ انتظار کو اس دَور میں عجیب لذت سے آشنائی ہوتی ہے۔ اس کو اپنے ظاہر سے باطن کا سفر نصیب ہوتا ہے۔ وہ تن کی دنیا سے نکل کر من کی دنیا میں ڈوبتا ہے اور پھر ڈوبتا ہی چلا جاتا ہے اور جب وہ آشنائے راز ہوتا ہے تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں ہوتی کہ کس واقعہ نے اسے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ جانے والا اسے کیا دے گیا۔ آئینہ ٹوٹا تو کیا طلسمات پیدا ہو گئے۔ آنسوؤں نے کیا تنویر پیدا کر دی۔ دل کے داغ، چراغ بن گئے۔ حسرت، سرفراز ہو گئی۔ محرومی سیراب ہو گئی۔ ایک کی تمنّا اپنی تمنا بن کر سب کی تمنّا بن گئی۔ انسان کی یاد ایک حد سے گزر جائے، تو یادِ حق بن جاتی ہے اور یہ حد، بے حد ہے۔ اس لیے حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ انتظار انسان کے ساتھ کیا کرے گا۔

انتظار پیدا کرنے والی کوئی بھی شے ہو، جب انتظار پیدا ہو جائے تو صاحبِ انتظار کے ساتھ اس کے ظرف کے مطابق واقعات شروع ہو جاتے ہیں۔

کچھ لوگ انتظار کی شدت سے تنگ آ کر چراغِ آرزو بجھا دیتے ہیں۔ وہ امید سے نکل کر مایوسی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی پر بھروسہ نہیں کرتے۔ انہیں اپنے نصیب پر بھی بھروسہ نہیں رہتا۔ وہ گلہ کرتے ہیں، شکایت کرتے ہیں، مایوسیاں پھیلاتے ہیں۔ انہیں شبِ فرقت کی تاریکی

تو نظر آتی ہے اپنے دل کا نور نہیں نظر آتا۔ وہ جس خوبی کا انتظار کرتے ہیں اسے نا خوب کہنے لگ جاتے ہیں۔ وہ اپنے جدا ہونے والے محبوب کو کوسنا شروع کرتے ہیں اور اس طرح اپنی شب انتظار کو کم نصیبی سمجھ کر بے حس اور جامد ہو جاتے ہیں۔ ظاہر سے محروم ہو کر وہ باطن سے بھی محروم ہو جاتے ہیں اور اس طرح بربادی دل بربادئی ہستی بن کر انہیں تباہی کی منزل تک لاتی ہے۔

جس شخص میں ایثار نہ ہو اسے انتظار تباہ کر دیتا ہے۔ جس انسان میں عفو و درگزر نہ ہو اسے انتظار ہلاک کر دیتا ہے۔ اگر تمنا ہوس پرستی بن جائے، تو انتظار عذاب ہے۔

اگر تمنا لطیف رہے تو انتظار کیف کی منازل طے کراتا ہے۔ انتظار ایک طاقتور منہ زور گھوڑے کی طرح ہے۔ اگر سوار کمزور ہو تو گر کر مر جائے گا اور اگر سوار شہسوار ہو تو آسودۂ منزل ہو گا۔

انتظار کا دائرہ محبت کی دنیا تک ہی نہیں اس کے علاوہ بھی ہے۔ ہر وجود انتظار کرتا ہے۔ ہر ذی نفس انتظار میں ہے۔ ہر موسم آنے والے موسم کے انتظار میں ہے۔ ہر دور آنے والے دور کا منتظر ہے۔ ہم سب اپنے جانشینوں کا انتظار کرتے ہیں۔ حکمران آنے والی حکومتوں کے انتظار میں اپنا وقت پورا کرتے ہیں۔ محنتی انسان اپنی محنت کے معاوضے کا منتظر ہے۔ نوکر پیشہ لوگ تنخواہ کے دن کا انتظار کرتے ہیں اور اس انتظار میں مہینہ گزارنے کے عذاب کو انتظار کہتے ہیں۔

آج کے ایک مہذب انسان کی زندگی صبح سے شام تک انتظار کے مختلف مراحل طے کرتی ہے۔ اخبار میں اپنی پسند کی خبروں کا انتظار، دفتروں میں خوشگوار واقعات کا انتظار، ترقی کا انتظار، کھانے پینے کا انتظار اور پھر شومئی قسمت نیند کا انتظار۔

آج کے انسان کو نیند کی دولت بہت کم ملی ہے۔ بہت انتظار کرنا پڑتا ہے سکون دینے والی نیند نہ جانے کہاں چلی گئی۔ آج کل تو سکون دینے والی گولیاں ملتی ہیں۔ عذاب ہے، قیامت ہے۔ نیند تو محنت کا حق ہے، لیکن آج یہ حق دوائی کے بغیر نہیں ملتا۔ یا الٰہی! یہ سب کیوں ہے؟

بہرحال انتظار انسان کو گھن کی طرح کھا رہا ہے۔ دل اور غم ایک دوسرے کو مل جل کر کھا رہے ہیں اور یوں انتظار کے زمانے گزرتے جا رہے ہیں۔

آج کا انسان بھول گیا ہے کہ ہر انتظار کے بعد ایک نیا انتظار ہے۔ ہم اپنے حال کو مستقبل کا انتظار کہہ سکتے ہیں۔ یہ مستقبل ایک حد تک تو ہمیں قبول ہے، لیکن اس کے بعد کا مستقبل یعنی مابعد کا "مستقبل" ہماری زندگی اور ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ ہم یہ نہیں سُن سکتے کہ بڑھاپا جوانی کے انتظار میں ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جوانی بڑھاپے کے انتظار کا نام ہے۔ ہم یہ سننے کو تیار نہیں کہ موت زندگی کے انتظار میں ہے۔ ہم یہ ماننے کو تیار نہیں کہ زندگی موت کے انتظار کا دوسرا نام ہے۔

○

عاجزی اور کمینگی میں بڑا فرق ہے۔ کسرِ نفسی کو تحقیرِ ذات تک نہ پہنچاؤ!!

○

کبھی کبھی مظلوم کا آنسو ظالم کی تلوار سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے!

○

طوفانوں کی طاقت سب کشتیوں کو نہیں ڈبو سکتی!

○

انسانی عقل و خرد کی تمام طاقتیں مکڑی کے کمزور جالے کے سامنے بے بس ہیں۔

کامیابی

کامیابی ایک خوب صورت تتلی ہے: جس کے تعاقب میں انسان بہت دور نکل جاتا ہے۔ اپنوں سے دُور، اپنی حقیقت سے دُور، اپنی بساط سے باہر، اپنے جامے سے نکل جاتا ہے۔ اکثر اوقات وہ کامیابی کی سرمستی میں اپنی عاقبت برباد کر دیتا ہے۔

کامیابی ایک کھلونا ہے، جس کے حصول کا عمل انسان سے منزل کا شعور چھین لیتا ہے۔ اس میں کوئی الجھاؤ نہیں، کوئی ابہام نہیں۔ ہم ایک خواہش کے حصول کو کامیابی کہتے ہیں اور اس کامیابی کے ساتھ ہی دوسری خواہشات دم توڑتی ہیں اور یہ کامیاب خواہش اکثر و بیشتر خواہشِ نفس کے سوا کچھ اور نہیں ہوتی۔

ایک محنت کرنے والا انسان کامیابی کی خاطر محنت کرتا ہے۔ دنیا میں مختلف قسم کی محنتیں ہیں، اس لیے مختلف قسم کی کامیابیاں ہیں۔ بُرے مقاصد کے لیے محنت اگر کامیاب بھی ہو جائے، تو بھی ناکام ہے۔ اس کے برعکس اچھے مقصد کی محنت اگر ناکام رہے، تو بھی کامیاب ہے۔ کامیابی کا حصول اتنا اہم نہیں، جتنا مقصد کا انتخاب ہے۔

چیونٹی صبح سے شام تک محنت کرتی ہے اور اس کی کامیابی یہ ہے کہ خاکِ راہ سے رزق مل جائے۔ گِدھ کی کامیابی یہ ہے کہ اس کی پرواز مردار کا راستہ دکھائے۔ مکڑی جالا بُنتی ہے۔ کتنا خوب صُورت، ایک ماہر ریاضی دان اور انجینئر کی طرح۔ اُس کا مقصد کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا مقصد جالا نہیں، مکھی ہے۔ وہ مکھی پکڑنے کے لیے خوب صُورت جالا بُنتی ہے اور یہ اس کی کامیابی ہے۔

کامیابی کے گلیمر کے پیچھے انسان کی اصل خواہش چھپی ہوتی ہے۔ اس خواہش کا بغور مطالعہ کیا جائے، تو کامیابی کا اصل مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے۔

کامیابی کی تعریف کرنا مشکل ہے۔ آج کل کامیابی ایک مقابلہ ہے۔ اپنے ماحول میں اپنے سماجی معیار کے مطابق سبقت لے جانے کو کامیابی کہتے ہیں۔ کامیاب انسان اُسے کہتے ہیں، جو اپنے گرد و پیش کے انسانوں میں نمایاں ہو، ممتاز ہو۔ سبقت لے جانے والا معزز کہلاتا ہے۔ کامیابی کا مدعا سبقت لے جانا ہے۔ شہرت حاصل کرنا ہے۔

اگر سماج کا اپنا کوئی اخلاقی معیار نہ ہو، تو کامیابی ایک خطرہ ہے۔ جھوٹوں میں شہرت حاصل کرنا بدنام ہونے کے مترادف ہے۔ اگر ماحول گندہ ہو تو کامیابی کی تمنا انسان کے لیے ایک خطرہ ہے

کامیابی کا سفر خود غرضی کا سفر ہے۔ یہ خطرے کا سفر ہے۔ خود غرضی نہ ہو، تو انسان کیسے کامیاب ہو۔ دولت جمع کرنے والے کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں، اگر وہ بے حس نہ ہوں۔ دولت تقسیم کرنے والا کبھی دولت جمع نہیں کرتا۔ کامیاب مہمان کامیاب میزبان نہیں بن سکتا۔ محبت کامیاب ہو تو شادی کامیاب نہیں ہوتی۔ بنک کا کام کرنے والا ٹورسٹ نہیں بن سکتا۔ کامیاب انجینئر، کامیاب ڈاکٹر اور کامیاب وکیل کی زندگیوں میں بڑا فرق ہے۔ ہر کامیاب آدمی دوسرے کو ناکام سمجھتا ہے اور یہی ناکامی کی دلیل ہے۔

دنیا میں موجود آدھا علم صرف نصیحت کا علم ہے۔ یعنی دوسروں کو ناکامی سے بچانے کا علم اور علم دینے والا علم کے حوالے سے ہی اپنے آپ کو کامیاب سمجھتا ہے۔ اس کی بات سننے والے اسے دیکھتے ہیں اور اس پر اتنا ہی تبصرہ کرتے ہیں کہ "بیچارے علم والے لوگ ہیں۔ ان کا سرمایہ الفاظ و معانی کا سرمایہ ہے اور بس"

کامیاب انسانوں نے ہی دنیا میں جھگڑا فساد قائم کر رکھا ہے۔ ایک انسان کامیاب کہانی نویس یا کامیاب داستان گو یا افسانہ نگار ہو تو اپنے آپ کو ہر شعبۂ حیات میں کامیاب سمجھتا ہے۔ وہ فرض کر لیتا ہے کہ اب وہ ڈرامہ، تنقید، معاشیات، سیاسیات، شاعری، الٰہیات غرضیکہ متفرقات پر قلم

اٹھانے کا حق رکھتا ہے۔ وہ جلسوں کی صدارتیں کرتا ہے۔ جلوسوں کی قیادت کرتا ہے۔ حکومتوں کے حق میں یا ان کے خلاف قرار دادیں پاس کرتا ہے۔ حالانکہ اس کی کامیابی صرف کہانی یا افسانہ کی کامیابی ہے۔

کم و بیش ہر کامیاب انسان اس خوشی میں مبتلا ہو کر اپنی کامیابی کو ہی اپنے لیے وبالِ جان بنا لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر آدمی ادیب بننے کا شوق رکھتا ہے اور بنتا ہے۔ ادیب کو سیاستدان کہلانے کا حق چاہیے، کیونکہ وہ شعر کہتا ہے۔ سیاستدان حکومتوں سے ناراض ہی رہتے ہیں جیسے یہاں کے محبوب ہوں اور حکومتیں اللہ کا نام لے کر اپنا کام جاری رکھتی ہیں۔ سب کامیاب ہیں اور سب ناکام۔

جب ہم اپنے لیے ایک اندازِ فکر کا انتخاب کرتے ہیں تو ہمیں دوسرے اندازہائے فکر پر اتھارٹی بننے سے گریز کرنا چاہیے۔ ایک کامیاب گلوکار کے لیے ضروری تو نہیں کہ وہ اپنے انداز سے ملک کا نام روشن کرے اور اپنے انداز سے مذہب پر بحث کرے اور یہ انداز صرف اندازہ ہی ہو۔

چونکہ ہماری زندگی شعبوں، پیشوں، دائروں اور زاویوں میں تقسیم ہو چکی ہے اس لیے کامیابی کا مفہوم اس دور میں اپنے پیشے اور اپنے شعبے میں کامیابی ہے اور یہ کامیابی اپنے دائرے سے باہر نکل آئے، تو ناکامی کے علاوہ کیا ہو سکتی ہے۔

ہماری ملکی سیاست میں اب ہر شعبۂ حیات سے قیادت ابھر کر باہر آ رہی ہے۔ اللہ رحم فرمائے۔ ہمارا ملک قیادت کے بحران میں بھی کثیر القیادت رہے گا۔ قیادتوں کی کثرت قیادت کی عدم موجودگی کی دلیل ہے۔

کامیابی میں بڑے اندیشے ہوتے ہیں۔ کامیاب مسکراہٹ میں بڑے آنسو پنہاں ہوتے ہیں۔ کامیاب فاتح آخر ایک قاتل ہی ہوتا ہے۔ ہلاکو ہو یا سکندرِ اعظم، کام ایک ہی ہے اور غالباً انجام بھی ایک ہی ہے۔ دنیا کو فتح کرنا اور خالی ہاتھ گھر سے باہر پردیس میں مرنا کامیابی کا المیہ ہے۔ اجتماعی یا گروہی کامیابی میں کم خطرات ہیں۔ مقصد کا حصول قوموں کو عروج دیتا ہے، لیکن انفرادی کامیابی انسان کو اپنی ذات کے خول میں بند کر دیتی ہے اور بعض اوقات انسان اپنی کامیابی کے لیے وہ عظیم مقاصد ترک کر دیتا ہے، جن کو اپنی کامیابی کے جواز کے لیے پیش کرتا ہے۔ مثلاً

ایک کامیاب ڈاکٹر کو لیں۔ ڈاکٹر کا مدعا اور اصل مدعا خدمتِ انسانیت ہے۔ مریضوں کی خدمت' دنیا سے بیماری کو کم کرنا اور اس طرح نیکی اور عبادت کو اپنی کامیابی کے جواز کے طور پر پیش کرنا، لیکن ایک کامیاب ڈاکٹر آہستہ آہستہ اپنی کامیابی کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اتنا بے بس ہو جاتا ہے کہ بے حس ہو جاتا ہے۔ وہ مریضوں سے فیس وصول کرتا ہے۔ نیکی کے بجائے مال کا معاوضہ اور یہ عمل اس حد تک بڑھتا ہے کہ عذاب کی صُورت اختیار کر لیتا ہے۔ میڈیکل سینٹروں کی تعداد میں اضافہ خدمتِ خلق کے بجائے طب کو انڈسٹری میں تبدیل کر چکا ہے۔ کامیابی کے دامن میں مسرتیں نہیں، حسرتیں ہوتی ہیں۔

کامیابی کا انجام اکثر اوقات اُس مقصد کے برعکس ہوتا ہے' جو کامیابی کی وجہ ہے! انسان لوگوں میں عزت حاصل کرنے کے لیے کامیابی چاہتا ہے۔ اگر عزت نہ ملے، تو۔ لوگ سکون حاصل کرنے کے لیے دولت' چاہتے ہیں۔ اگر سکون نہ ملا، تو۔

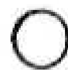
کامیابی ایک محدود دائرے تک ہی کامیابی کہلاتی ہے۔ اس سے ماورا یا اس کے علاوہ وہ تصوّر کارگر ہی نہیں ہوتا۔ ماحول بدل جائے، تو کامیابی کا تصوّر بدل جاتا ہے۔

محبت کی کامیابی اور محبت کی ناکامی میں چنداں فرق نہیں۔

محبت قائم رہے تو فراق بھی وصال ہے اور محبت نہ رہے تو وصال بھی فراق۔

کامیابی کے لیے اُس ماحول کا جائزہ ضروری ہے' جس نے کامیابی کو تسلیم کرنا ہے۔ اگر ماحول اور فرد کے معیار میں فرق ہو، تو کامیابی کا تصوّر ختم ہو جاتا ہے۔

دنیا کے عظیم رہنما وقت کے دیئے ہوئے معیار سے بلند ہوتے ہیں۔ وہ اپنا معیار خود بناتے ہیں۔ وہ کسی پہلے سے طے شُدہ اصول پر اپنی کامیابی کا انحصار نہیں کرتے۔



عمل

ہر انسان مصروفِ عمل ہے۔ عمل ہی شاید زندگی ہے۔ حکم ہے کہ انسان کو محنت کرنے والا بنایا گیا۔ انسان محنت کرنے پر مجبور ہے۔ ہمہ حال سرگرمِ عمل رہنے والا انسان اپنے عمل سے اپنی زندگی کو بہتر بنانے کا خواہاں ہے۔ انسان مقصد کے حصول کے لیے بھاگتا ہے اور بھاگتا ہی رہتا ہے۔ ایک مقصد کی تلاش مختلف مقاصد کی آرزو بن کر عمل کی معنویت کو بے معنی کر دیتی ہے۔

ہم اپنے عمل کو صحیح مانتے ہیں لیکن عمل کے نتائج کی ذمہ داری قبول نہیں کرتے۔ انسان عمل کی، کوشش کی، جدوجہد کی چکی تلے پستا جا رہا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ اس کے پاؤں اسے کہاں لے جا رہے ہیں۔ دفتر سے دفتر تک، آخر کب تک؟ زندگی میں عمل جاری ہے۔ کولہو کا بیل چل رہا ہے۔ چلتے چلتے عمر کٹ جاتی ہے اور فاصلہ طے نہیں ہوتا۔ ضرورتیں اور تقاضے بدلتے رہتے ہیں اور اس طرح عمل بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ انسان پلاننگ کرتا ہے مستقبل کی، روشن مستقبل کی، لیکن جب وہ مستقبل حال بنتا ہے، تو شاید اتنا روشن نہیں ہوتا۔ انسان اپنے عمل کو بدلتا ہے اور اس طرح ایک نئے دائرے میں داخل ہوتا ہے اور پھر وہی نتیجے اور پھر نیا عمل . . . . یوں زندگی کٹ جاتی ہے۔ انسان سوچتا ہے کہ آخر اس تگ و دو کا مقصد کیا تھا؟

ہمیں بچپن سے تعلیم دی جاتی ہے کہ محنت کرو۔ بڑے آدمی بنو . . . اس تعلیم کی وجہ سے انسان کوشش کرتا ہے۔ اپنے قد سے بڑا ہونے کی آرزو میں لوگ ہلاک ہوتے ہیں۔ کوشش اور مجاہدہ بہت کچھ دے سکتا ہے، لیکن ایک گدھے کو کوئی مجاہدہ گھوڑا نہیں بنا سکتا۔ ہر زندگی اپنی حدود میں مقید ہے۔ ہر انسان اپنے دائرۂ عمل میں رہن رکھ دیا گیا ہے۔ انسان پابند ہے، محدود

ہے۔ آرزو پابند نہیں' اس لیے محدود انسان کا لامحدود خواہشات کے لیے عمل کہیں نہ کہیں راستے میں دم توڑ دیتا ہے اور انسان مسلسل عمل کرنے کے باوجود خاطر خواہ نتیجہ حاصل نہیں کر سکتا۔

انسان شہرت کے لیے عمل کرتا ہے۔ ناموری کی آرزو نے بڑے بڑے قافلے لوٹے ہیں۔ ہم جب تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں' تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ لوگ بڑے نامور تھے' لیکن ہم غور نہیں کرتے کہ ایک نامور کے دور میں اس کے گرد و پیش لاکھوں غیر مشہور انسان بھی اسی قسم کے عمل میں مصروف تھے۔ بابر کی فتح ابراہیم لودھی کی شکست بھی ہے۔ ہم فتوحات کرنے والوں کو دیکھتے ہیں اور شکست کھانے والوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ہم نامور لوگوں جیسا عمل کرتے ہیں' لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ یکساں عمل دو انسانوں کے لیے یکساں نتائج نہیں مرتب کرتا۔ پیغمبروں جیسا عمل ہمیں پیغمبر نہیں بنا سکتا۔ میری کربلا' ہماری کربلا امام حسینؓ جیسی کربلا نہیں ہو سکتی۔ میں آج کے دور کا انسان خواہشاتِ نفس اور تقلید کے حصار میں ہوں۔ مجھے میرا عمل وہ نہیں دے سکتا' جو ہمارے پیشروؤں کو دے گیا۔ میں سقراط جیسا علم رکھنے کا عمل کروں' تو بھی سقراط نہیں بن سکتا۔ میرا عمل ان کے عمل کے برابر ہو' تو بھی میرا مقام ان کے مقامات سے مختلف رہے گا۔ یہی عمل کی خامی ہے اور یہی عمل کی خوبی بھی۔

غور کرنے والی بات ہے کہ ہم ایک نئے دور میں پیدا ہوئے اور ہمارا عمل تقلید کے علاوہ نہ ہو تو ہم پرانے دور کے نتائج کیسے حاصل کر سکتے ہیں اور پرانے دور کے نتائج کے حصول کی آرزو ہی کوتاہی فکر ہے۔ اگر فکر ہی صحیح نہ ہو' تو عمل کیسے صحت مند ہو سکتا ہے۔

جہاں اللہ کریم کا حکم ہے کہ انسان اپنی سعی سے ہی کچھ حاصل کرتا ہے' وہاں اس کے احکام کے اور رُخ بھی ہیں۔ عمل کا جذبہ بھی اس کی عطا ہے' اور پھر عمل کی راہ میں کتنے حادثات آتے ہیں۔ کتنے ہی واقعات ہیں۔ ہمارا عمل درست بھی ہو تو ممکن ہے کہ کسی اور کج رَو کا عمل ہمارے عمل کے نتیجے کو ختم کر دے۔ ہم تنہا زندگی بسر نہیں کر رہے۔ ہمارے ساتھ ایک زمانہ چل رہا ہے۔ ہر آدمی عمل کر رہا ہے۔ ہمارے عمل کی راہ میں دوسروں کے اعمال حائل ہوتے ہیں اور پھر نتیجہ

وہی رہتا ہے کہ ہم نتیجے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ طاقتور بادشاہوں کو کمزور عوام ایک جنبش میں اڑا کے رکھ دیتے ہیں۔ آج میرا عمل میرے پیشروؤں نے بھی مسدود کر رکھا ہے۔ قرآن و احادیث کے مقدس حوالوں تک ہی بات رہتی، تو مبارک تھی لیکن اب بات آگے نکل گئی ہے۔ امام غزالی سے لے کر حالی تک اور فقہاء سے لے کر ہمارے اپنے رفقاء تک ہر انسان صاحبِ ارشاد ہے اور ان کے ارشادات نے ہمارے عمل کی آزادی پر پہرے بٹھائے ہوئے ہیں۔ مجھے میرے عمل نے صرف تقلید سکھائی ہے۔ میری آزادی صرف میری خامشی ہے۔ امام غزالی کو غزالی بننے کے لیے کسی اور غزالی کی تقلید ضروری نہ تھی۔ سقراط، سقراط تھا، ہر چند کہ اس سے پہلے اور کوئی اس جیسا نہ تھا۔ تقلید کا عمل بے ثمر رہتا ہے۔

فطرت کو منظور نہیں کہ سب لوگ سقراط ہی بنتے جائیں۔ عمل اور شے ہے اور نصیب چیزے دگر۔ ایک راہ پر چلنے والے، ایک جیسا عمل کرنے والے، الگ الگ نصیب لے کر آتے ہیں۔ بے عملی مقصود نہیں صرف یہ وضاحت مراد ہے کہ اپنی حدود کو پہچانے بغیر عمل میں داخل ہونا ہلاکت کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ انسان ہزار محنت کرے، بغیر وجدان کے شاعر نہیں ہو سکتا اور جس کو وجدان عطا ہوا وہ محنت کے بغیر بھی شاعر ہے اور یہ وجدان محنت سے حاصل نہیں ہوتا۔ ہم نے تاریخ میں بادشاہوں کو کرب و اندیشے میں مبتلا دیکھا ہے۔ سکندرِ اعظم عظیم تھا، مگر بے وطن مرقد کا مسافر تھا۔ صاحبِ منزل بھی عمل کرتا ہے اور بھٹکا ہوا راہی بھی محنت کرتا ہے۔ ہمارا عمل گناہ اور ثواب مرتب کرتا ہے۔ ہمارا عمل ہمیں آسانیاں بھی عطا کرتا ہے اور دشواریاں بھی۔ گلاب گلاب ہے، عمل کرے یا نہ کرے۔ کانٹا کانٹا رہے گا، چاہے کتنی ہی محنت کرے۔ عظیم انسان فطرت کا عمل ہیں۔ ان کا اپنا عمل انہیں عظیم نہیں بناتا۔ پیغمبر بننے کا کوئی عمل نہیں۔ یہ منصب عطا ہے۔ امامت عمل سے نہیں نصیب سے ہے۔ ارشادِ ربانی ہے کہ "ہم جسے چاہتے ہیں مملکت دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں معزول و محروم کر دیتے ہیں۔" عمل بہانہ ہے، مقدر اٹل ہے۔ عقل اور نصیب نہ ہوں، تو عمل جہالت ہے۔ ریت میں ہل چلایا جائے، بیج بویا جائے اور اسے پانی کے بجائے چاہے خونِ دل ہی سے کیوں نہ سینچا جائے، وہاں کچھ نہ اُگے گا۔ عمل ہے لیکن نتیجہ نہیں ہے۔ عمل سے زندگی میں جنت اور جہنم حاصل ہونے کا دعویٰ ہے،

لیکن ہر عمل زندگی حاصل نہیں کرتا۔

ہر صاحبِ عمل جنت میں نہیں جاتا۔ ہر گناہ جہنم میں نہیں پہنچاتا۔ اس میں قدرت کا دخل ہے۔ اس مالک کا دخل ہے، جس نے بغیر کسی عمل کے مکھی کو شہد عطا کیا، جس نے سورج کو روشن بنایا، جس نے غریبوں کو شاہ اور شاہوں کو گدا بنایا۔ اس میں عمل شامل نہیں۔ وہی ذروں کو آفتاب بناتا ہے۔ محنت کو نتیجے عطا کرتا ہے۔ خوب صورت چہرہ بغیر کسی عمل کے حاصل ہوتا ہے۔ محبت بغیر کسی عمل کے حاصل ہوتی ہے اور پھر سکونِ قلب اس کی عطا ہے۔ اس کے حصول کا کوئی عمل نہیں۔

عمل سے غریبی دور نہیں ہوتی۔ غریب انسان کتنا عمل کرتا ہے۔ مزدور کتنی محنت کرتا ہے۔ ایک ہی دفتر میں تمام لوگ ایک جیسا ہی عمل کرتے ہیں۔ ایک جیسے اوقات میں حاضر ہوتے ہیں اور نتیجے مختلف ہوتے ہیں۔ تنخواہیں الگ الگ ہیں، راہیں الگ الگ، لیکن محنت کے اوقات یکساں ہیں۔ ایک مارکیٹ میں ایک جیسے دکان والے، ایک جیسا سامان رکھنے والے الگ الگ نتیجے سے گزرتے ہیں۔ جہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے، وہاں بیٹا پیدا ہو سکتا ہے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ کسی بُرے عمل کے بغیر بھی انسان بدنام ہو سکتا ہے۔ اکثر محروم انسان کہتے ہیں کہ انہوں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ ان کی معصومیت کو سزا ملی ہے۔ ایسے ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا . . . پیغمبروں پر الزام لگے ہیں، ان کو قید خانوں سے گزرنا پڑا ہے، بغیر کسی بُرے عمل کے۔

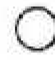
اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے مرتبوں پر فائز رہنے والے اتنے اہم نہیں ہوتے، ان کا عمل اتنا معتبر نہیں ہوتا، لیکن اُن کا مرتبہ معتبر رہتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ بس ہے۔ بے سبب ہے، بے جواز ہے۔ عمل بہت کچھ ہے، لیکن یاد رہے کہ عمل سب کچھ نہیں۔

سالہا سال اور قرنہا قرن کی عبادت ابلیس کو ندامت کے علاوہ کیا دے سکی۔ ظلمات سے نور میں داخل ہونے کا کوئی عمل نہیں۔ یہ خود خالق کا عمل ہے۔ ہمارا عمل ہمیں معزز نہیں کرتا۔ اس کا فضل عزت بخشتا ہے۔ معاف کرنے والے کے لیے گناہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ نیکی کا غرور محرومیوں کا پیش خیمہ بھی ہو سکتا ہے۔

زندگی کی اساس عمل نہیں، فضل ہے۔ ہم لوگ فوری نتیجوں پر غور کرتے ہیں اور اس طرح انتہائی نتائج سے بے خبر رہتے ہیں۔ جھوٹے معاشرے میں عزت دراصل بدنامی ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اصل عمل اس کے فضل کے حصول کا نام ہے اور اس کا فضل کسی عارضہ سے حاصل نہیں ہوتا۔

نیت کی اصلاح ہو تو عمل میں خلوص پیدا ہو سکتا ہے اور عمل کا خلوص نیتوں سے بے نیاز ہے۔ نیکی کے سفر میں جہاں بھی آخری سانس آئے وہی منزل ہے۔

ہمارا نظامِ حیات، نظامِ تعلیم اور نظامِ فکر ہمیں صرف عمل میں مصروف رکھتا ہے۔ عاقبت کی کوئی گارنٹی نہیں۔ نتیجے عارضی ہیں۔ مرتبے، آسائشیں، شہرتیں اور اختیارات گمراہی کے مقامات بھی ہو سکتے ہیں۔ اس عمل کو تلاش کیا جائے جو ہمیں بھی پسند ہو اور ہمارے مالک کو بھی۔ ورنہ نتیجہ ہلاکت اور گمراہی ہے۔ احسن عمل اصلاحِ باطن کے ساتھ حسنِ حیات کا حصول ہے۔ زندگی میں راہیں بدلنے کا وقت نہیں۔ پہلے ہی سے صحیح راستے کا انتخاب کیا جائے اور اس پر صحت عمل سے گامزن ہو کر اس کے فضل کا آسرا تلاش کیا جائے۔ یہی منشا ہے اس حکم کا کہ "اے انسان! تو محنت کے لیے پیدا کیا گیا۔ اب اپنے رب کے راستے کی طرف محنت کر۔" کہیں ایسا نہ ہو کہ ناعاقبت اندیشی میں ہمارا عمل اُس بڑھیا کی طرح ہو جس نے راتوں کو جاگ جاگ کر سُوت کاتا اور انجام کار اسے خود ہی اُلجھا دیا۔



دریا عبور کرنے کے لیے کشتی ضرور سبب ہے۔
لیکن گرداب سے نکلنے کے لیے دعا کا سفینہ چاہیے۔

اِبتلا

وہ وقت قریب آگیا ہے، جب انسان کو اپنے اعمال کے نتیجے سے دوچار ہونا ہے۔ عجب بات ہے کہ ہم زندگی بھر کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ مجبور ہیں اس لیے ہم مصروف ہیں اور پھر یہ مصروفیت ایک نتیجہ مرتب کرتی ہے۔ ایک نتیجہ نہیں دو نتائج۔ ایک ظاہری نتیجہ اور ایک باطنی یا مابعد کا نتیجہ۔

کبھی کبھی ایسے ہوتا ہے کہ انسان نتیجہ حاصل ہونے پر گھبرا جاتا ہے کہ اس نے جو چاہا تھا، وہ تو نہیں ملا۔ اس نے جو سوچا تھا، نتیجہ اس کے علاوہ ملا۔ اگر نتیجہ سوچ کے مطابق بھی ہو، تب بھی اس نتیجے سے ایک نیا عمل پیدا ہوتا ہے اور یہ عمل انسان کے لیے مشکلات پیدا کرتا ہے اور جب آرام نصیب ہوتا ہے۔ تو ساتھ ہی بیماری کا حملہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیماریاں مختلف اقسام کی ہوتی ہیں۔ بہر حال محنتی آدمی کا آرام میں داخلہ بے آرامی پیدا کرتا ہے مضطرب انسان جب سکون میں آتا ہے تو اسے ایک عجیب قسم کے اضطراب کا سامنا ہوتا ہے۔

انسان زندگی کے سکون کی خاطر شادی کرتا ہے اور شادی اس کے لیے مسائل پیدا کرتی ہے۔ شادی کا لفظ ہی خوشی کا مترادف ہے اور اگر اس کے نتائج اور اس کی تفسیر اپنے معنی کے برعکس نکل آئے، تو انسان اپنے آپ کو ابتلا میں محسوس کرتا ہے۔ شادی ایک ایسا تجربہ ہے، جس سے انسان فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ شادی اور محبت اگر الگ الگ انسانوں سے ہو تو ایک طرفہ عذاب ہے۔ انسان اس عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔ فرض اور شوق کا تصادم ہی ابتلا ہے۔ زندگی انسان کو مبتلا ہی رکھتی ہے۔

انسان ناموری کے حصول کے لیے کیا نہیں کرتا۔ ناموری کی خواہش ایک کرب ہے ایک ابتلا ہے، ایک مصیبت ہے اور اس مصیبت کا انجام ایک نئی مصیبت کی شکل میں حاصل ہوتا ہے۔ ناموری حاصل ہو جائے، تو سکون حاصل نہیں ہوتا۔ جب انسان کو اس حقیقت کا علم ہو جائے کہ وہ جن لوگوں میں مشہور ہے، وہ لوگ جھوٹے ہیں تو یہ ناموری ایک تہمت سے کم نہیں ہوتی۔ جھوٹے لوگوں میں پسند کیا جانے والا سچے انسانوں میں ناپسند ہوگا۔ ہر ناموَر انسان کسی نہ کسی طبقے میں بدنام کہلایا جاتا ہے۔

درویش دنیاداروں میں پسندیدہ نہیں ہوتا اور دنیادار درویشوں میں ناپسندیدہ رہتا ہے۔ سورج کی روشنی کو چمگادڑ، اُلّو، چور اور ڈاکو ناپسند کرتے ہیں۔ بہرحال شہرت ایک مستقل ابتلا ہے۔ جہاں انسانوں کی خوبیاں مشہور ہوتی ہیں، وہاں اُن کی خامیاں بھی مشہور ہونے لگ جاتی ہیں۔ ایک معمولی انسان کا گناہ بھی معمولی ہے لیکن ایک مشہور کا گناہ ایک مشہور گناہ ہوتا ہے۔

ہر انسان اپنے دائرہ کار میں مبتلا ہے۔ اپنے پیشے کے حصار میں جکڑا ہوا ہے۔ انسان مصروف ہے۔ ایک نامعلوم منزل کی طرف سفر کرنے میں اور یہ سفر کبھی رکتا نہیں۔ بڑی اذیت کا سامنا ہے۔ آدمی کا دل بہت بڑا ہے اور اس دل پر بڑے مصائب ہیں۔

خوشی حاصل کرنے والا غم بھی سمیٹتا جا رہا ہے۔ حاصل اور محرومی انسان کے لیے ہیں اور انسان ان کے حصول میں مبتلا ہے۔ مرتبہ، مقام اور دولت کی خواہش انسانی زندگی کو گھُن کی طرح کھائے جا رہی ہے۔

انسان انسانوں پر حکومت کرنے کی خواہش سے مجبور ہے۔ بے بس ہے۔ حکومت کرنے کی خواہش کا غلام بڑے ابتلا میں ہوتا ہے۔ انسان تو خدا کی عزت بھی نہیں کرتے، حاکم کی کیا پرواہ کریں گے۔ حکومت کرنے کی خواہش نے بڑے بڑے لوگوں کو غلامی میں مبتلا کر دیا۔ حکمرانی کی خواہش جنگ کی ہولناکیوں تک پہنچ جاتی ہے اور پھر جنگ کا نتیجہ، یا حکومت یا غلامی۔

علم کا متلاشی ایک نئی ابتلا میں ہے۔ وہ ماضی کے مطالعہ سے مستقبل کو روشن کرنا چاہتا ہے۔

شیکسپیئر کی اپنی تعلیم نہ تھی۔ اسے فطرت نے علم دیا۔ آج کے سکالر کی اذیت یہی ہے کہ وہ فطرت سے کٹ کر علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ بڑا مرحلہ ہے، یہ خوفناک اذیت ہے، ابتلا ہے۔

اس ابتلا کے المیہ کا اجمال یہ ہے کہ ایم اے (ادبیات) میں ان لوگوں کی کتابوں کو پڑھایا جاتا ہے، جو خود تعلیم یافتہ نہ تھے۔ غالبؔ کا شعر سند ہے، لیکن غالبؔ کے پاس سند نہیں ہے۔ وارث شاہ نے پنجابی زبان کا ایم۔ اے نہ کیا، لیکن اس کے بغیر پنجابی کا ایم۔ اے نہ ہوگا انسان کس غلط فہمی میں مبتلا ہے؟ وہ کیا پڑھ کے کیا بننا چاہتا ہے؟

ڈاکٹر مریضوں کو موت سے بچاتے بچاتے خود موت کے منہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ دل کے امراض کا ماہر دل کے عارضے سے مرتا ہے۔ تعجب ہے، ابتلا ہے۔

دراصل ہر انسان ایک عجیب صورت حال سے دوچار ہے۔ ایک عجیب بیماری لاحق ہے۔ ایک مہلک مرض میں انسان مبتلا ہے۔ مہلک مرض وہ ہوتا ہے، جس کا انجام موت ہو اور یہ مرض زندگی کا مرض ہے۔ اس کا انجام موت ہے۔

موت سے بچنے کی کوششوں نے ہی انسان کو ہلاک کر دیا ہے۔ حاصل کی کوشش نے انسان کو محروم کر کے رکھ دیا ہے۔ خوشی کی تلاش غم تک لے آتی ہے۔ آرام کی تمنا میں انسان بے آرام ہے۔ سکون کی آرزو ہی اضطراب کا باعث ہے۔ انسان کیا کرے۔ ابتلا میں گھرا ہوا بے بس انسان، انسان کو اس کی خواہش نے قید کر رکھا ہے۔ نہ وہ خواہش چھوڑتا ہے، نہ قید خانے سے رہائی ہوتی ہے۔ کچھ لوگ گھروں میں قید ہیں اور خوش ہیں کہ ان کے فرائض ادا ہو رہے ہیں۔ کچھ دکانوں میں قید ہیں۔ سامان فروخت کرنے کی آرزو میں عمر بھی فروخت ہو رہی ہے۔ چھوٹی سی دکان میں بڑی زندگی کٹ جاتی ہے اور انسان خوش ہے کہ اس نے بہت کمایا۔ کیا کمایا اور کیا لٹایا کسے خبر ہے۔ کچھ لوگ دفتر میں مقید ہیں۔ وقت پر آنا، وقت پر جانا اور ہر وقت ایک خاص عمل میں مصروف رہنا۔ اُن کی ابتلا ہے۔

افسری کی خواہش ایک مصیبت بن کر رہ گئی ہے۔ افسر شاہی کی ابتلا کے لیے کوئی راہِ نجات

شیکسپیئر کی اپنی تعلیم نہ تھی۔ اسے فطرت نے علم دیا۔ آج کے سکالر کی اذیت یہی ہے کہ وہ فطرت سے کٹ کر علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ بڑا مرحلہ ہے، یہ خوفناک اذیت ہے، ابتلا ہے۔

اس ابتلا کے المیہ کا اجمال یہ ہے کہ ایم اے (ادبیات) میں ان لوگوں کی کتابوں کو پڑھایا جاتا ہے، جو خود تعلیم یافتہ نہ تھے۔ غالبؔ کا شعر سند ہے، لیکن غالبؔ کے پاس سند نہیں ہے۔ وارث شاہ نے پنجابی زبان کا ایم۔ اے نہ کیا، لیکن اس کے بغیر پنجابی کا ایم۔ اے نہ ہو گا۔ انسان کس غلط فہمی میں مبتلا ہے؟ وہ کیا پڑھ کے کیا بننا چاہتا ہے؟

ڈاکٹر مریضوں کو موت سے بچاتے بچاتے خود موت کے منہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ دل کے امراض کا ماہر دل کے عارضے سے مرتا ہے۔ تعجب ہے، ابتلا ہے۔

دراصل ہر انسان ایک عجیب صورت حال سے دوچار ہے۔ ایک عجیب بیماری لاحق ہے۔ ایک مہلک مرض میں انسان مبتلا ہے۔ مہلک مرض وہ ہوتا ہے، جس کا انجام موت ہو اور یہ مرض زندگی کا مرض ہے۔ اس کا انجام موت ہے۔

موت سے بچنے کی کوششوں نے ہی انسان کو ہلاک کر دیا ہے۔ حاصل کی کوشش نے انسان کو محروم کر کے رکھ دیا ہے۔ خوشی کی تلاش غم تک لے آتی ہے۔ آرام کی تمنا میں انسان بے آرام ہے۔ سکون کی آرزو ہی اضطراب کا باعث ہے۔ انسان کیا کرے۔ ابتلا میں گھرا ہوا بے بس انسان۔ انسان کو اس کی خواہش نے قید کر رکھا ہے۔ نہ وہ خواہش چھوڑتا ہے، نہ قید خانے سے رہائی ہوتی ہے۔ کچھ لوگ گھروں میں قید ہیں اور خوش ہیں کہ ان کے فرائض ادا ہو رہے ہیں۔ کچھ دکانوں میں قید ہیں۔ سامان فروخت کرنے کی آرزو میں عمر بھی فروخت ہو رہی ہے۔ چھوٹی سی دکان میں بڑی زندگی کٹ جاتی ہے اور انسان خوش ہے کہ اس نے بہت کمایا۔ کیا کمایا اور کیا لٹایا کسے خبر ہے۔ کچھ لوگ دفتر میں مقید ہیں۔ وقت پر آنا، وقت پر جانا اور ہر وقت ایک خاص عمل میں مصروف رہنا۔ اُن کی ابتلا ہے۔

افسری کی خواہش ایک مصیبت بن کر رہ گئی ہے۔ افسر شاہی کی ابتلا کے لیے کوئی راہ نجات

نہیں۔ اپنے آپ کو بلند سمجھنے کے خیال نے ہی انہیں پست قامتی عطا کی ہے۔

انسان اور انسان کے درمیان جو خلیج حائل ہے، وہی ابتلا ہے۔ ایک مبتلا دوسرے مبتلا کی بات نہیں سمجھ سکتا۔ ہر آدمی اپنا رونا رو رہا ہے، اس لیے کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں۔

جو لوگ کمائی کی خاطر وطن چھوڑ گئے، وہ الگ رونا رو رہے ہیں اور جو لوگ وطن میں رہ گئے ہیں، وہ الگ۔ کس نے کس کے لیے کیا کیا، کوئی نہیں جانتا۔ وطن میں رہیں، تو پیسہ نہیں ملتا، پیسہ ملے تو وطن نہیں ملتا۔ انسان کے لیے کتنا بڑا المیہ ہے کہ اس کے اپنے ہی اسے بیگانے دیس میں بھیج دیتے ہیں اور پھر اس کی جدائی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ ابتلا کا وقت ہے اور یہی دعا کا وقت ہے۔

آج کی بین الاقوامی زندگی ابتلا ہے۔ ایک نامعلوم خطرے نے سب کو مبتلا کر رکھا ہے۔ ایک جنگ کا خوف، جو سب اقوام میں موجود ہے۔ سب کو کھا رہا ہے۔ زندگی کو آسانی دینے والے ادارے اسے مشکلات دے رہے ہیں۔ سائنس نے زندگی کو بچایا اور سائنس ہی اسے تباہ کرنے والی ہے۔ انسان ترقی میں مبتلا ہے اور یہ ابتدا تنزّل کی ابتدا ہے۔ لالچ نے انسان کو کمزور کر دیا ہے۔ خود غرضی نے انسان کو تنہائی کی سزا دی ہے۔

مال جمع کرنے میں انسان زندگی خرچ کر دیتا ہے اور آخر کار وہ دیکھتا ہے کہ اس کا دامن مال سے بھر گیا ہے، لیکن زندگی کی متاع ختم ہو گئی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ سب کچھ کس لیے کیا تھا۔ یہ ابتلا کیا تھی؟ اس نے کیا دے کر کیا حاصل کیا؟ زندہ رہنے کے لیے سب کچھ تھا، تو زندگی کہاں گئی؟ جب وقت تھا، مال نہیں تھا۔ اب مال ہے، وقت نہیں ہے۔ وہ حیرت سے دیکھتا ہے، اپنے آپ کو، اپنی ناعاقبت اندیشیوں کو، اپنے ماضی کو اور اپنے نامعلوم مستقبل کو۔ رات آئے تو کرنیں یاد آتی ہیں۔

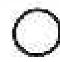
انسان ایک اور مرض میں بھی مبتلا ہے۔ خدائی کرنے کی خواہش نے اس سے انسانیت بھی چھین لی ہے۔ جو انسان نہ بن سکا، وہ اور کیا بنے گا۔ ہر آدمی بھاگے چلا جا رہا ہے۔ کیا قیامت

آنے والی ہے؟ کچھ عذاب نازل ہو رہا ہے؟ انسان کے پاس مصروفیت ہے، فرصت نہیں۔ اس کے پاس وقت نہیں ہے۔ خوشی ملے تو ہنسنے کا وقت نہیں، غم ملے تو رونے کا وقت نہیں۔ کوئی مر جائے، جنازے میں شامل ہونے کا وقت نہیں۔ عذاب تو یہ ہے کہ اس کے پاس اپنی ذات کے لیے بھی وقت نہیں ہے۔ وہ اپنے کام میں مبتلا ہے۔ کام، کام اور صرف کام۔ یہ کام کس کام کا، جب اس کے انجام کا ہی پتہ نہیں۔ انسان جلدی میں ہے۔ عجلت میں ہے۔ وہ ابتلا میں جکڑا ہوا ہے۔ آسمان کی طرف دیکھتا ہے تو پاؤں تلے کی زمین نکل جاتی ہے، زمین کی طرف دیکھتا ہے تو سر پر آسمان گرنے کا خطرہ لاحق ہے۔ انسان کیا کرے۔

انسان مسیحا بننے کی بیماری میں مبتلا ہے اور یہ مسیحائی اس کے اپنے کام بھی نہیں آتی۔ وہ دوسروں کے حالات درست کرنا چاہتا ہے اور خود گردشِ حالات میں ہے۔ جب وہ آلامِ روزگار میں گھر جاتا ہے، تو بے بس ہو کر ہتھیار ڈال دیتا ہے اور یہ دنیا پہلے کی طرح سے قائم و دائم رہتی ہے۔

محبت کرنے والوں کی ابتلا سب سے سخت ہے۔ اپنی زندگی اور دوسرے کا خیال، عجب بات ہے۔ راتیں اپنی اور باتیں کسی کی۔ یہ ابتلا ازل سے ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ چاند کہیں ہوتا ہے اور چاندنی کہیں۔ ایسے لوگوں کا اور کوئی تعارف باقی نہیں رہتا، سوائے اس بات کے کہ....

"میں وہی ہوں مومن مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"



دیوار اپنی راہ میں اس سے بلند تھی
وہ سے جو اس نے اپنے لیے منتخب نہ کی
وہ چیز اس کو میرے لیے کیوں پسند تھی

بڑھاپا

جوانی اور بڑھاپا عمر کے کسی حصّے کا نام نہیں، یہ صرف اندازِ فکر کے نام ہیں۔ ایسا ممکن ہے کہ کوئی شخص تیس سال میں بوڑھا ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی ساٹھ سال میں جوان ہو۔ جب تک انسان آنے والے زمانوں کے لیے پلاننگ کرتا ہے، جوان رہتا ہے اور جب جانے والے زمانوں کی یاد شروع ہو جاتی ہے، آغازِ پیری ہوتا ہے۔ جب زندگی کا تمام تر اثاثہ صرف ماضی کی یاد ہو، حسرتوں کا شمار ہو، ندامتوں کی بازگشت ہو، ہاتھ سے نکلے ہوئے مواقع کا افسوس ہو، غلط فیصلوں کا احساس ہو تو سمجھ لیجیے جوانی ختم ہو گئی اور بڑھاپا شروع ہو گیا۔

بوڑھے آدمی کا کوئی مستقبل نہیں۔ اُس کی زندگی میں کسی نئے یا خوشگوار واقعہ کا انتظار ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے اُس کے ساتھی ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے ہیں۔ وہ دیکھتا ہے اور سوچتا ہے کہ اُس کا وقت بھی کسی وقت آسکتا ہے۔ بوڑھا آدمی جانتا ہے کہ ہر نیا غم ہر پرانے غم کی طرح رخصت ہو جائے گا۔ بوڑھے انسان کا تجربہ یہ کہتا ہے کہ نہ کوئی خوشی مستقل ہے، نہ غم۔ زندگی خود مستقل نہیں۔

بڑھاپے میں انسان کے احساسات ... صدمات اور واقعات سے منجمد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ وہ روتا ہے تو اس کے آنسوؤں میں گر... تی۔ وہ ہنستا ہے تو اس کی ہنسی میں بے ساختہ پن اور شگفتگی نہیں ہوتی۔

بوڑھے آدمی کا مزاج .... اس کا کیا مزاج ... غیر یقینی اور غیر مستحکم۔ وہ خود نہیں سمجھ

سکتا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے۔ بوڑھا انسان محفلوں میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہے اور تنہائیوں میں اُس کی محفلیں ہوتی ہیں۔ یادوں کی محفلیں۔ عہدِ رفتہ کے مناظر اس کی زندگی کا سرمایہ ہیں۔ گم شدہ چہرے اُس کی آنکھوں میں تیرتے ہیں۔ وہ دیکھتا ہے اُن کو جن کو وہ نہیں دیکھ سکتا.... وہ سنتا ہے اُن آوازوں کو، جو سنائی نہیں دیتیں۔ وہ گفتگو کرتا ہے ان سے، جو سُن نہیں سکتے۔

بوڑھے آدمی کا پسندیدہ مشغلہ پرانی تصویریں، پُرانے البم، پرانے خطوط، پرانے کاغذ دیکھنا۔ وہ پُرانی تصویروں میں کھو جاتا ہے.... وہ یاد کرتا ہے اس زمانے کو جب وہ جوان تھا.... اس کی جوانی بھی کیا جوانی تھی.... اس کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا.... اس کے احباب بھی کیا احباب تھے ....اس کے خواب بھی کیا خواب تھے.... اس نے کیا کیا سوچا تھا، کیا کیا چاہا تھا، لیکن اسے کیا حاصل ہوا.... پھولوں کی آرزو اس کے دامن میں کانٹے بھر گئی.... جینے کی تمنا اس کو کہاں لے آئی.... خلوص و مہر و وفا کے قصے اب سب سراب بن گئے.... سب چراغ بجھ گئے، سب خواب بکھر گئے، سب منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے.... یہ کیا ہو گیا۔

بوڑھا انسان اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا ہے، زندگی کا مظلوم۔ وہ سوچتا ہے اور اس کی سوچ بے سمت ہوتی ہے۔ وہ غور کرتا ہے تو غور کرتا ہی چلا جاتا ہے۔ بے مقصد و بے جہت۔ بوڑھے آدمی کا عمل اب اس کی فکر ہے.... اس کے پاس اور کوئی عمل نہیں۔ وہ فکر سے نجات پانا چاہتا ہے۔ وہ غور کرنے سے بچنا چاہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا فکر اس کو کھا جائے گا۔ گھن کی طرح۔ وہ اندر سے کھوکھلا ہو جائے گا.... اس کے لیے کوئی راستہ ہی نہیں۔ اس کا عمل اب صرف یہی ہے کہ وہ غور کرتا جائے .... دیکھتا جائے اور سوچتا جائے کہ کیا سے کیا ہو گیا.... کیوں ہو گیا؟ بس بے سبب ہی بڑھاپا آگیا!

بوڑھا انسان آئینوں سے ڈرتا ہے۔ وہ نہ جانے کیوں آئینے کو منہ نہیں دکھا سکتا.... آخر کس منہ سے!! آئینہ بوڑھے انسان کا بہت اداس تجربہ ہے۔ وہ آئینے کے سامنے آنے سے خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ آئینہ اسے حال دکھاتا ہے اور حال اسے ماضی یاد دلاتا ہے۔ وہ خود کو دیکھ کر چُپ

کرجاتا ہے' سہم جاتا ہے۔ اپنی نگاہ میں خود اجنبی نظر آتا ہے۔ وہ کتنا بدل گیا ہے کہ وہ خود کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ وہ آئینہ دیکھتا ہے اور پھر پُرانی تصویریں دیکھتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ کیا ہو گیا۔

وہ اپنے مختلف رُوپ دیکھتا ہے۔ تصویریں دیکھتا ہے اور آئینے کا عکس دیکھتا ہے اور سوچتا ہے کہ اصل انسان کون ہے۔ کون ہے جو بدل گیا اور کون ہے جو کہہ رہا ہے' وہ بدل گیا... بوڑھا آدمی سوچتا ہے کہ ایک انسان میں کتنے انسان ہیں۔ ایک چہرے میں کتنے چہرے ہیں اور ایک آنکھ میں کتنے منظر ہیں اور ایک زندگی میں کتنی اموات ہیں۔ ہر دَور مر جاتا ہے، نیا دور شروع ہوتا ہے۔ جوانی ہاتھ سے یوں اُڑ جاتی ہے جیسے مہندی کا رنگ۔ بڑھاپا آتا ہے تو بس ٹھہرنے کے لیے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

بڑھاپے کے مسائل دراصل ایک ہی مسئلے کے مختلف حصے ہیں۔ بوڑھے آدمی کا سب سے بڑا مسئلہ صحت ہے۔ صحت کا خیال ہے۔ بوڑھے آدمی کو پہلی بار محسوس ہوتا ہے کہ صحت ریت کی دیوار ہے، اپنے بوجھ سے گرجاتی ہے۔ بھاگنے دوڑنے والا جسم اب صرف آرام چاہتا ہے۔

اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ جسم اس کا اپنا جسم نہیں ہے۔ یہ شکل اس کی اپنی شکل نہیں ہے... یہ آئینے اس کے اپنے آئینے نہیں ہیں۔

بوڑھا آدمی اُن چہروں سے گریز کرتا ہے' جن کو کبھی اس نے پسند کیا تھا۔ وہ اپنی موجودہ صُورت کے ساتھ کسی مقام اور کسی محفل میں جانا پسند نہیں کرتا... وہ سوچتا ہے کہ آخر ضرورت ہی کیا ہے کہ انسان دوسروں سے میل ملاپ کرے۔

جوانی عشرت کدے تلاش کرتی ہے۔ پیرانہ سالی صرف گوشۂ عافیت ڈھونڈتی ہے۔

جوانی حرکت کا زمانہ ہے۔ بڑھاپا جمود کا دَور ہے۔ جوانی گرمیٔ رفتار، گرمیٔ افکار، گرمیٔ رخسار کا زمانہ ہے۔ دلچسپیوں کے ایام ہیں۔ اپنے آپ میں دلچسپی' دوسروں میں دلچسپی' ہر شے میں دلچسپی۔ جوانی وابستگی کا دَور ہے۔ وارفتگی کا زمانہ ہے۔ جوانی دریا کی جواں موجوں کی طرح تُند ہے۔ لیکن بڑھاپا... سکوت اور سکون کا زمانہ ہے... سکوتِ ساحل کی طرح۔ جوان انسان کچھ نہ کچھ کرنے کا متمنی

ہے۔ وہ ضرور کچھ کرنا چاہتا ہے خواہ وہ غلطی ہی کیوں نہ ہو.... لیکن بوڑھا آدمی اب کسی اور عمل کی خواہش نہیں رکھتا.... وہ اپنے پرانے اعمال کے نتیجے کی وصولی میں مصروف ہوتا ہے۔ یہ نتیجہ کچھ لوگوں میں اضطراب پیدا کرتا ہے اور کچھ لوگوں میں سکون.... جس بوڑھے کو اپنے ماضی پر ندامت ہو جو اپنے گذشتہ پر شرمسار ہو، اس کا عمل استغفار ہے.... اس کی آنکھ اشکبار رہتی ہے۔

جس کو اپنے ماضی پر شکایت نہ ہو جو جانتا ہو کہ اس نے وہی کیا تھا، جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ وہ بوڑھا پُرسکون ہوتا ہے۔ وہ ہر ہر بات پر شکر ادا کرتا ہے۔ وہ دوسروں کو بھی ایسے اعمال کی دعوت دیتا ہے، جو انہیں آئندہ شرمساری سے بچائیں۔

دراصل زندگی اپنے اندر ہی اپنے اعمال کا محاسبہ کرتی رہتی ہے۔ انسان کتنا ہی مصروف کیوں نہ ہو، زندگی اُس کی اپنی زندگی، اس کا اپنا ضمیر، اس کا اپنا باطن اس کا اپنا آپ اندر ہی اندر مصروف رہتے ہیں۔ اس کے اعمال خواہ ظاہری نتیجہ دیں یا نہ دیں، اس کے باطن میں نتیجہ ضرور برآمد ہوتا ہے۔ یہ نتیجہ سکون یا اضطراب کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے.... غلط عمل ایک بچھو کی طرح انسان کے باطن میں موجود رہتا ہے اور اس کے بڑھاپے میں اسے اندر سے ڈستا ہے۔ انسان بھاگتا ہے، فرار چاہتا ہے، قرار چاہتا ہے لیکن اس کے لیے نہ قرار ہوتا ہے نہ فرار.... انسان اپنے آپ سے بھاگ نہیں سکتا۔ وہ خود ہی ظالم ہے، خود ہی مظلوم.... وہ اپنا قاتل بھی خود ہے، اپنا نوحہ گر بھی آپ ہی ہے.... انسان اپنی پسند کے نام پر ایک ناپسند حاصل تک پہنچتا ہے.... ضرورت کے نام پر غیر ضروری اشیاء کا حصول اسے بعد میں پریشان کرتا ہے۔

انسان کی جوانی ہی اپنی بداعتدالیوں کی وجہ سے بڑھاپے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اگر جوانی حدود اور حفاظت میں رہے، تو بڑھاپا فاصلے پر ہی رہتا ہے۔ جب جوانی اپنے آپ سے باہر ہوتی ہے، تو بڑھاپا اندر داخل ہوتا ہے۔ انسان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیوں ہو گیا۔ یہ کیسے ہو گیا....

جوانی کی خوش خوراکی اور بسیار خوری معدے کی بیماری بن کر بڑھاپے کی شکل اختیار کر لیتی

ہے۔ جوانی اپنے حلقۂ دوستاں کو وسیع کرتی ہوئی دائرۂ دشمناں تک پہنچ کر بڑھاپے کا روپ دھار لیتی ہے۔ جوانی کی بغاوتیں ندامت کا بوجھ بن کر جوانی کو دبوچ لیتی ہیں اور انسان بوڑھا ہو جاتا ہے۔

زندگی کے سمندر میں بوڑھا انسان یا تو لاش بن کر تیرتا ہے یا موتی بن کر ڈوب جاتا ہے۔ بڑھاپا ہی دراصل شعور کی جوانی کا دور ہے۔ جسم اور جسم کی حرکات کم ہو کر انسان کو باطن کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ انسان جانتا ہے کہ اب اسے کسی شے اور کسی انسان کا انتظار نہیں ہے۔ وہ خاموشی سے اپنے باطن کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس کے تجربات، اس کے مشاہدات اس کے علم میں اضافہ کر کے اسے نئی جہت دریافت کرنے کا موقع اور دعوت دیتے ہیں۔

بڑھاپا اندرون بینی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو دریافت کرنا چاہتا ہے۔ وہ خود ہی رُوبرو ہے۔ خود ہی نظر ہے۔ خود ہی اپنا نظارہ۔ . . . بوڑھا انسان خود ہی آواز ہے، خود ہی گوش بر آواز۔ بوڑھا آدمی جوانوں کے لیے دعا گو ہوتا ہے۔ ایسی دعائیں جو اس کو اس کی جوانی میں کسی نے نہیں دیں . . . . وہ جوانوں کو بلند منزلوں کی طرف دیکھنا چاہتا ہے، ایسی بلندی جو اس کو اپنی جوانی میں نہ ملی۔ وہ جوانوں کو اپنے بڑھاپے کے پلیٹ فارم سے دعوتِ اخلاق دیتا ہے۔ . . عجب بات ہے: بوڑھا جوانوں کو بہت کچھ سنانا چاہتا ہے، وہ سنتے نہیں۔ . . . جوان بوڑھوں کو بہت کچھ سنانا چاہتے ہیں، وہ سنتے نہیں . . . کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ . . .

اپنی جوانی کو اپنے بڑھاپے کی نگاہ سے کوئی نہیں دیکھتا۔ اپنے بڑھاپے کو اپنی جوانی کی نگاہ سے کوئی نہیں دیکھتا۔ اگر جوانی میں انسان اپنے مستقبل کا خیال رکھے تو بڑھاپے میں حسرتوں کا شمار بہت کم ہوتا ہے۔

جوانی مسافرت کی قائل ہے، بڑھاپا قیام کا خوگر ہے۔ بوڑھا آدمی گھر میں ہی رہنا پسند کرتا ہے اور گھر میں باقی افراد شاید اس کا یہ عمل پسند نہ کرتے ہوں۔ . . .

بوڑھے آدمی کو اگر کوئی چہرہ ایسا نظر آجائے، جو اسے جوانی میں پسند تھا، منظورِ نظر تھا تو اس کے بڑھاپے کی راکھ میں چنگاریاں پھوٹتی ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ یہ سب کیا ہے۔ کیا بڑھاپا غیر وابستہ

زندگی کا نام ہے۔ کیا بڑھاپا تنہا رہنے کی آرزو ہے۔ کیا بڑھاپا زندگی سے بیزاری یا اس سے فرار کا نام ہے۔ کیا بڑھاپا وجود اور قوا کے مضمحل ہونے کا نام ہے۔ کیا بڑھاپا باتی پاس کے واقعات کی داستان ہے۔ بڑھاپا دراصل جوانی اور جواں فکری سے علیحدگی کا نام ہے۔ ہم نے پہلے کہا کہ بڑھاپا عمر کے کسی حصے کا نام نہیں بلکہ اندازِ فکر کا نام ہے۔ ایسے ایسے بوڑھے دیکھنے میں آتے ہیں جو جوان محفلوں میں رہنا پسند کرتے ہیں اور جوان محفلیں ان کی موجودگی کو پسند نہیں کرتیں .... عجب بات ہے۔

انسان کب پیری میں داخل ہوتا ہے .... کب جوانی کو الوداع کہتا ہے ... جب اس کو بیٹا کہنے والا کوئی نہ ہو .... جب اس کو پیار سے پکارنے والا کوئی نہ ہو ... جب اس کو اس کے فرائض یاد دلانے والا کوئی نہ ہو ... دراصل بڑھاپا ہی حاصلِ ہستی ہے۔ زندگی کے اوّلیں زمانے دوڑ دھوپ کے زمانے ہیں۔ غفلت و عجلت کے ایام ہیں۔ جوانی ابتدائے عمل ہے اور بڑھاپا نتیجہ .... بوڑھا انسان ایک جزیرہ ہے، تنہا سہما ہوا۔ اس کا انتظار کسی بڑی خبر کا انتظار ہے اور یہ بڑی خبر بُری خبر بھی ہو سکتی ہے۔

سب سے خوش قسمت بوڑھا وہ ہے، جس کو ماں باپ کی دعائیں ملی ہوں اور اُسے بیوی بچوں کا تعاون حاصل ہو .... اولاد کا مؤدب ہونا ایک نعمت ہے .... مؤدب اولاد اپنی پیری میں اپنی اولاد کو مؤدب پائے گی۔

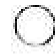
سب سے زیادہ بدقسمت وہ بوڑھا ہے، جس کو بڑھاپے میں گناہوں کی تمنا ہو .... جوانی میں توبہ شیوۂ پیغمبری ہے۔ بڑھاپے میں گناہ .... عذاب کے علاوہ کیا ہے!

قابلِ قدر ہے وہ بڑھاپا، جو دوسروں کے لیے نافع ہو .... جو آگاہِ راز ہو اور دوسروں کو آگاہ کرنے کی کوشش کرے۔ جوانی میں اقبال اور تھا اور بڑھاپے میں اقبال اور تھا ...

آج جو اقبال ہماری فکر میں بہار لاتا ہے، ہمارے جذبات میں گرمی پیدا کرتا ہے، ہمارے باطن میں چراغاں کرتا ہے، ہماری خودی کی دھار کو تلوار کرتا ہے، ہمیں ہماری منزلوں کی خبر دیتا ہے۔ وہ بڑھاپے کا اقبال ہے۔ جوان اقبال ناخوش و بیزار ہے، وہ خوشۂ گندم کو جلانے کا حکم دیتا ہے،

سلطانیٔ جمہور کا قائل ہے اور بوڑھا اقبال دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا چاہتا ہے۔ محمدؐ سے وفا کا قائل ہے... مقصد یہ کہ زندگی ہر دور سے گزرتی ہوئی بڑھاپے تک آتی ہے اور یہی اس کا حاصل ہے۔ جوانی کی آنچ مدھم ہو جائے تو کیمیائے پیری یا پیرانہ سالی حاصل ہوتی ہے۔ یہی زندگی ہے۔ یہی آگہی کے ایام ہیں۔ خود شناسی کے دن، خدا شناسی کے زمانے، زندگی کی معرفت کا دور، موت کے تیقن کا زمانہ، مابعد کی حقیقت کی جلوہ گری کا وقت، تقربِ الٰہی کی گھڑی۔

خوش نصیب ہے وہ بوڑھا جو حسرت و ندامت سے آزاد ہے، جو مطمئن ہے، پُرسکون ہے، آشنائے راز ہے، آگاہِ حقیقت ہے، محرمِ ہستی ہے۔ مکان و لامکاں کے فرق کو جانتا ہے۔ جو قطرے اور قلزم کی وحدت سے آشنا ہے، جو لذتِ وجود سے آزاد ہے اور ہوسِ زر سے بے نیاز ہے۔ جس کا حاصل کبھی لاحاصل نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کا حاصل اس کی خود شناسی ہے!! اور جس نے اپنے آپ کو دریافت کر لیا اس نے سب کچھ ہی پا لیا!! ہمیشہ ہمیشہ کے لیے... ہم حال صاحبِ حال ہو گیا۔!!



وہ جو کردار کا مثالی ہے
اُس نے صورت مری چُرا لی ہے
تو نے ہر ایک دل کیا زخمی
میں نے ہر ایک سے دُعا لی ہے
کون مالک ملے اس امانت کا
تو نے سینے سے جو لگا لی ہے

گمنام ادیبوں کے نام

علم وحکمت کسی کی میراث نہیں۔ دانشوروں کے علاوہ بھی دانشور ہیں۔ ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے پاس سچائی اور دانائی رکھتے ہیں لیکن انہیں دامنِ شہرت تک رسائی نہ ہو سکی۔ وہ جن کے افکار کسی اخبار یا رسالے کی زینت نہ بن سکے۔ ایسے شعرا جن کا کلام بلاغت نظام ردی کاغذ کے ٹکڑوں اور سگریٹ کے خالی پیکٹوں تک محدود رہتا ہے۔ وہ جن کے قلوب کائنات کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہیں لیکن جن کو حوادثِ زمانہ نے راستہ نہ دیا۔ آج کا کالم ایسے ہی گمنام ادیبوں کے نام سے منسوب ہے۔

زندگی کے دشت وصحرا سے باہوش گزرنے والے ایسے بے شمار ادیب اور دانشور ہیں، جو خاموش رہے۔ ان کے پاکیزہ اور منزّہ خیالات لبِ اظہار تک نہ آئے۔ ایسے لوگ کیفیات میں کسی سے کم نہیں۔ اُن کا تخیّل، احساس وارفتگی، دیوانگی، جنون، آگہی، عقل، دل اور نگاہ ایک پُوری واردات ہے۔ وہ قلم اٹھائیں تو کتابیں لکھ دیں لیکن نہ جانے کیوں انہوں نے سکوت کو اظہار پر ترجیح دی۔ انہوں نے اپنے درد کو رسوا نہ کیا۔ اپنے عشق کو اہلِ جہاں کے گوش گزار نہ کیا وہ نوکِ خار پر قطرۂ شبنم کی طرح رقص تو کر گئے لیکن اپنے رقص کو تماشا نہ بننے دیا۔ شاید حیا مانع تھی یا ان کی زبان اور ان کے قلم پر صبر اور جبر کے قفل تھے۔ وہ اظہارِ حرفِ آرزو کرنے کے بجائے بے نیازِ آرزو کیوں ہو گئے؟ اُن کے نالہ ہائے نیم شب پر، ان کے آنسوؤں پر آسمان رویا، لیکن انہوں نے کسی انسان کو اپنے کرب کا گواہ بنانا گوارا نہ کیا۔ کیوں؟ کیا وہ انسانوں سے مایوس ہو چکے تھے؟ کیا ان کو کسی پر اعتماد نہ تھا؟ کیا انہیں کوئی قابلِ اعتماد غمخوار نہ ملا؟ وہ گویائی

کے مالک تھے، فصاحت وبلاغت رکھتے تھے لیکن وہ گنگے کیوں بنے رہے؟ وہ خاموش طوفان بپا کیوں نہ ہوا؟ وہ علم وآگہی کے چراغ تو تھے لیکن سہمے سہمے، مدہم مدہم۔ وہ مجسم شعر تھے سراپا غزل تھے، مکمل ادیب تھے، دانشور تھے لیکن وہ خاموش رہے۔ کیوں؟ آخر کیوں؟

یہ بہت بڑا "کیوں" ہے۔ یہ بہت بڑا سوال ہے۔ آج کا نہیں صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ اپنے جواب کا منتظر۔

اس سوال کا جواب اس لیے نہیں دیا گیا کہ وہ لوگ جن کے پاس جواب تھا، وہی تو گمنام ادیبوں کے حقوقِ اظہار کی راہ میں دیوار تھے۔ وہ دانشور، جو اونچی کرسیوں پر براجمان تھے وہ کیسے کسی اجنبی کو اپنے دانش کدے میں داخل ہونے دیتے۔

کہتے ہیں کہ کوئی کسی کا راستہ نہیں روک سکتا۔ دریا اپنا راستہ خود بنا لیتے ہیں، بجا ہے۔ دریا اپنا راستہ خود ہی بناتے ہیں لیکن اس کنارے کی طرف جس پر بند نہ باندھا گیا ہو۔

راستہ لینے کی بات نہیں، راستہ دینے کا ذکر ہے۔ جب سر پر آسمان گر جائے، پاؤں تلے سے زمین نکل جائے تو راستہ لینے کی صلاحیتیں مفقود ہو جاتی ہیں اور انسان اپنے تمام حقوق کے باوجود گمنام رہنے ہی میں عافیت محسوس کرتا ہے۔ اپنا حق لینے کی استعداد ہر صاحب حق کے پاس نہیں ہوتی۔ مجبور انسان اپنے جائز حقوق سے دست بردار ہونا ہی اپنے حق میں بہتر سمجھتا ہے۔

گمنام ادیبوں اور گمنام شعراء کی کاوشیں کسی نہ کسی نام سے شائع ہوتی رہیں۔ خوش بختی نے بدبختی سے اس کا فن خرید لیا۔ یہ کس کا حق تھا، دینے والے کا یا لینے والے کا؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک گمنام ادیب کے مرنے سے کئی نامور ادیب مر جاتے ہیں۔ اس سماج میں کتنے ساغر صدیقی لٹتے رہے اور وہ اس لیے خاموش رہے کہ انہیں بولنے سے کچھ حاصل ہوتا دکھائی نہ دیتا تھا۔ صاحب تخلیق کوئی اور ہے صاحب دیوان کوئی اور۔ گمنام ادیب غریب نہ ہوتا، تو گمنام کیوں ہوتا؟

دانشوروں کی عزت و توقیر میں خدانخواستہ کمی مقصود نہیں واللہ نہیں۔ مدعا تو اُس کی عافیت ہے، جس کے پاس دولتِ احساس ہے، جوہرِ تخلیق ہے لیکن اس کے فن کا سہارا نہیں۔ وہ بکتا ہے اور حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتا۔ اسے اُمید کا کنارہ نظر نہیں آتا۔ وہ فن سے کنارہ کش ہو جاتا ہے اور گمنامی کے اندھیروں کو اپنا نصیب سمجھ کے چُپ ہو جاتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو ہر انسان گوہرِ نایاب ہے۔ ایک دُرِ مکنون ہے۔ ہر آدمی کے پاس شرف ہے۔ سب کی گٹھڑی میں لعل ہے۔ سب کے آنگن میں چاند اترتا ہے۔ سب کے سر پر سایۂ افلاک ہے۔ سب کے پاؤں کے نیچے وہی زمین ہے۔ سرمایۂ خیال ہر ذہن کے لیے ہے۔ دولتِ احساس ہر دل کے لیے ہے۔ ہر زبان گویائی رکھتی ہے۔ ہر نظر کو نظارہ سے لطف اندوز ہونے کا یکساں حق ہے۔ جو بیان نہیں کرتا، وہ بھی صاحب بیان ہے اور جو دیوان چھپ نہیں سکتا وہ بھی دیوان ہے۔ مکمل دیوان، مرصع و معلّٰی۔ کتنے ہی مصنف اس انتظار میں مر گئے کہ ان کا کلام ان کی زندگی میں چھپ سکے۔ لیکن کیسے؟

زندگی میں جن ادیبوں کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا، مرنے کے بعد ان کے دن منائے جاتے ہیں۔ بڑی دھوم دھام سے لنگر تقسیم ہوتے ہیں۔ مقالے پڑھے جاتے ہیں۔ ان کے مزار پر چادریں چڑھائی جاتی ہیں۔ گمنامی میں مرنے والے ادیبوں کو مرنے کے بعد دانشکدے کا معزز رکن نامزد کر دیا جاتا ہے۔ یہ اس ادیب کی عزت افزائی ہے یا توہین؟

سوچنے والی بات ہے کہ جو موتی ابھی سیپ کے باطن میں ہے اور جو ابھی زینتِ بزم نہیں ہوا، کیا وہ موتی نہیں ہے؟ جو پھول صحنِ چمن میں نہ کھل سکا، کیا وہ پھول نہیں۔ کیا صحرا میں کھلنے والا پھول صرف اس لیے پھول نہیں کہلاتا کہ اسے دیکھا نہیں گیا۔ جنگل میں ناچنے والے مور کو کوّا تو نہیں کہا جا سکتا۔ کیا گمنام ادیب، ادیب نہیں؟ کیا بے دیوان شاعر، شاعر نہیں؟ کیا مشاعروں میں پہلے پڑھنے والے شعراء کے اشعار کمزور ہوتے ہیں؟ ادیب کے وزن سے اس کا ادب تو وزنی نہیں ہو جاتا؟ کیا ادب صرف ٹی ہاؤس میں پیدا ہوتا ہے؟ کیا ادیب صرف رسائل، اخبار

اور ٹی وی تک ہی ہے؟ کیا شہروں سے باہر ادیب نہیں ہیں؟

یقیناً ہیں۔ ان لوگوں کے حالات نے ان کے احساسات و خیالات کو منجمد کر دیا۔ گردشِ زمانہ کی وجہ سے یہ گمنام ادیب سہم سے گئے۔ ان کے جذبات سِسک سِسک کر سو گئے۔ اُن کے سرِ دستِ شفقت سے محروم رہے۔ اُن کے ماحول نے اُن کا ساتھ نہ دیا۔ ان کے ادب کے چراغ جلنے سے پہلے ہی بُجھ گئے۔ وہ رموزِ مرگ و حیات سے باخبر تھے۔ لیکن ان کی گمنام تصانیف دن کا اجالا دیکھنے سے محروم رہیں۔ ان کے افسانے خریدنے والا کوئی نہ تھا۔ بیچنے والا کوئی نہ تھا۔ چھاپنے والا تو درکنار، سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ان کی ادبی زندگی کی بے بسی پر افسوس کرنے والا بھی کوئی نہ مِل سکا۔

جنگ کے گمنام سپاہیوں کی طرح ادب کے گمنام مسافروں کو سلام کہنا واجب ہے۔ ان کا احترام ضروری ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہیں، قابلِ عزت ہیں۔ پہاڑوں میں، صحراؤں میں، قصبوں میں، گاؤں میں، گھر کی چار دیواری میں، کارخانوں میں، فوج میں، سول میں، ہوسٹلز میں، غرضیکہ جہاں بھی ہیں، خوب ہیں۔ ان کی سوچ ادب ہے۔ ان کا تخیل ادب ہے۔ ان کے پاس دانش ہے لیکن وہ دانشور نہیں۔ ان کے پاس ادب ہے، لیکن وہ ادیب نہیں۔ اُن کے حُسنِ خیال کو گمنامی کے غار سے باہر نکلنا نصیب نہ ہو سکا۔ ایسے ادیب دراصل آتشیں جزیرے ہیں، جو اگر زبان کھولیں تو پانی میں آگ لگ جائے لیکن وہ اور ان کا ادب خاموش ہیں۔ شاید وہ شہرت اور کامیابی کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ وہ اپنے آپ کو ادیب کہلوانے کی تمنا سے آزاد کر چکے ہیں۔ وہ بے نیاز ہیں۔ اپنی مستی میں مست، اپنی رعنائی خیال میں محو، ستائش و صلہ کی آرزو سے بہت دُور۔ اُن کا فن ہی ان کی سند ہے۔ وہ اپنی تنہائیوں میں انجمن ہیں۔ اپنے حال میں صاحبانِ حال ہیں۔ قال کا جامہ چاک کر چکے ہیں۔ وہ عظیم ہیں۔ انہیں کسی کالم کی بھی ضرورت نہیں۔

کہتے ہیں کہ اگر کوئی صاحب نگاہ مل جائے کوئی شعیبؑ میسر آجائے تو شبانی کو کلیمی میں بدل دیتا ہے۔ لکنت کلیم اللہی کرتی ہے۔

جس ہیر کو وارثؒ شاہ مل گیا، وہ ہیر گمنامی کے اندھیرے سے ایسے نکلی کہ ادب کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کے طلوع ہوئی۔ وارثؒ شاہ کے دم سے ہیر حق ہو گئی۔ اس کی داستان، اس کا عشق زبانِ زدِ خاص و عام ہے۔ اب وہ ہیر رُوح کی فریاد ہے۔ وہ علم بولتی ہے، عرفان میں بات کرتی ہے، فلسفہ بیان کرتی ہے، عشق و حسن کے رشتوں کا تجزیہ کرتی ہے۔ گنگناتی ہے، رقص کرتی ہے، عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کے ناطے جوڑتی ہے، راہِ سلوک کی منزلیں طے کرتی ہے۔ طالبانِ حق کے لیے ایک استعارہ ہے لیکن سوچنے والی بات ہے کہ کتنی ہی ہیریں اپنے وارثؒ شاہ کے انتظار میں خاموش بلکہ فراموش ہو گئیں۔ ان کا عشق زندہ رہا۔ لیکن ان کی داستان مر گئی۔ ان کے رانجھے اُن کی خاطر کسی "بالناتھ" سے فیض یاب نہ ہو سکے۔ اس طرح وہ شعلہ بُجھ گیا، وہ آگ دب گئی۔ وہ عشق، وہ ادب گمنام رہا۔ انتظار کی صلیب پر لٹکنے والی رُوح فریاد تو کرتی رہی، لیکن کسی وارثؒ شاہ کے کان تک صدا نہ پہنچی اور یوں ؏

کتنے باغ جہان میں لگ لگ سُوکھ گئے

گمنام ادیبوں کو سرپرست چاہئیں۔ ان کا ہاتھ پکڑا جانے۔ ان کے پاس تازہ واردات کی تاثیریں ہیں۔ انہیں پیرایۂ اظہار درکار ہے۔ آج کے نئے اور گمنام ادیب کو بڑے مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔

آج کا سانحہ یہ ہے کہ نئے فکر کے لیے بھی پرانے مفکر ہی داعی ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ قدیم ادیب اپنا رنگ بدل لیتے ہیں اور اس طرح نئے خیال کا استحصال ہوتا رہتا ہے۔ آج کا المیہ یہ ہے کہ پُرانا ادیب نہ بوڑھا ہوتا ہے، نہ ریٹائر ہوتا ہے۔ جب تک بزرگ ادیب بُوڑھا نہ ہو، نیا ادیب جوان نہیں ہو سکتا۔ جب تک بزرگ ادیب ریٹائر نہ ہو، نیا ادیب فائز نہیں ہو سکتا۔ اس طرح پُرانا خیال، جو اپنے زمانے میں نیا تھا، آج کے زمانے میں بھی نیا پن اختیار کرنا چاہتا ہے اور یوں نامور ادیب صرف گمنام ادیب ہی پیدا کرتے رہیں گے اور نئے تخلیق کار شہر سے دور شہریار سے دُور اپنے فن کی سسکیوں کو ہمیشہ کی نیند سُلا دیں گے۔

المیہ یہ ہے کہ شہرت اپنے آپ کو ہر شعبہ میں مشہور دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ دانشور جن کی عمر اسلام اور خدا پر بے باک بلکہ گستاخ تنقید میں گزری، آج نعت کی محفلوں میں موجود ہیں۔ مارکس کو پیغمبر ماننے والے آج سیرت النبیؐ کے شارح ہیں۔ کل کے قصیدہ گو آج کے بھی قصیدہ گو ہیں۔ نامور ادیب میں شاید کوئی خامی نہ ہو لیکن گمنام ادیب میں کم از کم ایک خوبی ضرور ہے، وہ کبھی منافق نہیں ہو سکتا۔ وہ گمنام رہ سکتا ہے، لیکن ظاہر و باطن میں فرق برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی گمنامیوں کو سلام۔



منافقت انسان کو اللہ کے قرب سے محروم کر دیتی ہے۔ منافق وہ شخص بھی ہے جو اسلام سے پیار کرے اور مسلمانوں سے نفرت۔ منافق وہ بھی ہے جس کے ظاہر و باطن میں فرق ہو۔ خلوت جلوت میں فرق ہو۔ جس کی باتیں سچی ہوں اور وعدے جھوٹے ہوں۔ جو دشمنوں کے ساتھ ہنس ہنس کر بات کرے اور دوستوں کی ہنسی اڑائے۔ جو محسنوں کے ساتھ وفا نہ کرے۔ جو انسان کا شکر ادا نہ کرے اور خدا کی تعریفیں کرے۔ جو امانت کی حفاظت نہ کر سکے۔ جس کو اپنے سے بہتر کوئی انسان نظر نہ آئے۔ جو اپنے دماغ کو سب سے بڑا دماغ سمجھے۔ جو یہ نہ سمجھ سکے کہ اللہ جب چاہے مکڑی کے کمزور جالے بھی ایک طاقتور دلیل پیدا کر سکتا ہے۔

نیند

نیند کی قیمت اس سے پوچھو جس کو نیند نہیں آتی۔ نیند ہی زندگی کے دستر خوان کی سب سے اہم، سب سے لذیذ اور سب سے میٹھی ڈش ہے۔

نیند دو مصروف اوقات کے درمیان وقفہ ہے۔ فطری وقفہ جس طرح امن کا زمانہ دو جنگوں کے درمیانی وقفے کا نام ہے۔

نیند انسان کو اس کی محنت کے بعد آرام پہنچاتی ہے اور اسے نئی محنتوں کے لیے تیار کرتی ہے۔ نیند ایک نجات دہندہ فرشتہ ہے، جو انسان کو اُس کے اعمال اُس کے احوال اور اس کے خیال سے آزاد کرتا ہے۔ نیند نہ ہو تو انسان اپنی جدوجہد کے بوجھ تلے دب کر مر جائے۔ نیند ایک مطمئن زندگی کا ثبوت ہے۔ خوش قسمت ہے وہ جس کی نیند کسی خوف یا کسی شوق سے پریشان نہ ہو۔

انسان جب ظلم کرتا ہے، دوسروں پر اور اپنے آپ پر، تو اس کی سزا یہ ملتی ہے کہ وہ نیند میں مضطرب رہتا ہے۔ وہ سوتا ہے تو اسے اپنے بچھونے پر بچھو نظر آتے ہیں۔ احساس کے بچھو، ندامت و افسوس کے بچھو۔ انسان چاہتا ہے کہ ہونی انہونی ہو جائے۔ جو ہو چکا، وہ نہ ہوتا۔ کاش! ایسا نہ ہوتا، کاش! یوں ہو جاتا اور اسی کاش کے اندر ہی نیند غرق ہو جاتی ہے اور انسان بے خوابی کے عذاب میں مبتلا ہو کر رہ جاتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو نیند کا عالم بیداری کے عالم سے زیادہ ہے۔ عدم کا سکوت وجود کے ہنگاموں کے زمانوں سے کہیں زیادہ ہے۔ پیدائش سے قبل کے زمانے مکمل سکوت اور مستقل نیند کے زمانے ہیں۔ مابعد کا دور نیند میں ڈوبی ہوئی لامحدود صدیوں کا دور ہے اور پھر

یہ زندگی اپنے اندر نیند کے زمانے رکھتی ہے۔ اوّل نیند ہے، آخر نیند ہے اور درمیان بھی نیند ہی ہے۔ عالمِ بیداری ایک خواب کا عالم ہے اور یہ خواب کی طرح ہی گزر جاتا ہے۔ درحقیقت ہر حقیقت حجابِ حقیقت ہے۔ اصل حقیقت کیا ہے؟ نیند یا بیداری۔ اس کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

دنیا کے عظیم انسان اپنی نیند کو کم کرتے رہے۔ وہ نیند کو ایک دشمن سمجھتے رہے۔ انھوں نے اس وقت محنت کی جب عالم سو رہا تھا۔ وہ نیند کو غفلت اور محرومی کا زمانہ کہتے تھے۔

دراصل نیند ہر انسان کے لیے الگ الگ مفہوم رکھتی ہے۔ نیند عابد کو عبادت سے محروم کرتی ہے۔ محب کو محبوب سے جدا کرتی ہے۔ ذمہ دار انسان کو احساسِ ذمہ داری نہیں ہونے دیتی۔ انسان پر رازِ حقیقت منکشف نہیں ہونے دیتی۔ دوسرا رُخ یہ ہے کہ نیند گنہگار کو گناہ سے بچاتی ہے۔ پریشان حال انسان کی پریشانی کو چھپا دیتی ہے۔ بیمار انسان کو بیماری کے دباؤ سے بچاتی ہے۔ غرضیکہ نیند بُرے انسان کے لیے اچھی ہے اور اچھے کے لیے بُری۔

عوام الناس کے لیے نیند ایک دولت ہے، سرمایہ ہے، عنایت ہے، عطا ہے۔ زندگی کے مسلسل کرب سے نجات کا ذریعہ ہے۔ نیند غم، فکر، اندیشوں، ندامتوں اور اذیتوں سے رہائی دلاتی ہے۔ نیند ہونے اور نہ ہونے کی درمیانی سرحد کا نام ہے۔ فنا اور بقا کے درمیان نیند کا علاقہ ہے۔ جہاں انسان نہیں ہوتا لیکن ہوتا ہے۔ جہاں وہ ہوتا ہے لیکن نہیں ہوتا۔ وہ دیکھتا ہے لیکن خواب، وہ سنتا ہے لیکن بے صدا آواز، وہ چلتا ہے لیکن فاصلے طے نہیں ہوتے۔ وہ جمود میں متحرک ہوتا ہے۔ وہ مرتا ہے لیکن زندگی کی آغوش میں۔ وہ زندہ ہوتا ہے لیکن موت کے حصار میں۔ غرضیکہ وہ ہوتا ہے لیکن نہیں ہوتا۔ نیند حقیقت کو خواب اور خواب کو حقیقت بناتی ہے نیند کے عالم میں یہ جاننا کہ انسان نیند کے عالم میں ہے بہت مشکل ہے۔ اتنا مشکل جتنا اپنے مَن میں ڈوب جانا۔ خودشناس انسان اپنی نیند کو نیند کے طور پر پہچانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہم کبھی بیداری میں سوتے ہیں، کبھی نیند میں بیدار ہوتے ہیں۔

زندگی خود ایک خواب ہے اور اس خواب کے عالم میں کتنے ہی خواب ہیں۔ ماضی کی

حقیقت خواب ہے۔ مستقبل کی حقیقت واہمہ ہے۔ حال برقرار رہ نہیں سکتا۔ نیند کی حقیقت کیا ہے؟ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بیداری کی حقیقت سمجھ میں نہ آئے تو نیند کی حقیقت کیسے سمجھ میں آ سکے۔

نیند زندگی کا ایسا آئینہ ہے جس میں موت کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ نیند ایسی حقیقت ہے جس میں خواب نظر آتے ہیں۔ خواب کو حقیقت مان لیا جائے تو تعبیر کی حقیقت ایک اور خواب بن کے رہ جاتی ہے۔ اقبال نے خواب دیکھا۔ قوم نے اقبال کے خواب کو حقیقت مان لیا اور پھر ہم تعبیروں کے سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ خواب تو شاید ایک ہی تھا اور تعبیریں لاتعداد خواب پریشان ہو کر رہ گیا۔ خواب کسی کا، تعبیر کسی اور کی، بات بنے تو کیسے بنے۔ یہی ایک راز ہے۔

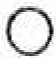
اس سے انکار نہیں کہ نیند کا کرشمہ رویائے صادقہ کا وجود ہے۔ خواب دیکھنے والوں نے نیند میں آنے والے زمانے دیکھے۔ نیند میں اکثر محجوب، مکشوف ہوتے ہیں۔ مکاشفہ نیند کا تحفہ ہے۔ مراقبہ بھی نیم خوابی کے عالم میں ہوتا ہے۔ اس لیے نیند کو نعمت بھی کہا جاتا ہے۔ شاعر کا تخیل، صوفی کا وجدان، مکاشفہ، عالمِ بیداری کے علاوہ ہیں اور یہ عالم نیند کے قریب ہے لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ جس انسان پر حقائق منکشف ہوں، وہی اُن کی اصلیت سے باخبر ہو سکتا ہے۔ یہ نہیں کہ مکاشفہ کسی اور کا ہو اور حقیقت کی دریافت کسی اور کی۔ تعبیروں کا الجھاؤ اسی لیے ہے کہ خواب دیکھنے والا موجود نہیں۔ جب تک کوئی اور صاحبِ ادراک نیا خواب نہ دیکھے گا، تعبیروں کی تفاسیر مختلف ہی رہیں گی۔ جس کی نیند پر خواب نازل ہوں، وہی تعبیر آشنا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح قرآن پاک کی تفسیروں میں فرق ہے۔ نازل ہونے والی کتاب کی تفسیر بھی نازل ہونے والی ہو سکتی ہے۔ الہامی کتاب کی ذہنی تفسیر از خود غیر معتبر ہے۔

بہرحال نیند کی دنیا ایک عجیب دنیا ہے۔ ایک نیرنگِ خیال ہے۔ ایک طلسم ہوشربا ہے۔ ایک پُراسرار وادی ہے۔ ایک جزیرۂ اَمن ہے۔ ایک منظرِ دلکشی ہے۔ ایک ایسا لطف جس میں انسان کسی کو شریک نہیں کر سکتا۔ ایک ایسا سرمایہ جو حاصل ہوتے ہی خرچ ہو جاتا ہے۔ ایک ایسا مقام، جہاں ہر انسان بے ضرر ہو کے رہ جاتا ہے۔

فطرت کے عطیات میں سب سے بڑا عطیہ پُرسکون نیند ہے۔ مطمئن نیند کی قدر اُس سے پُوچھو، جس کو خواب آور ادویات کے سہارے درکار ہوں۔ نیند صرف انسان ہی کے لیے نہیں پوری کائنات سوتی اور جاگتی ہے۔ وحوش وطیور سوتے ہیں۔ شجر و حجر سوتے ہیں۔ شمس و قمر، آسمان و زمین پر نیند اور بیداری کا عالم گزرتا ہے۔ سمندر سوتا ہے۔ سمندر جاگتا ہے اور سمندر کا جاگنا رُوح کا جاگنا ہے۔ نصف شب کو سمندر کے اندر سے بیداری پیدا ہوتی ہے۔

سمندر کی طرح صاحبانِ رُوح نیم شب کو جاگتے ہیں۔ ہر مشکل مقام پر ان لوگوں کو آہ و فغانِ نیم شب کا پیام ملتا ہے۔ اُن لوگوں کی بیداری ہی سونے والے انسانوں کے لیے رحم کی طالب ہوتی ہے۔ جاگنے والے سونے والوں کے لیے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! اے ہمیشہ جاگنے والے اللہ! سونے والے انسانوں پر رحم فرما۔ اِن غافل انسانوں کو اپنے فضل سے محروم نہ کرنا۔ بیدار مغز اور بیدار رُوح انسان ہی قوموں کی نجات کا ذریعہ ہیں۔

قوموں کی تباہی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ان سے نالۂ نیم شب چھین جاتے۔ جاگنے والے زندہ ہوں تو سونے والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ جاگنے والے نہ رہیں تو سونے والے بھی نہ رہیں گے۔ گڈریا سو جائے تو بھیڑیے ریوڑ کھا جاتے ہیں۔ نیند نے سربراہوں کو برباد کیا۔ سلطان سلطنت سے محروم ہو گئے۔ نیند میں سرمایۂ فقر لٹ جاتا ہے۔ نیند کو غفلت نہ بننے دیا جائے تو یہ راحتِ جان ہے۔ قرارِ جسم اور سکونِ دل ہے۔ اگر نیند غفلت ہو جائے، تو انسان محروم ہو جاتا ہے۔ اپنے ماضی سے کٹ جاتا ہے۔ اپنی اصل سے ہٹ جاتا ہے۔ اپنی آزادی کی دولت ضائع کر دیتا ہے۔ آزادی کی صرف ایک ہی قیمت ہے۔ مستقل اور مسلسل بیداری۔ غلام قومیں سوتی ہیں اور آزاد قومیں بیدار رہتی ہیں۔ انسان کو اپنے مستقبل کی خاطر جاگنا چاہیے۔ اسے آنکھیں کھول کر رہنا چاہیے۔ نیند اپنی حد سے نکل جائے تو عذاب ہے، بیماری ہے۔ نیند غائب ہو جائے تو بھی مصیبت ہے۔ اس لیے سب سے مبارک زندگی وہ ہے، جو نیند سے محروم بھی نہ ہو اور نیند سے مغلوب بھی نہ ہو۔ ہماری زندگی اور زندگی کے مشاغل کسی اور زندگی کے لیے ہیں۔ یہ زندگی ایک خواب ہے۔ ایک نیند ہی کا عالم ہے، لیکن افسوس کہ انسان کی آنکھ اُس وقت کھلتی ہے، جب وہ بند ہونے لگتی ہے۔



وقت

جس طرح غم دل کو کھاتا ہے اور دل غم کو کھاتا ہے اسی طرح ہم وقت کو برباد کرتے رہتے ہیں اور وقت ہمیں برباد کرتا رہتا ہے۔ یہ کھیل کب سے شروع ہے۔ اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔

وقت کیا ہے؟ اس کا فیصلہ بھی مشکل ہے۔ ہم نے وقت کو شب و روز میں تقسیم کر رکھا ہے۔ موسموں میں بانٹ رکھا ہے لیکن یہ دن، یہ رات، یہ گرمی، یہ سردی، یہ بہار، یہ برسات سب سورج کے دم سے ہیں اور ماورائے شمس بھی کائنات ہے، بلکہ کائنات ہے ہی ماورائے شمس و قمر اور جہاں نہ دن ہے نہ رات وہاں بھی وقت ہے۔

وقت کب شروع ہوا اور کب ختم ہو گا.... اس کا فیصلہ بھی مشکل ہے۔ وقت قدیم بھی ہے اور حادث بھی.... قدیم وہ جو ہر آغاز سے پہلے اور ہر انجام کے بعد قائم رہے۔ جس کا نہ یوم پیدائش ہو نہ یوم وصال.... ہم خالق کو، اللہ کو قدیم مانتے ہیں اور وہ ہے بھی قدیم۔ کسی اور ذات یا کسی اور شے کا قدیم ہونا خالق کی احدیت کے باب میں شرک ہے۔ حادث وہ جو پیدا ہو اور ایک خاص محدود عرصہ کے بعد مر جائے۔

جو لوگ وقت کو قدیم مانتے ہیں وہ وقت کو خالق ہی مانتے ہیں۔ جو لوگ وقت کو قدیم نہیں مانتے۔ وہ اسے مخلوق سمجھ کر حادث اور فانی کہتے ہیں۔ وقت کو فانی ثابت کرنا مشکل ہے۔

حادث و قدیم کے بارے میں بڑی بحث ہوتی رہی ہے۔ اللہ قدیم ہے۔ انسان حادث.... کوئی انسان جب قدیم نہیں ہو سکتا تو کسی انسان کی حیات بعد ممات بالوجود کیسے تسلیم ہو سکتی ہے۔ اسی بات پر مسلمانوں کے اندر اختلاف رہا ہے۔ حیات النبیؐ کا مسئلہ یہی ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ قدیم کے بارے میں جتنا علم دنیا میں موجود ہے، حادث کے ذریعہ سے ہے۔ اللہ کا کلام اللہ کی صفات، اللہ کے احکامات و ارشادات سب انسانوں ہی کے ذریعہ سے ہیں۔ اب یہ سوچنا چاہیے کہ وہ کون سا مقام ہے، جہاں حادث اور قدیم ایک دوسرے سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ قدیم جب حادث سے کلام کرتا ہے، تو کلام بھی قدیم .... قدیم کا قدیم کلام، حادث کو حادث کیسے رہنے دے گا۔

اللہ کا ارشاد کہ وہ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں۔ اس کی تفصیل کچھ بھی ہو، یہ ایک حقیقت ہے، لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ یہ درود کا سلسلہ قدیم نے

۱۔ کب شروع کیا۔

۲۔ کب تک رہے گا یہ سلسلہ۔

اگر حضورؐ کی ظاہری پیدائش مبارک سے یہ سلسلہ شروع ہوا تو کلام قدیم نہ ہوگا۔ اور اگر یہ سلسلہ آپ کے ظاہری وصال مبارک پر ختم ہو جاتا ہو، تو بھی یہ کلام قدیم نہ ہوگا۔ ہم ثابت کچھ نہیں کرنا چاہتے۔ صرف یہ عرض ہے کہ قدیم کا عمل بھی قدیم ہے، قدیم کا وجود بھی قدیم ہے، قدیم کی محبت بھی قدیم ہے اور قدیم کا محبوبؐ بھی قدیم ہی ہے۔

حدوث و قدم کی یہ بحث یوں ختم ہو جاتی ہے کہ

ہے قِدم حدوث سے ماورا
تو قِدم حدوث کا ہے گماں
ہے قِدم کا جلوہ حدوث میں
تو قِدم حدوث کی ضد کہاں؟

بہر حال یہ اُن کی بات ہے، وہی جانتے ہیں۔ قدیم حدوث سے باہر نہیں، جدا نہیں۔ نہ ہی قدیم حدوث میں پابند ہے اور نہ مبتلا ہے۔ ہر جلوہ قدیم کا جلوہ ہے لیکن کوئی جلوہ از خود قدیم نہیں۔ یہی حد ہے، ادب کی حد .... حفظِ مراتب کی حد، عابد اور معبود کی حد ....

خالق اور مخلوق کی حد ..... راز اور محرم راز کی حد .....

بہر حال ہم وقت کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے کہ وقت قدیم ہے کہ حادث؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے۔

وقت کے لامحدود خزانوں سے ہمیں چند محدود ایام ملتے ہیں۔ ہم اس وقت کو زندگی کہتے ہیں! اسے گزارتے ہیں خوشیوں کے ساتھ، غم کے ساتھ، محفلوں میں، تنہائی میں، محنت کے ساتھ، آرام کے ساتھ۔ ہمیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان ایام کو ہم کیا کریں۔

مجبوری دیمک کی طرح ہماری زندگی کو چاٹ لیتی ہے، گھن کی طرح کھا جاتی ہے۔

ہم کچھ نہ کچھ بننا چاہتے ہیں بلکہ ہم سب کچھ بننا چاہتے ہیں اور سب کچھ بنتے بنتے ہم انجام کار بے وقوف بن کے رہ جاتے ہیں۔

ہم وقت کو بچاتے ہیں۔ اسے بچاتے بچاتے ایک دن ایسا آتا ہے کہ فرشتہ ہمارے کان میں کہتا ہے کہ ختم ہو گیا..... وقت ختم ہو گیا..... کیسے ختم ہو گیا..... میں نے خرچ نہیں کیا..... ختم کیسے ہوا..... یہ ظلم کہ جمع کیا ہوا، خرچ سے پہلے ختم ہو گیا.....؟

انسان کو جب یہ نکتہ سمجھ میں آتا ہے، اس پر جب یہ راز منکشف ہوتا ہے، تو وہ ہنستا ہے اور اس کی آنکھ میں آنسو ہوتے ہیں۔ مسافر کا سفر طے نہیں ہوتا اور ختم ہو جاتا ہے۔

انسان وقت کے تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہوتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ منزلیں طے ہو رہی ہیں، فتوحات ہو رہی ہیں لیکن آخر کار یہ گھوڑا، اپنے سوار، بلکہ شہسوار کو گرا کر بے یار و مددگار چھوڑتا ہوا غائب ہو جاتا ہے، اپنے نئے سوار کی تلاش میں..... وقت ختم ہو جاتا ہے لیکن وقت کا قافلہ چلتا رہتا ہے۔ حادث اور قدیم کی بحث جاری رہتی ہے۔

ہماری زندگی وقت ہی ہے۔ ہمارے پاس بڑا وقت ہے، لیکن ہمارے پاس کوئی وقت نہیں..... ہماری ساٹھ سال کی اوسط زندگی میں بیس سال تو نیند کے حوالے ہو جاتے ہیں۔ ہم اپنا وقت گزارنے کے لیے کچھ وقت بیچ دیتے ہیں۔ نوکری کرتے ہیں، مزدوری کرتے ہیں، آزادیوں

میں غلامی کرتے ہیں اور اس کے عوض جو معاوضہ ملتا ہے اس سے زندگی کو باشعور اور باسلیقہ بناتے ہیں۔ جب شعور اور سلیقہ حاصل ہوتے ہیں تو ہم خود ہی لاحاصل ہو چکے ہوتے ہیں۔ ہم نے جو خرچ کیا وہ خرچ ہو گیا۔۔۔۔ جو بچایا وہ بھی خرچ ہو گیا۔۔۔۔ ہمارا قوی وجود آخر کار ریت کی دیوار کی طرح اندر ہی گرتا ہے اور یہ وجود ناموجود ہو جاتا ہے۔

جن لوگوں نے اپنے وقت کو خوش گوار مستقبل کے لیے گزارا، وہ نہ سمجھے کہ وہ خوش گوار مستقبل کب آئے گا۔۔۔۔ زندگی ایک خوف ناک اور حسرت ناک ماضی بنتی جا رہی ہے اور نگاہیں خوش گوار مستقبل پر لگی ہیں۔

وقت ضائع کرنے کا خوبصورت طریقہ یہی ہے کہ ایک نامعلوم موہوم لیکن حسین مستقبل کا انتظار کیا جائے۔ خوابوں کے خوبصورت آئینوں میں نظارے دیکھے جائیں۔۔۔۔ لیکن جب حقائق پر نظر پڑے۔ تو طلسم ختم ہو جاتے، آئینے ریزہ ریزہ ہو جائیں اور خوبصورت خواب ایک بھیانک تعبیر دے کر رخصت ہو جائے۔ وقت کی محنت، عمر کی کمائی، وقت ہی برباد کر دے۔۔۔۔

جو لوگ اپنے وقت کا معاوضہ اپنے وقت میں وصول کرنا چاہتے ہیں، وہ اکثر برباد ہو جاتے ہیں۔ یہ زندگی، یہ عمر، یہ زمانہ، یہ وقت کسی اور وقت کے لیے محنت کا زمانہ ہے۔ یہ زندگی کسی اور زندگی کی طرف ایک قدم ہے۔ یہ وقت کسی اور وقت کی طرف رجوع کا وقت ہے۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں جتنے بھی قابلِ ذکر اور قابلِ قدر نفوس آئے وہ ہمیشہ وسیع، کائناتی، عظیم تخیل کے مطابق کام کرتے رہے۔۔۔۔ انھوں نے اپنے زمانے سے اپنے وقت کی قیمت نہیں حاصل کی اور آج ہر زمانہ ان کا اپنا زمانہ ہے۔ کوئی زمانہ ان کے ذکر سے خالی نہیں۔ کوئی دور اُن کے دور کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ کوئی بقا ان کو فنا سمجھ کر ترک نہیں کر سکتی۔۔۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کو وقت نے اپنے ساتھ ملا لیا۔۔۔۔ جن کو قدیم نے حدوث سے نجات دے دی۔۔۔۔ سلام ہو ان فانی انسانوں پر جن کا ذکر ہمیشہ باقی رہتا ہے۔۔۔۔ یہاں ایک بار پھر حادث اور قدیم کی بحث ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں فنا بقا کے رموز آشکار ہوتے ہیں،

یہاں زمانہ، ہر زمانہ ہو جاتا ہے۔

بات بڑی آسان ہے۔ اگر انسان وقت ہو جائے، تو ہمیشہ رہے گا۔ ۔ ۔ ۔ اگر وقت انسان ہو جائے، تو باقی نہ رہے گا۔ ۔ ۔ ۔ انسان نے وقت کو تقسیم کر کے خود کو برباد کیا ۔ ۔ ۔ ہمارا وقت گھڑیاں کھا گئی ہیں ۔ ۔ ۔ گھڑیاں بڑھ گئی ہیں اور عمر گھٹ گئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ جب پیمائش نہیں تھی، وقت وسیع تھا ۔ ۔ ۔ جب پیمائش ہو گئی ۔ ۔ ۔ پروگرام بن گئے، پابندی شروع ہوئی ۔ ۔ ۔ باقاعدگی کی وبا پھیل گئی ۔ ۔ ۔ ۔ وقت بیمار ہو گیا ۔ ۔ ۔ کیونکہ وقت نہ دن ہے نہ رات ۔ نہ موسم، نہ تاریخ ۔ ۔ ۔ ۔ وقت بس وقت ہے۔ ہر آغاز سے آزاد، ہر انجام سے بے نیاز!!



جو سکھیاں رنگ راتڑی کریں سوچ بچار
ایک ہی بوند میں رنگنے اڑنا ہے سو بار



ندی کنارے میں کھڑی جانا ہے اس پار
رام بھروسے چل پڑوں تن نیّا من کھیون ہار



واصف کہے کبیر سے سنو ہمارے یار
ہم تم جیسے جگت میں آئیں نہ دوجی بار

یاد

بس یہی تو مشکل ہے کہ بھول جانا انسان کے بس میں نہیں۔ جو حادثہ ایک دفعہ گزر جائے، وہ یاد بن کے بار بار گزرتا ہے۔ بھولنے کی کوشش ہی اُسے زندہ رکھتی ہے۔ انسان ظالم کو معاف کر سکتا ہے، لیکن اس کے ظلم کو بھول نہیں سکتا۔ بھول جانا انسان کے اختیار میں نہیں۔

انسان کیسے بھول سکتا ہے کہ اس نے جو چہرے کبھی شوق سے دیکھے تھے، اب وہ نظر نہیں آتے۔ جو کبھی سوچا تھا، کبھی چاہا تھا، اب وہ ویسا نہیں۔

موسم گزر جاتے ہیں، لیکن یاد نہیں گزرتی۔ مرحوم زمانوں کی یاد مرحوم نہیں ہوتی۔ وقت گزر جاتا ہے۔ ہمیشہ گزرتا رہا، لیکن گزرتے گزرتے انسان کے چہرے پر جھریاں چھوڑ جاتا ہے۔ ماضی کی یاد انسان کے وجود کو ڈھانپ لیتی ہے۔ لباس کی طرح نہیں، جلد کی طرح۔ کھال کی طرح انسان یاد کے پیرہن میں لپٹ جاتا ہے اور پھر کچھ بھولنے کا خیال بھی بھول جاتا ہے۔

پُرانے چہرے نئے چہروں میں نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پرانے غم نئے غم میں شامل نظر آتے ہیں۔ پُرانی یاد نئی زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ تہہ در تہہ یاد انسان کے اندر ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ آئینہ گرد آلود ہو جائے تو گرد کے ذرات میں کئی آئینے نمودار ہو جاتے ہیں اور پھر یاد سے نجات کی کوشش دلدل سے نجات کی کوشش کی طرح رائیگاں ہو جاتی ہے۔

انسان کے پاس اپنی لوحِ محفوظ ہے 'قوتِ حافظہ'۔ انمول خزانہ۔ آنسوؤں اور مسکراہٹوں کا خزینہ۔ انسان اس سے نجات نہیں پا سکتا۔ جو کبھی تھا، اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یہی زندگی کا عروج ہے اور یہی اس کا زوال۔

انسان کی یادیں اُس کے تجربات اُس کے مشاہدات اور اس کی واردات کے علاوہ بھی ہیں۔ انسان کے علم نے اسے اُن یادوں میں شریک کیا ہے' جو اُس کی اپنی نہیں۔ جن واقعات میں وہ کبھی شامل نہیں تھا، وہ اپنے آپ کو شامل سمجھتا ہے۔ جو کچھ اس نے دیکھا تک نہیں' وہ اس کی گواہی دیتا ہے۔ آنسوؤں سے تحریر کرتا ہے، رو رو کے بیان کرتا ہے' جیسے وہ اس کی اپنی ذاتی یاد ہو۔

کربلا میرا تجربہ نہیں' میری واردات نہیں، میرا مشاہدہ نہیں، لیکن میری یاد ہے۔ میرا احساس ہے' جو کربلا سے گزرا ہے۔ وہ بیان جو میرے احساس میں اُتر گیا، میرا تجربہ بن گیا، میری یاد بن گیا۔ امامِ عالی مقام کی کربلا، میری کربلا ہے۔ ہر کربلا، ایک ہی کربلا ہے۔ صداقت کا قافلہ جس مرحلے سے گزرا، ہمیشہ اسی مرحلے سے گزرتا رہا ہے۔ یہی اصل کربلا ہے کہ کربلا ابھی ختم نہیں ہو رہی میرے اللہ! کیا میری کربلا دائمی ہے؟

کربلا ہمیشہ دائمی ہوتی ہے۔ چراغِ صداقت آندھیوں اور اندھیروں کی یلغار میں ہمیشہ جلتا ہے۔ حق کا چراغ کبھی نہیں بُجھتا۔ مسلسل کرب، مستقل خلش، دائمی حقیقت' روشن چراغ۔

کربلا کسی واقعہ کا نام نہیں' بلکہ کربلا ایک دائمی استعارہ ہے۔ ایک لازوال غم، ایک ابدی حقیقت۔ ایک اٹل فیصلہ، ایک خاموش طوفان، ایک ایسا سکوت جس کے دامن میں حق کی آواز ہے، ایک ایسا موڑ جس کے آگے کوئی راستہ نہیں' ایک آخری اعلان۔ کربلا زندہ ہے' میرے ساتھ ساتھ، میرے سامنے، میری یاد میں۔ بھول جاؤں؟ مگر کیسے؟

میں کیسے بھول جاؤں کہ میں بہت ہی قدیم مخلوق ہوں۔ میری وجہ سے مقرب معتوب ہُوا۔ جس نے مجھے سجدہ کیا' اُسے کیسے بھول جاؤں۔ جس نے سجدے سے انکار کیا اسے کیسے بھلا دوں۔ میں نے جس کا سجدہ کیا' اُسے کیسے فراموش کروں۔ میں اور میرے ساجدین اور منکرِ سجدہ سب فانی ہیں۔ صرف میرا مسجود ہی باقی ہے۔ حقیقت' ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی حقیقت' جسے کوئی نہیں بھول سکتا۔ نہ ماننے والوں کو بھی یاد رہتا ہے۔ انہیں یاد رکھتا ہے۔ اسے بھولنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

میں اُس زمانے کو کیسے بھول جاؤں' جب میں نہیں تھا، میرا ذکر تک نہیں تھا، میرا وجُود تک نہیں تھا۔ مجھے وہ زمانہ بار بار یاد دلایا جاتا ہے کہ "یاد کر اُس زمانے کو جب تو شئے مذکور نہیں تھا۔"

میں نہیں تھا تو میں کیسے یاد کروں اور اگر مجھے یاد ہے تو میں کیسے نہیں تھا؟ میں اس دور کو نہیں بھلا سکتا۔ میرا نہ ہونا، ہونا، سب برحق ہے اور مجھے یاد ہے۔

مجھے ہر زمانہ اُداس کرتا ہے۔ قبل از پیدائش کا زمانہ، حال کا زمانہ اور مابعد کا زمانہ میرے پاس سب یادیں ہیں۔ اداس لیکن موجود اور محفوظ۔

میں نے زندگی کو مشاغل کی نذر کیا تاکہ میں سب کچھ بھول جاؤں۔ لیکن ہنگامہ ہائے سُود وزیاں میں بھی مجھے یادوں نے اداس رکھا۔ میرے ساتھ ساتھ میری یادیں رواں دواں ہیں۔ مجھے نخلستانوں کے ٹھنڈے سائے مسافرت کی اذیت کی یاد سے نہ بچا سکے۔ میری نیندیں خوابوں کے سفر پہ روانہ رہتی ہیں۔ میں ہونے سے نہ ہونے کا سفر کرتا ہوں اور نہ ہونے سے ہونا دریافت کرتا ہوں۔ مجھے میرے حافظے نے غیر محفوظ ہونے کا احساس دیا ہے۔

الٰہی! مجھے بھول جانے کی طاقت دے۔ صداقت کی یاد میری زندگی کے کذب کو بے کیف بنا رہی ہے۔ عہدِ وفا کی یاد میری جفا پرستی کو بے لطف کر رہی ہے۔ مجھ پر ایسی تنہائی گزر رہی ہے کہ اب میں بھری محفلوں میں تنہا ہوں۔ میرے اللہ! تُو تو قادر ہے۔ مجھے بھول جانے کا عمل سکھا دے۔ مجھے میرے ماضی سے نجات دے۔ یہ بھوت میرے سر پر سوار ہے۔ میں کیسے نجات پاؤں؟

میں بڑی کوشش کرتا ہوں کہ بھول جاؤں اس زمانے کو جب میں مہاجر ہُوا۔ بڑا وقت تھا۔ بڑی بات تھی۔ بڑی دلیل تھی۔ ملک بن رہا تھا۔ ملک چھوڑا جا رہا تھا۔ بنے ہوئے مکانوں کو چھوڑ کر نئی بستی، نئی آبادی کی تلاش کا سفر۔ تیرے نام کا سفر۔ کیا وہ سفر ابھی جاری ہے؟

میرے اللہ! وہ زمانہ یاد رکھنے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے۔ آج کا زمانہ سہانا ہے۔ بیتے ہوئے دن کیوں یاد رہتے ہیں۔ قافلے چلے، قافلے کٹے، قافلے لُٹے۔ عزتیں خاک میں ملیں، جذبے بلند ہوئے۔ تسبیح تہلیل اور مناجات کے ساتھ سفر جاری رہا۔ یہ سفر سب کو یاد تھا، سب بھُول گئے۔ مجھے بھی بھُول جانا چاہیے۔ بھولنے کی توفیق دے میرے مالک! جو ہُوا سو ہُوا۔

انگریز سے نجات، بنیئے سے نجات اور پھر ایک دوسرے سے نجات۔ یہ کیا یادداشت

ہے ؟ میں بھولنا چاہتا ہوں اس رات کو جب مجھ پر قیامت نازل ہوئی تھی۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بنا تھا۔ آزاد قوم دو دفعہ آزاد ہوئی ــــ میرے بھائی سلامت رہیں۔ لیکن میں نہیں بھول سکتا۔ میرے عزیز اُس سرزمین میں شہید ہوئے۔ اپنا دیس پردیس بن گیا۔ میں کربلا کا مکین ہوں۔ میں کیسے بھول جاؤں؟

میری تاریخ کے روشن اوراق پھاڑ دیے گئے، عزتوں کے تمغے نوچے گئے، بہادری کے قصے ختم ہوئے، شجاعت کی داستان پارہ پارہ ہوئی۔ میں کیسے بھول جاؤں؟

میں سبق در سبق ورق گردانی کرتا ہوں۔ اپنی تاریخ دیکھتا ہوں۔ ماضی اور یادِ ماضی میرا حال ہے اور میرا حال بُرا حال ہے۔ میں بدحال ہوں۔ مجھے میری یاد کے کرب سے بچا میرے مولا! میں دیکھ رہا ہوں کہ مسرت کدے آباد ہیں۔ جشن منانے جا رہے ہیں اور ریمسن کے بال بڑھ چکے ہیں۔ میرے اللہ! آگاہ کر دے سب کو۔ آگاہ راز کہ کیا ہو چکا ہے۔ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ قافلہ پڑاؤ میں ہے اور دشمن شبخون کے ارادے سے بیدار ہے۔ میرے اللہ! ایک ایسی چیخ لگانے کی قوت دے کہ جس کی قبر سے غافل مُردے نیند کا کفن پھاڑ کر نکل آئیں اور اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھیں جو دیدۂ بینا کو نظر آتا ہے۔ میرے اللہ! روک اس طوفان کو جس سے افغان مجاہدین اور مہاجرین گزر رہے ہیں۔ یہ تیرے نام لیوا ہیں ہم سے زیادہ اسلام پرست! میں بھول جانا چاہتا ہوں اقبال کے کلام کو۔ اقبال کے پیام کو۔ میرے اللہ! میری دعا ہے کہ اقبال کے کلام سے مسجدِ قرطبہ کی نظم غائب ہو جائے تاکہ میری یادیں احساس کی شدت و کرب سے آزاد ہو جائیں۔

مسجد قرطبہ سے مسجد اقصیٰ کی یاد ایک لازم کڑی ہے۔ میرے مالک مجھے بھی یاد ہے، مسجد اقصیٰ۔ تُو وہ اللہ ہے جس کے سامنے ماضی، حال اور مستقبل ایک ہی زمانہ ہے۔ تو جو چاہے کر سکتا ہے۔ میں تو صرف رو سکتا ہوں اور میری یادوں نے مجھے آنسوؤں کے سوا دیا ہی کیا ہے؟ مجھے بچا میری یادوں سے۔ میری عبادت پریشان ہو رہی ہے، یادِ ماضی کی وجہ سے۔ میں

یکسوئی سے محروم ہو رہا ہوں۔ میرے مولا! بھلا دے مجھے سب کچھ۔ برداشت سے زیادہ بوجھ نہ ڈال کہ تو مہربان ہے۔ میرا مستقبل میرے ماضی سے نجات نہیں پاسکتا۔

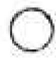
یہ عجیب بات ہے کہ میرا اسلام بہت پہلے مکمل ہو چکا، لیکن وضاحت ابھی جاری ہے۔ میرے عروج کے زمانے گزر چکے۔ میری تاریخ کا سنہری دور ماضی میں ہے۔ میری شجاعت کی عظیم داستان میرے ماضی میں ہے۔ میرے قافلے کے عظیم راہنما سب ماضی میں ہیں۔ میرے علما، میرے مشائخ، میرے سلطان المشائخ، میرے سلطان الفقرا، سب ماضی میں ہیں۔ میرے غزالی، میرے رومیؒ، میرے اقبالؒ، میرے قائد اعظمؒ، میرے امام سب ماضی میں ہیں۔ اور میں یادوں سے بچنا چاہتا ہوں۔ میرے سفر کی ہر انتہا میرے ماضی میں ہے۔ میرا شعر، میرا آہنگ، میرا وجدان، میرا عرفان، میرا ایقان، میرا فقر، میری فتوحات، سب عہد ماضی ہے۔ میرے مالک! مجھے بتا کہ کیا میں مر تو نہیں چکا؟ کیا میں زندہ ہوں؟ میرے لیے ماضی کی یاد کے علاوہ بھی کوئی کام ہے؟ میرا حسنِ عمل ماضی، میرے اکابرین ماضی، میرے صالحین ماضی، میرے چراغ ہائے یقین ماضی، میری عظمتوں کے سب نشان ماضی، میری ساری کائناتِ رنگین ماضی۔ اب میں کیا کروں۔ مجھے اس موت سے بچا میرے خدا! میرے اللہ! مجھے ایسا مستقبل دے جو میرے حال کی پہچان سے عبارت ہو۔ مجھے ایسا حال دے، جو میری یاد سے ماسوا اور ماورا ہو۔ مجھے پھر سے زندہ کر، میرے مالک! میرے لیے تُو اور تیرا حبیبؐ ہی کافی ہیں۔ مجھے یادوں کی خانقاہوں سے آزاد کر۔

میرے اللہ! مجھے پھر سے اپنا بنا، ہمارا بن جا، راضی ہو جا۔ تو ہمیں آج کا شعور عطا فرما۔ ہم نئی یادیں لکھیں۔ نئے عزائم لے کر نئے مستقبل کی طرف نئے انداز سے آغاز کریں۔ نئے سورج تراشنے کے لیے نئے حوصلے دے۔ یادیں اور صرف یادیں، باتیں اور صرف باتیں عمل کے پاؤں میں بھاری زنجیر ہیں۔ بس تیری یاد ہی کافی ہے۔ اور کیا کیا یاد کریں ہم ناتوان لوگ!

مجھے دے جو میں مانگتا ہوں۔ مجھے حال کا تشخص دے۔ مجھے کوئی نیا نام دے، نیا ولولہ، نیا جذبہ، نئی امنگ۔

مَیں ایک عجیب قوم ہوں، ایک ایسی قوم جس کی تمام تر روشنی ماضی میں ہے۔ جس کے پاس طاقتور یادگاریں ہیں' حسین مقبرے ہیں' مقدس مقامات ہیں' بڑے بڑے ایام ہیں' یادِ ایام ہے' جس کا مزاج روایت پرستی ہے' جسے آئینۂ ایام میں صورتِ حال تلاش کرنے کا شغف ہے۔ مَیں ایک عظیم و قدیم قوم ہوں جس کے پاس بڑی بڑی وراثتیں ہیں' بڑی بڑی یادیں ہیں۔ میں عجیب قوم ہوں۔ میری کربلا کب کی ختم ہو چکی ہے' لیکن میں ایک غریب فرد ہوں۔ میری کربلا جاری ہے۔ میں یادوں کے حصار میں جکڑا ہوا ہوں۔

میرے مالک! مجھے آزادی دے۔ یادوں کے جزیروں' خوابوں اور سرابوں کے جزیروں سے نکال مجھے۔ مجھے اذنِ گویائی دے' مجھے سکوت کے برفانی غاروں میں منجمد نہ کر' مَیں بے کیف یکسانیت سے گھبرا گیا ہوں' مجھے اپنی نئی شان دکھا' نیا جلوہ عطا کر' مجھے حال کا علم دے' حال کا عمل دے۔ میں دریا ہوں' مجھے تالاب نہ بنا۔ مَیں تیرا مسافر ہوں' مجھے مقامات کے جمود سے نکال' ذرّے کو جمالِ آفتاب دے۔ قطرے کو وسعتِ بحر عطا کر' میرے حال کو ذوقِ علم دے' مستیٔ کردار عطا کر' میرے ماضی کو ماضی ہی رہنے دے۔ میرے مولا! مَیں توحید پرست ہوں' مَیں یادوں کا بُت توڑ رہا ہوں' میں یادوں کی کشتیاں اور کشتیوں کی یاد جلا رہا ہوں۔ میرا ہر لمحہ اندلس کا ساحل ہے۔ مَیں زندہ ہوں' ماضی سے آزاد۔ حال میرا حق ہے۔ مجھے میرا حق دے میرے آقا!



حال کے عمل سے ماضی کا عمل بدل سکتا ہے۔ ماضی کفر ہو تو حال کلمہ پڑھ کے مومن ہو سکتا ہے۔ حال مومن ہو جائے' تو ماضی بھی مومن۔

آرزو اور حاصلِ آرزو

اگر آرزوئیں گھوڑے بن جائیں، تو ہر احمق شہسوار کہلائے گا، لیکن آرزو گھوڑا نہیں بن سکتی۔

آرزو ایک خوبصورت تتلی ہے جس کو پکڑنے کی خواہش میں ہم نہ جانے کہاں سے کہاں نکل جاتے ہیں۔

آرزو کا دام سب سے زیادہ دلفریب اور سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ اکثر ناکامیاں آرزو کا انعام ہیں اور اکثر انسان کشتگانِ آرزو ہیں۔ آرزو کیا ہے اور اس کا مدعا شکستِ آرزو کے علاوہ کیا ہے؟ اس پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، لیکن آج ہم آرزو اور آرزو کے حاصل کے رشتوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

اگر آرزو حاصل سے بڑھ جائے، زیادہ ہو جائے، تو انسان دُکھی ہو جائے گا، غریب ہو جائے گا، افسردہ رہنا شروع کر دے گا۔ آج کا انسان اسی المیے سے گزر رہا ہے۔ خواہشات اور آرزوئیں بڑھتی جا رہی ہیں، حاصل اور زندگی کی چادر سمٹتی جا رہی ہے اور انسان آسائشوں کی بھرمار کے باوجود کسمپرسی کی حالت محسوس کر رہا ہے۔ آج کی ترقی اور ترقی پذیری اور ترقی یافتگی نے انسان کو کثیر المقاصد بنا دیا ہے۔ وہ خواہشات اور آرزوؤں کے انبار تلے دب گیا ہے۔ آج کا انسان سسک رہا ہے، کراہ رہا ہے۔ آج کی خوشی صرف ضبطِ غم کا شعور ہے۔ آج کا معاشرہ اجتماعی مسرتوں کا قائل ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان مسرت کدوں میں خوش نظر آتا ہے اور غمکدوں میں تنہا ہے۔ اس کا اپنا گھر دعوتوں میں جگمگاتا ہے اور تنہائیوں میں ٹمٹماتا ہے۔

آرزو کا بے ہنگم پھیلاؤ انسانی وجود اور انسانی خون میں سرایت کر چکا ہے۔ لامحدود خواہش ہو یا حاصل، محدود زندگی کے لیے عذاب ہے۔ ہم آرام کی آرزو میں ہی بے آرام ہو

رہے ہیں۔ سکون کی آرزو میں آج کا انسان مضطرب ہے۔ قیام کی خواہش میں مسافر ہے۔ آرزو کے تعاقب نے انسان کو انسان سے اجنبی کر دیا ہے۔ انسان اپنے آپ سے اجنبی ہے۔ آرزو نے ہر انسان کو ایک تنہا جزیرہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

اگر حاصل کو بڑھانے کی تمام تر کوشش ناکام ہو جائے، تو انسان اپنے آپ کو اپنی آرزو کا مقروض سمجھتا ہے اپنی آرزو سے شرمندہ ہوتا ہے اور یہ ندامت اس سے اعتماد چھین کر اسے اس کی اپنی نگاہ میں غیر معتبر بنا دیتی ہے۔ اور جو انسان اپنی نگاہ میں معتبر نہ ہو، اس پر کون اعتبار کرے گا؟

اسی طرح آرزو کا حاصل سے بڑھ جانا یا حاصل کا آرزو سے کم رہ جانا انسان کے اندر احساسِ شکست پیدا کرتا ہے اور انسان بے سبب ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ اس اعصاب شکنی کے بے رحم عمل سے گزرنے کے بعد انسان میں احساسِ کمتری کا پیدا ہونا لازمی نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان ہمارے دَور کا انسان ہمارے معاشرے کا انسان خود کو اپنے آپ سے غریب سمجھتا ہے۔ اپنے آپ پر ترس کھاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر نااہل قرار دے چُکا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم مِن حَیثُ القَوم ختم ہو چکے ہیں۔ یہ بہتان تراشی آرزو کے پھیلاؤ کے دَم سے ہے۔ حاصل آرزو تک نہ پہنچے، تو انسان اپنے آپ کو بدقسمت سمجھتا ہے۔ وہ کسی مستقبل پر یقین نہیں رکھتا۔ وہ اپنے فوری مستقبل اور مابعد سے مکمل طور پر مایوس ہو چُکا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ آرزو اور حاصل کے فرق کو کم کرے۔ آرزو کم کرنا مشکل نہیں ہے۔ جو چیز حاصل نہ ہو، اس کی تمنا کیوں حاصل ہو۔

آئیے دوسری حالت دیکھیں . . . جس انسان کی آرزو حاصل سے کم ہو، ایسے لوگ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو امیر سمجھتے ہیں۔ اُن کے لیے یہ زندگی ایک گلستان سے کم نہیں۔ دراصل ایسے لوگ اپنی استعداد اور اپنی محنت کو بھی کسی کا احسان سمجھتے ہیں۔ انہیں ان کی محنت کا صِلہ مل جائے تو اس صلے کو بھی کسی کا احسان مانتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ممنون رہتے ہیں۔ ہر شے کے ممنون، ہر شخص کے ممنون، ہر واقعہ کے ممنون۔ کم آرزو انسان

سدا بہار ہوتا ہے۔ دنیا کے عظیم انسان ہمیشہ کم آرزو تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس دنیا میں کوئی شے ایسی نہیں، جو انسان کو ہمیشہ زندہ رہنے کی استعداد دے سکے۔ جب ہر چیز کو چھوڑ ہی جانا ہے، تو پھر حاصل کیا ہے، محرومی کیا ہے، جیت کیا ہے، ہار کیا ہے۔

غور طلب بات تو یہ ہے کہ انسان جو کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ سب اس کے ذاتی کام کا نہیں ہوتا۔ وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے دل و دماغ کی آزادی قربان کر دیتا ہے۔ آرزو سے آزاد دل ہی شہنشاہ ہے۔ زیادہ آرزو والے انسان کی جیب بھرتی ہے، لیکن اس کا دل نہیں بھرتا۔ وہ حاصل کرتا ہے اور اس حاصل کو استعمال کرنے سے پہلے خود ہی اپنے وجود سے نکل جاتا ہے۔

کم آرزو انسان بہر حال بہتر ہے۔ وہ اپنے اعتماد کا امین ہے۔ وہ اپنی نگاہ میں معتبر ہے۔ اسے حاصل ہونے والی نعمتوں کے تقسیم کرنے کا شوق رہتا ہے۔ وہ دنیا کو اپنے حال میں شریک کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے آپ پر، اپنی زندگی پر، اپنے مستقبل پر، اپنے مابعد پر بڑا مطمئن رہتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کا سرِ نیاز بارگاہِ بے نیاز میں سرنگوں ہو کر سرفراز ہو جاتا ہے۔

تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو اپنے حاصل اور اپنی آرزوؤں کو رضائے الٰہی کے تابع کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگ تو بس ایسے لوگ ہیں۔ اُن کا کیا جواب، ان کا کیا کہنا۔

اگر زندگی اللہ کا حکم ہے، موت اللہ کا فرمان ہے، تو آرزو بھی اسی کے حکم سے ہے اور حاصل تو عین اسی کی منشاء کے مطابق ہے۔ ایسے لوگ کسی الجھاؤ کا شکار نہیں ہوتے۔ ان کے ہاں تقدیر اور تدبیر کے مسائل نہیں ہوتے۔ ان کے ہاں انسان کی مجبوری اور آزادی اور مختاری پر بحث نہیں ہوتی۔ ماننے والے دل سے مانتے ہیں۔ وہ صرف ماننا چاہتے ہیں، جاننا نہیں چاہتے۔

ایسے لوگ بہت قلیل ہیں، جن کی آرزو اور حاصل امرِ الٰہی کے تابع ہو۔ ایسے لوگ تسلیم و رضا کے پیکر، حرفِ آرزو سے بے نیاز، آزاد ہو کر اسی جہاں میں فلاح کی تصویر ہیں۔ آگاہ ہونے کے بعد ایک انسان کا کسی چیز سے امرِ الٰہی کے مطابق لگاؤ یا اجتناب بڑے نصیب کا مقام ہے۔ ایسے لوگوں کی زندگی ایک دریا کی طرح ہے، رواں دواں، خاموش، ساحلوں سے نکلتا ہوا بغیر

تحلیف کے اذنِ الٰہی کے تابع، اپنی آخری منزل کی طرف یقینِ کامل کے ساتھ گامزن۔ دریا کا مدعا نہ ساحل ہے نہ موجیں بلکہ دریا کا مدعا وصالِ بحر ہے۔ سمندر سے نکلنے والا دریا آرزو اور حاصل کو تابع فطرت کر کے واپس سمندر تک بخیر و عافیت پہنچ جاتا ہے۔

چوتھی قسم کے لوگ ہی آخری قسم کے لوگ ہیں۔ ان کی آرزو ان کی مجبوری ہے۔ اُن کی مجبوری اپنی بھی ہے اور کسی کی دی ہوئی بھی ہے۔ ہم جس طرح جانوروں کو ہانکتے ہیں اسی طرح یہ طبقہ بھی مظلوم الطبقات ہے۔ انسان نے انسان کے ساتھ جو ظلم روا رکھا ہے اس کی منہ بولتی تصویر یہ قسم ہے۔ یہ لوگ جن کی آنکھوں کی روشنی مدھم ہو چکی ہوتی ہے کچھ دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یہ لوگ غریب ہیں لیکن یہ اتنے لاچار ہیں کہ اس امیر کی زندگی کے حالات سن کر خوش رہتے ہیں جس نے ان کے حصے پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ یہ لوگ اپنا حق نہیں جانتے۔ یہ لوگ بیل کے بھائی بیل ہیں۔ ان کی کمر بوجھ سے جھک جاتی ہے لیکن ان کی زبان نہیں کھلتی۔ ان لوگوں کی تاریک راتوں کے دم سے ہی دنیا میں چراغاں ہے۔ ان کی خاموشی نے ہی ظالموں کو گویائی عطا کر رکھی ہے۔ ان کی مجبوری اور ان کی غلامی نے دوسروں کو آزادیاں عطا کر رکھی ہیں۔

ایسے لوگوں کو آرزو اور حاصل کا کیا پتہ۔ وہ صرف زندہ ہیں کہنے کو زندہ دیکھنے کو زندہ . . . . لیکن درحقیقت انسانی معاشروں کے چہرے پر داغ ہے تو یہی طبقہ جو آرزو سے بے خبر ہے اور حاصل سے بیگانہ۔

اپنے کسی ہمعصر محسن کے انتظار میں یہ طبقہ زندہ ہے۔ اس طبقے میں عقیدہ ہے، توانائی ہے، احساس نہیں ہے۔ اس طبقے سے اس کا عقیدہ اور اس کا تشخص چھینے بغیر اس کی خدمت کرنا باقی تمام طبقوں کا فرض ہے۔

غریبی دو قسم کی ہوتی ہے ایک مایوس ایک پُر اُمید۔ مایوس غریب کفر کے قریب ہوتا ہے اور پُر امید غریب ایمان کی بدولت اللہ کے حبیبؐ کے قریب ہوتا ہے۔

بہرحال حاصل اور آرزو کا کھیل ہی انسانی زندگی کا دلچسپ ترین کھیل ہے۔ آرزو حاصل سے بڑھ جائے تو انسان غریب، حاصل آرزو سے بڑھ جائے تو امیر۔ حاصل اور آرزو برابر ہوں تو متوکل اور اگر انسان حاصل اور آرزو کے رشتوں اور ان کی اصل سے باخبر ہی نہ ہو تو انسان . . . کوئی انسان ہے



مقابلہ

انسان انسان سے مقابلہ کرنے کو کامیابی اور ترقی کا زینہ سمجھتا ہے۔ زندگی کو زمانے سے مقابلہ کرنا ہے، بادِ مخالف سے ٹکرانا ہے، زندگی کو راہ کی دیواریں گرانا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ:

انسان کی راہ میں ستم ہائے روزگار حائل ہیں۔

انسان کو گردشِ لیل و نہار سے مردانہ وار گزرنا ہے۔

انسان مسافر ہے جس کی راہ میں فاصلے کی دیوار ہے۔

انسان کو انسانوں کے اژدہام سے راستہ لینا ہے۔

انسان کو فطرت کے ظلم سے نجات حاصل کرنا ہے۔

انسان کو خطرناک، ناہموار، اُونچے اور دشوار پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرنا ہے۔

انسان کا ہر شے سے، ہر موسم سے، ہر انسان سے، ہر بات سے مقابلہ ہے۔

انسان کی زندگی آزمائشوں کی زندگی ہے، دشواریوں کا زمانہ ہے، دکھوں اور آہوں کا تسلسل ہے۔

اور یہ زندگی انسان کے لیے ایک مشکل امتحان ہے، ایک کڑی منزل ہے، ایک بے آب و گیاہ صحرا ہے۔

انسان ایک کشتی کی طرح سمندر کی تُند موجوں کے رحم و کرم پر ہے۔

انسان دنیا میں اس لیے آتا ہے کہ وہ ایک شیشے کی طرح پتھروں سے ٹکراتا چلا جائے۔

انسان اس بے رحم جہان میں ظالم فلک کے نیچے اپنی قوتِ برداشت کو ڈھال بنائے، اپنے جذبے کو تلوار بنائے، اپنے حوصلے کو بلند رکھے اور انجام کار اس دشمنِ جاں زمانے کو زیر کرے۔

انسان کو صرف کوشش اور مسلسل کوشش، صرف مقابلے اور مسلسل مقابلے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

انسان کی راہیں اس کی بے مائیگی نے مسدود کر رکھی ہیں۔ انسان کو انسان سے بچنا ہے کیونکہ انسان انسان کو ڈستا ہے۔ انسان انسان کو ہڑپ کر لیتا ہے، نگل جاتا ہے۔ انسان انسان کا استحصال کرتا ہے۔ انسان انسان کو مجبوریاں دیتا ہے۔ انسان انسان کا سکون برباد کرتا ہے۔ انسان انسان کا سرمایہ لوٹ لیتا ہے۔ انسان انسان کی عزت خاک میں ملاتا ہے۔ انسان انسان کو حیوان بنا کے رکھ دیتا ہے۔ انسان انسان سے نجات صرف مقابلے سے ہی پا سکتا ہے۔ مقابلہ نہ ہو تو انسان انسان نہیں بن سکتا، ترقی نہیں کر سکتا، مہذب نہیں ہو سکتا، متمدن نہیں ہو سکتا بلکہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

مقابلے کا یہ تصور، انسان کو اس کی اعلیٰ روحانی اقدار سے محروم کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ مقابلہ بین الطبقاتی ہو یا بین الاقوامی۔ ایک بے درد، مادی اور غیر فطری وبا ہے۔ زندگی کسی مقابلے کا نام نہیں۔ زندگی تو بس زندگی ہے، ایک عطا ہے، ایک انعام ہے، ایک نوازش ہے، ایک ایسا کرم جس کے لیے شکر ضروری ہے۔

تاریخ عالم فتوحات و شکست، جرائم و سزا کا ایک ریکارڈ ہی نہیں بلکہ یہ محسنین کی داستان بھی ہے۔ مقابلہ کرنے والا کچھ لینا چاہتا ہے اور محسن کچھ دینا چاہتا ہے۔ بادشاہ مقابلے کرتے رہے اور آخر کار کھنڈرات کی شکل میں اپنی شہرت کی داستان چھوڑ گئے۔ ظلِ سبحانی اور عالم پناہ کہلانے والے آنجہانی اور فانی ثابت ہوئے۔

مقابلہ انسانوں میں نفرت کا بیج بوتا ہے اور مقابلے کی انتہائی شکل جنگ ہے، تباہی اور بربادی۔

انسانوں کی کھوپڑیوں پر بیٹھ کر شاہی فرمان جاری کرنے والے ہلاکو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قابلِ نفرت رہے۔

انسانی خون کے دریا بہانے والے آخر اسی دریا میں غلطاں نظر آئے۔ مقابلہ اپنے لیے فتح

چاہتا ہے اور دوسروں کے لیے شکست اور یہی مقابلے کی برائی ہے۔

زندگی کو جہادِ مسلسل کہنے اور اسے جدوجہد گرداننے والوں نے نہ جانے اسے کیا کیا بنا دیا۔

ہر ایک سے اُلجھنا، ہر مقام پر لڑنا، ہر بات پر بحث، ہر امر پر تبصرہ، ہر انسان سے دست "وگریباناں" ہر موضوعِ سخن پر سخن ترانیاں، ہر شے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنا، ہر ایک کو نیچا دکھانے کے لیے کوشاں رہنا، ہر مقام اور صاحبِ مقام کی خامی بلکہ خامیاں تلاش کرنا، ہر نظام پر برہم ہونا، نکلتے سورج سے خائف رہنا، ڈوبنے والے ستاروں سے نالاں رہنا، صاحبِ حیثیت کو صاحبِ استحصال کہنا، غریب کو بزدلی اور بے غیرتی کے طعنے دینا، اپنے ماں باپ سے ناراض، اپنی اولاد کے شاکی، اپنے وجود سے بیزار، دوسروں سے برسرِ پیکار، زندگی کو تیشۂ جاں اور حالات کو سنگِ گراں کہتے رہنا، خود کو ناقابلِ فہم کربِ مستقل میں مبتلا پانا، ہر طرف ظلم، استحصال دیکھنا، ہر جہاز کو پانی کی تہہ میں اترتے دیکھنا، ہر سفر کو مجبوری، ہر واقعے کو حادثہ کہنا، محبت کرنے والوں کو احمق سمجھنا، اپنی خود ساختہ دانائی کے قطب مینار سے زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑوں کو تمسخر سے دیکھنا، کاوشِ پیہم کا راگ الاپنا۔ غرضیکہ ہمہ حال بدحال رہنا ہی ایسے لوگوں کا مزاج بن کر رہ جاتا ہے۔

زندگی کو احمقانہ جھگڑالوپن سے علیحدہ کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ نعمت ایک احسان ہے، ایک تحفہ ہے، ایک مسکراتا ہوا پھول ہے، خوشبو اور رنگوں کا امتزاج۔ زندگی رواں دواں ایک پاکیزہ دریا ہے، جو کناروں کو سیراب کرتا ہوا چلتا رہتا ہے۔ فیض ہی فیض... تعاون ہی تعاون برکت ہی برکت....

انسان کو کیا ہو گیا ہے۔ انسان کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔ اس مسیحا کو کیا عارضہ لاحق ہے۔ اس معالج کو کیا روگ لگ گیا ہے، اس اشرف نے ہر شرف برباد کر دیا ہے۔

ہمیشہ رہنے کی خواہش نے زندگی کو عذاب بنا دیا ہے۔ انسان زندہ رہنے کے لیے مرتا جا رہا ہے، سسکتا جا رہا ہے۔ ہر شے کو ڈراتے ڈراتے خود ہی سہم گیا ہے۔

انسان کے اندر موہوم خطرات کے الارم بج رہے ہیں، صحت بیماری کی زد میں ہے، بیماری

ڈاکٹر کے عذاب میں ہے۔ مسافر راہزن سے لرزاں ہے۔ اچانک کسی انہونی کے ہونے کا اندیشہ کھائے چلا جا رہا ہے۔

آج کے انسان کا یقین متزلزل ہے۔ اس کا ایمان ختم ہو چکا ہے۔ وہ بھوکا ہے مال کا، اسے ڈر ہے غریب ہونے کا، اس لیے اسے نفرت ہے ماضی سے، حال سے، مستقبل سے۔ اسے مقابلے کی دعوت ہے۔ اسے مقابلے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اسے مقابلے کی اہمیت سکھائی گئی ہے اور اسی تعلیم میں اس کی صفاتِ عالیہ ختم ہو گئی ہیں۔

جب تک انسان اپنے عقیدے کی اصلاح نہیں کرتا۔ وہ اسی طرح سرگرداں رہے گا۔ وہ ٹکراتا رہے گا، اپنا سر پھوڑتا رہے گا، زندگی کا گلہ کرتا رہے گا، زندگی سے الجھا رہے گا اور اسی الجھاؤ میں اس کی سانس اکھڑ جائے گی اور پھر یہ سارے مقابلے، ساری فتوحات، سارے تمغے، سارے سرٹیفکیٹ، سارے سرمائے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔

وہ دنیا سے اپنے حاصل کو لاحاصل چھوڑتا ہوا رخصت ہو جائے گا۔۔۔ آندھی اور چراغ کو برسرِ پیکار دیکھنے والوں نے زندگی کو کیا دیکھا۔۔۔ آنکھ والے اندھے رہے۔

آندھی آتی ہے، چڑیا کا نشیمن اڑ جاتا ہے۔ صبح وہی چڑیا اپنی تسبیح و مناجات میں نغمہ سرا ہوتی ہے۔ اسے کسی واقعے اور سانحے کی پرواہ نہیں۔ وہ بس مجسم تشکر ہے، سراپا نغمہ۔

انسان غور نہیں کرتا کہ اسے بنانے والے نے کیا بنایا اور کیسے بنایا۔۔۔

انسان غور نہیں کرتا کہ اس کی بینائی کیا ہے۔۔۔ آنکھ بنانے والے نے بینائی کو نظاروں کی خوراک مہیا کی ہے۔ نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے بجائے انسان نے خود کو کج بیں بنا کے رکھ دیا۔ وہ حسن و رنگ تلاش کرنے کے بجائے اُن کے نقائص کا متلاشی ہو کر رہ گیا ہے، اس لیے کہ اسے مقابلے کا علم دیا گیا ہے، مطالعے اور مشاہدے سے محروم مقابلہ ہی مقابلہ، جہالت ہی جہالت، حماقت ہی حماقت۔

انسان محفوظ ہونے کی آرزو میں غیر محفوظ ہونا محسوس کرتا ہے اور اس احساس کو مقابلے

کے میدان میں لے جا کر اپنی زندگی برباد کرتا رہا ہے۔ وہ پستول کو اپنی جان کا محافظ سمجھتا ہے لیکن خود پستول کی حفاظت کرتا رہتا ہے۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون کس کا محافظ ہے۔

وہ دولت اکٹھی کرتا ہے تاکہ غریبی سے بچ سکے اور پھر اس دولت کو خرچ نہیں کرتا کہ غریب نہ ہو جائے اور اس طرح دولت کی موجودگی میں غریبانہ زندگی بسر کرتا ہوا آخر کار ہلاک ہو جاتا ہے۔ غریبی کا مقابلہ کرتا ہے اور غریبی ہی میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اپنے حال کے خود ہی مقابل ہے اور خود ہی خود کو ہلاک کرتا ہے۔

وہ امن چاہتا ہے اور اس کے حصول کو ممکن بنانے کے لیے جنگ کی تیاری کرتا ہے۔ امن کی خاطر جنگ . . . . مقابلے کا کرشمہ ہے۔

انسان ترقی کرنا چاہتا ہے، فیکٹریاں لگاتا ہے، مکان بناتا ہے اور ہر لمحہ ہر لمحے سے مقابلہ کرتا ہوا فیکٹری اور مکان کو چھوڑتا ہوا ایک مٹی کے تاریک گھروندے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روپوش ہو جاتا ہے۔

وہ بڑے بڑے ایام مناتا ہے، یادیں مناتا ہے، مقابلے بیان کرتا ہے . . . پرانے مقابلے پرانے واٹرلو . . . . پرانے پانی پت . . . . پرانے ابن قاسم، پرانے غزنوی . . . . . پرانے سومنات . . . .

وہ پرانی فتوحات پر نئے چراغاں کرتا ہے . . . . پرانی خانقاہوں پر نئے عرس مناتا ہے . . . . اور نئے چراغاں کے باوجود اس کے اپنے دل میں پرانے اندھیرے رہتے ہیں . . . . انسان نہیں سمجھتا۔ وہ کیسے سمجھے؟!! ڈھول کی تھاپ پر اور طبلے کی تال میں دھمال ڈالنے والا انسان بھول جاتا ہے کہ انسان کو عقل نام کی دولت بھی ملی ہوئی تھی۔ نہ جانے یہ دولت کہاں ضائع ہو گئی . . . . وہ تو صرف مقابلہ کرتا ہے . . . . ڈھول کا ڈھول سے، طبلے کا طبلے سے، آواز کا آواز سے اور اسی مقابلے میں اتنا محو ہوتا ہے کہ اصل واقعہ ہی بھول جاتا ہے۔ بس مقابلہ یاد رکھتا ہے دما دم مست قلندر . . . . نعرے لگاتا ہوا غافل انسان خاموش ہو جاتا ہے۔ یادیں مناتا ہوا

خود فراموش ہو جاتا ہے۔

عقیدے کی اصلاح نہ ہو تو مقابلہ جاری رہے گا۔ خیال کا مقابلہ وہم سے، ہوا کا مقابلہ ہوس سے، روایت کا مقابلہ حقائق سے، خواب کا مقابلہ حقیقت سے، مذہب کا مقابلہ ضرورت سے، ذات کا مقابلہ کائنات سے اور سیاست کا مقابلہ بیئات سے۔

عقیدے کی اصلاح یہ ہے کہ ہم یقین کر لیں کہ زندگی دینے والے نے ان تین باتوں کا فیصلہ کر رکھا ہے:

۱۔ زندگی کتنا عرصہ قائم رہے گی اور کب ختم ہو جائے گی۔ اسے کوئی حادثہ وقت سے پہلے ختم نہیں کر سکتا اور کوئی احتیاط اسے وقت کے بعد قائم نہیں رکھ سکتی۔ جب عرصۂ قیام مقرر ہو چکا تو مقابلہ کیا ہے۔ زندگی کا انجام جب موت ہی ہے تو پھر یہ کوشش اور مقابلہ کیا ہے؟

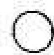
۲۔ عزت اور ذلت کوشش کے درجے نہیں، نصیب کے مقامات ہیں۔ ذرے کو آفتاب کب بننا ہے اور آفتاب کو گرہن کب لگنا ہے، اس کا فیصلہ ہو چکا۔ . . . پیدائش کے ساتھ ہی نیک نامی اور بدنامی کے ایّام پیدا ہو جاتے ہیں۔ . . . اب مقابلہ کس بات کا؟

۳۔ رزق مقرر ہو چکا . . . . مال کا رزق، سانس کا رزق، بینائی کا رزق، عقل کا رزق، ایمان و ایقان کا رزق۔ کوئی کوتاہی خوش حالی کو زوال نہیں دے سکتی۔ یہ فیصلہ ہو چکا، مقابلہ واہمہ ہے!

تو صاحبانِ عقل و بصیرت! زندگی ایک مختصر عرصہ ہے، ایک محدود قیام۔ ایک قلیل دَور۔ اسے بے مقصد دوڑ میں ضائع نہ کریں۔ . . . یہ محبت سے ملنے والا انعام محبت ہی کے لیے ہے، اسے نفرتوں اور جھگڑوں میں برباد نہ کیا جائے . . . . یہ خالق کی اطاعت اور پہچان کا زمانہ ہے۔ اسے مخلوق سے مقابلے میں خرچ نہ کیا جائے . . . . یہ ایثار اور خدمت کے لیے ہے۔ اسے ہلاکت کی نظر نہ کیا جائے . . . . یہ متاعِ قلیل ہے، کافرانہ طرزِ حیات کی تمنا میں صرف نہ کی جائے۔ اتنا پھیلو کہ سمٹنا مشکل نہ ہو، اتنا حاصل کرو کہ چھوڑنا مشکل نہ ہو۔ سکونِ قلب آسائشوں کے حصول سے نہیں، اصلاحِ ایمان سے حاصل ہوگا۔ . . . ترقی کسی ایسی دوڑ کا نام نہیں جس کے آگے آگے لالچ

ہو اور اس کے پیچھے خوف اور ندامت۔ ترقی ٹھہرنے، دیکھنے اور لطف لینے کا نام ہے۔۔۔۔ یہ مقابلے۔۔۔۔ یہ گردشیں، یہ کوششیں، یہ ہلاکتیں کس کام!!

ترقی خوبصورت اثاثوں کا نام نہیں، بلکہ خوبصورت احساس کا نام ہے، خوبصورت دل کا نام ہے۔ مکانات ترقی یافتہ نہیں ہوتے، مکین ترقی یافتہ ہوتے ہیں اور مکین انسان ہیں اور انسان کبھی سکون نہیں پائے گا، مگر اپنے خالق کے تقرب میں۔۔۔۔ اشیاء کا تقرب ہمیں افراد سے دور لے جا رہا ہے اور انجام کار مقابلہ کرتے کرتے ہم اپنے آپ سے بہت دور نکل جاتے ہیں اور جب ہم ہی ہم نہ رہے تو مقابلوں سے کیا حاصل؟



میرے سر پر جو ٹوٹا تھا
میری قسمت کا تارا تھا
کتنی صدیاں سمٹ رہی تھیں
اک لمحہ جب پھیل رہا تھا
آج میں صحرا میں ہوں پیاسا
کل میں دریا میں ڈوبا تھا
وقت گزر جاتا ہے لیکن
وقت بہت مشکل گزرا تھا

دل دریا سمندر

ہے۔۔۔۔ یہ

ت دل کا نام
ہیں اور انسان
یں افراد سے
نکل جاتے ہیں

زمین و آسماں

انسان پر بڑا دباؤ ہے۔ آج کا انسان بہت پریشان ہے، بڑے کرب میں مبتلا ہے۔ انسان کے لیے کثرتِ اعمال کی مجبوری ہے۔ بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ زندگی اپنی سادگی کھو چکی ہے۔ یک رنگی سے محروم ہے، ہماری زندگی۔

سب سے بڑا المیہ تو یہ ہے کہ سفر زمین کا ہے اور حکم آسمان کا۔ پریشانی تو ہوگی۔ ہم جہاں بھی جائیں آسمان سر پر ہی رہے گا بلکہ سر پر سوار رہے گا۔ ہم چلتے ہیں اور چلتے چلتے رستہ رک جاتا ہے۔ کچھ نہ کچھ کہیں نہ کہیں ہو جاتا ہے۔ بات بنتے بنتے بگڑ جاتی ہے۔ گردشِ فلک ہمارے آڑے آتی ہے۔ ہمیں چین نہیں لینے دیتی۔ ہمارے پیچھے پڑی ہے۔ ہمیں آسمان سے کوئی نہیں بچاتا۔ ہم مجبور ہیں۔ پہلے ماں باپ کا دباؤ، پھر معاشیات کے حصول کا پریشر اور پھر اولاد کی ذمہ داریاں ۔۔۔۔ ہم کسی مقام پر بھی تو آزاد نہیں ہیں۔ آسمان نے ہمیں محتاج بنا کے رکھ دیا ہے۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں اور تعجب ہے کہ روشنی آسمان سے ملتی ہے۔ ہمارے اپنے پاس بجلی کی روشنی ہے، لیکن پھر یہ روشنی بھی پانی سے ملتی ہے اور پانی آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ ہم پر ہر شے آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ مجبوری، بیماری، تنگدستی، موت، سب آسمان کی طرف سے ۔۔۔۔ آسمان ہی ہم پر مجبوریوں کے پتھر برسا رہا ہے۔ ہمیں جکڑ کے رکھ دیا ہے، آسمان نے ۔۔۔۔ ہمارے گرد حصار ہے۔ وقت کا حصار، مجبوری کا حصار، بے بسی کا حصار، بے بضاعتی کا حصار ۔۔۔۔ ہم کہاں جائیں؟ ہمارے پاس اندھیرے اور اندھیر نگریاں ہیں۔

ہمارے لیے، ہمارے دَور کے لیے کیا آسمان کے پاس اندیشوں اور مجبوریوں کے سوا

کچھ نہیں؟کیا آسمان اپنے سارے انعامات تقسیم کر چکا ہے؟کیا سب ٹرافیاں جیتی جا چکی ہیں؟
ہم شعر کہیں تو ہمارے اشعار غالب کے متروک کلام کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے.... بڑی ندامت ہے.... ہم ڈرامہ لکھیں تو اس کی انتہا یہ ہے کہ شیکسپیئر کے کسی ڈرامے کی گرد پا نظر آئے.... آسمان کے پاس کوئی نیا تحفہ نہیں.... کوئی نیا ملکہ آسمان سے نازل نہیں ہوتا...
ہم بہت سچے محب وطن بن جائیں تو قائد اعظمؒ کے مزار کے مجاور کا درجہ نصیب ہو سکتا ہے۔ہم بڑے مجبور ہیں.... ہمیں جب بھی منزلوں کا تازہ پیغام ملتا ہے، آسمان ہم پر ناراض ہو جاتا ہے۔ایک نئی دیوار ہماری راہ میں نازل فرماتا ہے۔ہم بڑے بے بس ہیں۔آسمان ہماری بے بسی پر خاموش ہے۔ہم پر غریبی نازل ہوتی ہے تو اتنی کہ ہم اپنی زندگی سے مایوس ہو جاتے ہیں.... اور دولت نازل ہوتی ہے تو اتنی کہ ہم دوسروں کو زندگی سے مایوس کر دیتے ہیں۔آسمان ہمیں توازن میں رہنے ہی نہیں دیتا....!!
ہم علم حاصل کریں تو ہمیں کسی جاہل سے سابقہ پڑ جاتا ہے اور جاہل تو بس جاہل ہی ہے.... آسمان کی طرف سے نازل ہونے والا راہ کا روڑا.... کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عیسیٰؑ بھاگے جا رہے تھے.... ایک شخص نے دیکھا کہ یہ ہیں تو وہی، مگر بھاگے کیوں جا رہے ہیں۔اس نے ڈرتے ہوئے کچھ پوچھنا چاہا.... حضرت عیسیٰؑ نے اشارہ کیا کہ وہ بھی بھاگے۔وہ دوڑا.... اس نے پھر پوچھا کہ "آپ عیسیٰؑ ہی ہو"....انہوں نے کہا "ہاں"....اس آدمی نے کہا "آپ وہی ہو جو مُردے کو زندہ کرتا ہے؟" انہوں نے کہا "ہاں"....اس نے کہا "وہ جو بیماروں کو شفا دیتا ہے".... انہوں نے کہا "ہاں"۔"تو آپ بھاگ کیوں رہے ہیں؟"....انہوں نے کہا "وہ دیکھو جو پیچھے آ رہا ہے۔وہ احمق ہے"....اس نے کہا "اس کا بھی علاج کرو"....عیسیٰؑ نے کہا "احمق کا علاج نہیں، کیونکہ یہ بیماری نہیں.... یہ عذاب ہے.... یہ گرفت ہے.... اس سے بچنا ہی بہتر ہے....!! یہ آسمان سے نازل ہونے والی بلا ہے۔اس سے پناہ مانگنے ہی میں عافیت ہے"
ہمارا دَور ایسی بلاؤں سے بھرا ہے۔یہ ابتلا آسمان کی طرف سے ہے۔زمین والوں کو

سراسیمہ کرنے کے لیے، ہماری مجبوریوں کو مزید مجبور کرنے کے لیے۔

ہم کتنے مجبور ہیں۔ صبح صبح گھروں سے نکلنے کے لیے مجبور اور ہر شام واپس لوٹنے پر مجبور۔ ضرورتیں اور مصروفیتیں بڑھتی جا رہی ہیں اور زندگی گھٹتی جا رہی ہے۔ ہر شخص ہمہ وقت مصروف ہے اور یہ مصروفیت بے مصرف ہے۔ یہ زندگی سسک سسک کے گزرتی ہے۔ کبھی آغاز رہ جاتا ہے، کبھی انجام رہ جاتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ دوستوں کے حلقے میں جان کے دشمن بیٹھے ہیں اور جان سے پیارے دشمنوں کے حلقے میں دکھائی دیتے ہیں.... ستم ہے، فلکِ ستم ایجاد کا... انسان سوچتا ہی چلا جاتا ہے۔ ہماری سوچ ہمارے عمل کو یکسر معطل کر دیتی ہے۔ ہم کچھ سوچ بھی تو نہیں سکتے.... ہم پر ماضی کا بوجھ ہے، مستقبل کا وزن ہے۔ ہم سوچتے ہیں تو خیال آتا ہے کہ سب کچھ پہلے ہی سے سوچا جا چکا ہے۔ ماضی کے مفکر ہمارے راستے کی دیوار ہیں۔ ہر خیال پرانا ہے۔ ہر بات پہلے ہی کی جا چکی ہے۔

ہمارے افکار تازہ نہیں.... ہم کوئی نئی بات کریں، تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم سے پہلے کوئی انسان کر چکا ہے۔ آسمان اپنے نوادرات لٹا چکا ہے۔ ہم پر تو صرف دباؤ ہی ڈالتا ہے۔ ہمیں ڈراتا ہے، بلائے ناگہانی سے۔ ہمیں خوف زدہ کرتا ہے، قحط سالی سے، تنگیٔ افکار سے۔ ہم پر صرف غریبی اور غریب الوطنی مسلط کر رکھی ہے، گردشِ فلک نے.... افلاک سے نالوں کا جواب اقبال کو آتا ہوگا۔ ہماری فریاد پر تو آسمان کان نہیں دھرتا.... ہم پکارتے جا رہے ہیں، چیختے جا رہے ہیں، فریادیں کر رہے ہیں، التجائیں اور دعائیں کر رہے ہیں اور وہ ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ اسے اپنی وسعتوں اور بلندیوں پر ناز ہے اور بجا ہے۔ ہم تحلیل ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمیں مجبوری کی چکی پیس رہی ہے اور اسے اپنی آزادیوں پر فخر ہے اور بجا ہے۔ ہمیں کوئی ٹھکانا نہیں ملتا اور اسے کسی ٹھکانے کی ضرورت ہی نہیں۔

ہم اندھیروں میں کھو گئے ہیں اور وہ روشنی کے خزانے لیے بیٹھا ہے۔ ہمارے پاس صرف روشنی کی تمنا ہے اور وہ بھی سہمی سہمی.... دبی دبی.... اور آسمان ہے کہ سورج اس کے

چاند اس کے، ستارے اس کے، نیارے اس کے، سب روشنی اس کی، سب جلوے اس کے پاس، ہر منور شے اسی کے پاس۔ یہ زندگی ہمارے لیے شبِ فرقت بنی ہوئی ہے، رو رو کے کاٹ رہا ہے آج کا انسان۔ کراہ رہا ہے یہ دَور، بارِ ہستی سے۔ اور اس پر ستم بالائے ستم یہ کہ ایک عاقبت مسلط ہے .... طرفہ تماشا ہے .... زمین نے پاؤں پکڑ رکھے ہیں اور آسمان چابکیں مارتا ہے، ہانکتا ہے .... انسان کہاں جائے!!

آدمی پر بڑے آلام ہیں .... بڑے مصائب ہیں .... کڑے سفر ہیں، کالے کوسوں کی راہ ہے۔ رہگذارِ حیات میں نخلستان نہیں ملتا .... طوفانی سمندر میں جزیرہ، عافیت کا جزیرہ نہیں ہے .... اجنبی ہجوم ساتھ چل رہا ہے۔ اپنا کوئی نہیں۔ انسان خود اپنا نہیں، لیکن اس کے دل میں حصارِ وقت کی مجبوریوں کو توڑنے کی قوت پنہاں ہے .... انسان نے "دیکھا ہی نہیں گرمئ رخسار کا عالم" انسان جمع کیے ہوئے مال کو گنتا جا رہا ہے اور وہ بھول گیا ہے کہ پیسہ ہی تو مجبوری ہے .... اس مجبوری کو توڑا جا سکتا ہے .... پیسہ تقسیم کر دو .... اُن لوگوں میں جن کے پاس نہیں ہے۔

ہم آسمان کو کوستے ہیں، خود کو نہیں دیکھتے۔ ہم مجبوریوں کا نزول دیکھتے ہیں، آزادی کا پیغام نہیں سنتے .... آسمان ہماری زندگی کو بڑے پیغام دیتا رہا ہے .... ہم پھر غفلت کی چادر تان کر سو جاتے ہیں .... آسمان سے روشنی آئی، نور آیا، نورِ مبین آیا، نورِ یقین آیا... ہم غفلت میں رہے .... ہم وابستگیوں سے نکل چکے ہیں اس لیے ہم اپنی انا کے جنگل میں پھنس گئے ہیں .... ہم خود کو آوازیں دیتے ہیں اور خود ہی جواب دیتے ہیں اور کہتے ہیں، یہاں کوئی نہیں!!

ہم اپنی زندگی پر خود ہی ترس کھانے لگ جاتے ہیں۔ ہم اپنے ماحول سے صرف حاصل کرنا چاہتے ہیں، اسے کچھ دیتے نہیں۔

ہمارے پاس آسمان کا پیغامِ آزادی آیا .... ہم نے غور نہیں کیا .... ہم نے مجبوریوں

سے آزاد کرنے والی راہ اختیار ہی نہیں کی۔۔۔۔ انسان جانتا ہے کہ اس کا قیام عارضی ہے۔ اس نے ہر شے، ہر شخص، ہر بات اور ہر ارادے کو چھوڑ جانا ہے۔ اسے بتا دیا گیا ہے کہ یہ بستی ہمیشہ بسنے والی نہیں۔ ہستی کا شجر سانس کی آری سے کٹ جاتا ہے۔

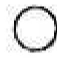
انسان بھول گیا اُس عہد کو، جو اس نے کر رکھا ہے، اپنے پیدا کرنے والے کے ساتھ۔ انسان ہر مقام پر سرنگوں ہوتا ہے، ہر خواہش پر مرتا ہے، ہر آرزو سے بھیک مانگتا ہے اور نہیں مانگتا تو اُس سے، جس کے پاس سب خزانے ہیں۔ زمین کے اور آسمان کے خزانے۔

ہم آسمان اور گردشِ آسمان کو اپنا مقدر ساز سمجھ بیٹھے ہیں اور وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا، اُس سے ہم رشتہ اُستوار نہیں کرتے۔۔۔۔ تقدیر پیدا کرنے والا ہمیں اپنی طرف شفقتوں اور رحمتوں کے پیغام بھیجتا ہے۔ اس نے ہمارے لیے اپنی رحمت کی انتہا کی ہے۔ اپنے محبوبؐ کو ہمارے لیے ہماری رہنمائی کے لیے بھیجا تاکہ ہم اس زندگی کے کرب اور اس کی بے معنی مجبوریوں اور بے مصرف مصروفیتوں سے نکل کر آزادیٔ دل کی آزادی کی منزلوں کی طرف گامزن ہوں۔۔۔۔

ہم ضرور زمین پر رہتے ہیں۔۔۔۔ ہم اپنی پیشانی زمین پر رکھتے ہیں تو جواب آسمان سے آتا ہے۔ دنیا نے ہمیں ہمارے عقیدے سے متزلزل کیا ہے۔ ہم بلا سبب اُلجھ گئے۔۔۔۔ ہر وقت گلہ کرتے ہیں، شکوہ کرتے ہیں، شکایت کرتے ہیں۔ خواہشات کا انبار لگاتے ہیں اور پھر سکونِ قلب کے نہ ہونے کا شکوہ۔ ہم کیوں نہیں اُس راہ پر چلتے، جو راہ سیدھی ہے، جس راہ پر چل کر ہی سکون ملے گا۔۔۔۔ ہم کیوں نہیں اس کے حکم کو مانتے۔۔۔۔ زندگی کا حُسن نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم اپنے عظیم محسنؐ کا احسان بھول گئے۔۔۔۔ ہم اپنے رہنما، اپنے محبوب رہنماؐ کے نقشِ قدم پر کیوں نہیں چلتے۔ ہم نے بے شمار رہبر بنا لیے۔ کثرتِ قائدین نے قیادت کا مفہوم ہم سے چھین لیا۔ ہم جو کچھ زبان سے کہتے ہیں، دل سے اس کی نفی کر دیتے ہیں اور پھر وہی حال۔۔۔۔ یعنی بُرا حال ہوتا ہے۔ جب ہم اپنی صداقت سے محروم ہوں، تو یہ کیسے

ہوسکتا ہے کہ دینِ صادق سے ہمیں سکون ملے.... یہ دین سچے انسانوں کا.... سچے انسانوں کے لیے ہے۔ یہ سچ کا راستہ ہے۔ آزادی کا راستہ، ہر جھوٹ سے آزادی، ہر تصنع سے آزادی، ہر فریب سے آزادی، ہر ایسی خواہش سے آزادی جو ہمیں بعد میں پریشان کرے۔ ہم اپنی پریشان نظری کا علاج نہیں کرتے.... اپنی پریشان حالی کا رونا روتے ہیں۔ ہم شکم کو دل پر ترجیح دیتے ہیں' سکون کیسے ملے.... ہم اپنے دماغ کو اپنا رہنما مان لیتے ہیں اور یہ دماغ نیند کے غلبے سے نہیں بچ سکتا۔ ایک معمولی خواہش دماغ کو پریشان کر کے رکھ دیتی ہے۔

مالک کا حکم نہ مان کر ہمیں بڑے حکم ماننے پڑتے ہیں۔ اس کی اطاعت نہ کرنے سے ہمیں بڑی بڑی اطاعتیں کرنی پڑتی ہیں۔ اس کا سجدہ نہ کر کے ہم اپنی آرزوؤں کے آگے سجدہ ریز ہیں۔ جب تک اس سے وابستہ نہ ہو، انسان آزاد نہیں ہو سکتا۔ ایک ذات کی غلامی ہی ہزار غلامیوں سے نجات دے سکتی ہے۔ آسمان ہمارے ساتھ ہے۔ ہمارے اشارے کے ساتھ ساتھ .... شرط یہ ہے کہ ہم اس کے ساتھ ہو جائیں یعنی مالک کے ساتھ ہو جائیں.... زمین والے اس سے تعلق نہ رکھیں' تو آسمان کی گرفت میں ہیں اور اگر زمین والے اس کے ہو جائیں تو آسمانوں کی وسعتیں گردِ پا ہو جائیں۔ اللہ کے محبوبؐ زمین پر ہوں۔ آسمان اس زمین پر نثار اور اگر اللہ کے باغی چاند پر پہنچ جائیں' تب بھی وہ گرفت میں ہیں۔ شدید گرفت!!۔



علم، عمل کے تابع نہ ہو تو علم، علم کے مطابق نہیں رہتا۔ راز کی بات تو یہ ہے کہ راز جاننے والے کا عمل ہی راز آشنائی کا ذریعہ ہے۔

طاقت

طاقت ایک مبہم لفظ ہے۔ اس کے معنی صرف استعداد یا قدرت کے ہی نہیں اس کا مفہوم خوف پیدا کرنا بھی ہے اور اگر خوف زدہ انسان بے خوف ہو جائے تو طاقت کمزور ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ طاقت دراصل خوف کی حدود میں بادشاہی کرتی ہے۔ لاخوف کے مدار میں طاقت کا گزر ممکن نہیں۔

طاقت کے معنی موقع محل کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ ہم جس شے سے خوف زدہ ہوں اس کو طاقت کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ طاقتور شے جس شے کو خوف زدہ کرتی ہے، دراصل خود اس سے خائف ہوتی ہے۔ بچے ماں باپ کو طاقت در سمجھتے ہیں اور جب یہ بچے بڑے ہو جائیں اور جوان ہو جائیں تو ماں باپ ان کو طاقت ور سمجھ کر ان سے خوف زدہ رہتے ہیں اور اس طرح طاقت اور خوف اپنی جگہ بدلتے رہتے ہیں۔

طاقت کا استعمال ابتدائے آفرینش سے ہی چلا آ رہا ہے۔ ہم دوسروں کو مجبور کرنے پر مجبور ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں تسلیم کیا جائے، مانا جائے، جانا جائے، پہچانا جائے۔ ہم دلیل کی طاقت استعمال کرتے ہیں۔ اور اگر یہ طاقت کام نہ کرے، تو ہم طاقت کی دلیل استعمال کرتے ہیں۔ ہم طاقتور ہونے کے جذبے کے سامنے بے بس ہیں۔

ہماری آدھی سے زیادہ زندگی اس خواہش ہی میں گزرتی ہے کہ طاقت حاصل کریں۔ طاقت کا نشہ سب نشوں سے زیادہ ہے۔ ہم علم حاصل کرتے ہیں، کیونکہ علم طاقت ہے۔ ہم دولت حاصل کرتے ہیں، کیونکہ دولت طاقت ہے۔ ہم تجربات کرتے ہیں، کیونکہ تجربہ طاقت ہے۔ ہم اقتدار

حاصل کرتے ہیں کیونکہ اقتدار طاقت ہے۔ ہماری جدوجہد طاقت کی بلند چوٹیوں تک پہنچنے کے لیے ہے۔

خوبصورت انسان اپنے چہرے کی طاقت پرست ہوتا ہے۔ حسین چہرہ دوسروں کو غلام بنالیتا ہے۔ حُسن میں بڑی طاقت ہے۔ بڑے بڑے ارسطو اس طاقت کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں۔

انسان کو زندگی میں بے شمار طاقتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اس لیے اس کے پاس بے شمار اندیشے ہوتے ہیں۔ غریب ہونے کا خوف دولت کو بے پناہ طاقت بخشتا ہے۔ بے خوف غریب دولت کے طاقتور صنم کدے کا ابراہیمؑ ہے۔

ہمیں گمنام ہونے کا خوف رہتا ہے اس لیے ہم ناموری کی طاقت کو تسلیم کرتے ہیں اور ناموری نیک نامی اور بدنامی کے درمیان کہیں بھی ہو ہمیں مجبور کر دیتی ہے۔ جوں جوں انسان کا نام پھیلتا ہے، وہ اپنی ذات کو پھیلتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ وہ حاوی ہونا چاہتا ہے۔ چھا جانا چاہتا ہے۔ اپنی شہرت کی طاقت کو برقرار رکھنے کے لیے وہ کسی خیر شر کی تمیز سے بیگانہ سا ہو جاتا ہے۔ انسان فتوحات کرتا ہے طاقت کے ذریعے طاقت کے لیے۔ وہ انسانوں کو موت کا خوف دے کر اپنی زندگی کی طاقت منواتا ہے۔ فاتحین عالم تلوار اور آگ کا سہارا لے کر اپنی طاقت کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ انسانوں کا قتل عام کر کے ان کے خون سے اپنے چہروں کو سرخرو سمجھتے رہے ہیں۔

طاقت ہی انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ حسن کی طاقت کے مقابلے میں انسان عشق کی طاقت لاتا ہے اور طاقت کا کھیل جاری رہتا ہے۔ منوانا اور انکار کرنا ازل سے چلا آ رہا ہے۔ کسی طاقت کا منکر اس کا ابلیس کہلاتا ہے۔ یہی انسانوں کی دنیا میں بھی ہے۔ کسی طاقت سے انکار کرنے والا باغی کہلاتا ہے۔ شیطان کہلاتا ہے اور ماننے والا مخلص اور مُحب کہلاتا ہے۔

بہرحال طاقت ایک عجیب راز ہے۔ ایک پُراسرار شے ہے جو انسان میں دوسروں سے ممتاز ہونے کا شوق پیدا کرتی ہے۔ انسان اپنے قد اور اپنی حد سے باہر نکل کر بھی دوسروں کو پست قامتی پر مجبور کرنا چاہتا ہے۔

طاقت کا استعمال انسانی تاریخ میں بڑے بڑے واقعات پیدا کرتا رہا ہے۔ لوگ اپنی دولت،

اپنا وقت، اپنی عمر اور اپنی عاقبت خراب کر کے بھی دوسروں کو خوف زدہ کرنے سے باز نہیں رہتے۔ اگر خوف پیدا کرنے کے عمل کو ترک کر دیا جائے، تو یہ دُنیا نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے۔ ہر ماحول اپنے لیے طاقت کا الگ مفہوم رکھتا ہے۔ لفظ وہی رہتا ہے۔ لیکن معنی بدلتے رہتے ہیں۔ اس کا دائرہ بدلتا ہے، اس کی تاثیر بدل جاتی ہے۔

مثلاً اگر استاد شاگردوں پر طاقت استعمال کرے، تو اس کے معنی ایک آدھ چپت کے ہوں گے اور اس طاقت کا استعمال شاگرد کی زندگی کے لیے بہتر ہو سکتا ہے۔ استاد کی نیت اصلاح ہے۔ یہاں طاقت کا استعمال برائے اصلاح ہے۔ استاد کا خوف طالب علم کو علم کی لگن دے سکتا ہے اور اگر یہ خوف حد سے بڑھ جائے تو طالب علم میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے۔ طاقت کا استعمال حد سے بڑھ جائے، تو اطاعت کی بجائے بغاوت پیدا کر سکتا ہے۔ جس طرح خوراک جسمانی طاقت کے لیے ضروری ہے، لیکن اگر خوراک کا استعمال حد سے بڑھ جائے، تو صحت کی تباہی کی علامت ہے۔

قوموں کی زندگی میں بھی کئی طرح کی طاقتیں کام کرتی ہیں۔ طاقت کے دم سے ہی سماجی اور معاشی نظام قائم رکھا جاتا ہے۔ پولیس ایک طاقت کا نام ہے، جو مجرموں کو خوف زدہ رکھنے کے لیے قائم کی گئی ہے۔ اگر یہ طاقت مجرم اور معصوم کے امتیاز سے آشنا نہ ہو، تو یہ طاقت بھی اپنے متعینہ مفہوم سے باہر ہو جاتی ہے۔

حکمرانوں کے پاس طاقت ہوتی ہے اور یہ طاقت ہونا چاہیے۔ اس کے دم سے حقوق و فرائض کے رشتے قائم رہتے ہیں۔ طاقت کا ہونا ضروری ہے۔ اس کا اظہار اور استعمال ضروری نہیں۔ طاقت کا کثرت سے استعمال طاقت کو کمزور کر دیتا ہے۔ والدین کی طاقت کا آخری استعمال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد سے کہیں کہ "بیٹا! ہم آپ کے والدین ہیں۔" ماتحتوں میں مرتبے کی عزّت و توقیر کا شعور نہ ہو، تو مرتبے کا اظہار بے معنی سا ہو کر رہ جاتا ہے۔

ہر ملک اپنے پاس فوج کی طاقت رکھتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اس طاقت کے دم سے ہی دشمن خائف رہتے ہیں اور اس طرح قوموں کی آزادی محفوظ رہتی ہے۔ جنگ کی تیاری امن

کے تحفظ کا ایک ذریعہ ہے، لیکن اگر تیاریاں حد سے بڑھ جائیں تو امن کا مفہوم ہی ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ عجیب تضاد ہے کہ آزادی کا خاتمہ بھی طاقت سے ہوتا ہے۔ آزادی کا مطلب خوف سے آزادی ہے۔ آج کی آزاد دنیا عظیم جنگی تیاریوں میں مقید ہے۔ ترقی یافتہ ممالک اپنی طاقت اس حد تک بڑھا چکے ہیں کہ ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کی آزادی کا مفہوم ختم ہو گیا ہے۔

طاقت کے نشے، طاقت کے حصول اور طاقت کے اضافے نے انسان سے آزادی اور آزاد خیالی چھین لی ہے۔ غلامی خوف کا دوسرا نام ہے۔ طاقت جب خوف پیدا کرتی ہے، تو آزاد انسان غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ بڑی قومیں جب طاقت کے استعمال کی دھمکی دیتی ہیں تو اس کا مفہوم مہذب دنیا کی مکمل تباہی کے قریب ہوتا ہے۔ طاقت کی زبان بولنے والے دنیا کو تباہی کے دہانے کی طرف دھکیل رہے ہیں۔

طاقت کے حصول اور طاقت کے اظہار نے انسان کو غافل کر دیا ہے۔ انسان دوسروں کو موت سے ڈراتے ڈراتے خود موت کے منہ میں جا پہنچتا ہے۔

ہر طاقت ور کے اوپر ایک طاقت مسلط ہے، جو شاید محسوس نہ ہو، لیکن یہ اپنا کام کر رہی ہے۔ ہمارا ہر قدم موت کی طرف ہے۔ سانس کی آری ہستی کے درخت کو مسلسل کاٹ رہی ہے۔ کیا طاقت اور کیا کمزوری۔ ہم رواں دواں ہیں اپنی آخری منزل کی طرف۔ فاتحین مفتوح ہو جاتے ہیں۔ طاقتور آخر کمزور ہو جاتے ہیں۔ خوف زدہ کرنے والے آخر خوف زدہ ہو کر رہتے ہیں۔ انسان اگر محسوس کرے کہ عزت دینے والے نے ہی سب انسان پیدا کیے ہیں اور سب کو زندہ اور آزاد رہنے کا حق ہے تو وہ ضرور اپنے لہجے کو بدل لے۔ طاقت غرور پیدا کرتی ہے اور خوف نفرت پیدا کرتا ہے اور نفرت حد سے بڑھ جائے تو بغاوت اور بغاوت طاقت سے ٹکرا کر اسے ختم کر دیتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اصل حکومت دلوں پر حکومت ہے۔ دلوں پر حکمرانیاں کرنے والوں کی قبریں بھی روشن رہتی ہیں۔ اصل طاقت احترام پیدا کرتی ہے، خوف نہیں۔ شیر ایک طاقتور اور

خونخوار درندہ ہے، خوف پیدا کرتا ہے، لیکن شیر کے پاؤں کا کانٹا نکالنے والے انسان کے سامنے شیر بھی سرنگوں ہو جاتا ہے۔

احسان کرنے والوں کی عزت ہے۔ محبّت کرنے والوں کا احترام ہے۔ سب سے بڑی طاقت یہ ہے کہ انسان طاقت حاصل کرنے کی خواہش سے بھی آزاد ہو جائے۔ فتوحات کرنے کی خواہش کو فتح کر لیا جائے۔ ہم جتنے قلوب خوش کرتے ہیں، اتنی نیکی ہے اور جتنے دل زخمی کرتے ہیں، اتنی خامی ہے۔ چار دن کا میلہ ہے۔ خوش رہنا چاہیے اور خوش رکھنا چاہیے۔ انسان اللہ کو بہت پیارے ہوتے ہیں۔ ان سے پیار کرنا چاہیے، تاکہ اللہ عزّت عطا فرمائے۔ یہ حقیقت ہے، اسے مان لینا ہی بہتر ہے کہ عزت اور قوت اللہ کی طرف سے ہے اور ان کا تحفظ اس کی مخلوق کی خدمت سے ہی ہو سکتا ہے۔

جو انسان اللہ کے زیادہ قریب ہے، وہ مخلوق کے لیے زیادہ رحیم ہے اور جو انسان یا قوم یا ملک مخلوق میں خوف پیدا کرتا ہے، وہ اللہ کے قریب نہیں ہے اور جو اللہ کے قریب نہیں ہے، اس کا مرتبہ حجاب، اس کی طاقت حجاب، اس کی شہرت حجاب، اس کا وجود حجاب۔ فرعون کی طاقت اور انا پرستی بے بس ہو گئی، اُس انسان کے سامنے جو واحد اور لاشریک اللہ کی محبت میں عزت اور حقیقی قوت کا لازوال انعام حاصل کر گیا۔



جن لوگوں کو آپ کی موت کا غم ہو سکتا ہے ان کو زندگی میں خوشی ضرور دینا!



خوشی دینے والا ہی تو غم دے جاتا ہے!

پردیسی

جب انسان ایک دوسرے سے بیزار ہو جائیں۔ اپنے آپ سے، اپنے مستقبل سے مایوس ہو جائیں، ان کی امیدیں غیر ممالک سے وابستہ ہوں، ان کے اثاثے، ان کا سرمایہ ملک سے باہر ہو، تو لازمی بات ہے کہ وہ اپنے وطن میں رہ کر بھی خود کو غریب الوطن محسوس کریں گے۔

ہر انسان پردیسی ہے۔ پردیس ہمارا محبوب دیس ہے۔ انسان کی مجبوری یہ ہے کہ اپنے محبوب کے وطن کو اپنا محبوب سمجھتا ہے۔ بیگانگی، اجنبیت، لاتعلقی، بے حسی، خود غرضی، مطلب پرستی، انا پرستی اور خود پرستی انسان کو کبھی وطن پرستی سے آشنا نہیں ہونے دیتی۔ ایثار، وابستگی، محبت اور ہمدردی کے فقدان نے دیس میں پردیس پیدا کر رکھا ہے۔ یہ صورت حال اندر ہی اندر یکجہتی، ہم آہنگی اور حُبّ الوطنی کو گھُن کی طرح کھاتے جا رہی ہے۔

ویسے بھی اس دُنیا میں خود کو پردیسی محسوس کرنا فطری بات ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہم کہیں اور سے آتے ہیں اور کچھ عرصہ قیام کے بعد ہم واپس بلا لیے جائیں گے۔ اپنے دیس کو جانا ہوگا۔ یہاں ٹھہرنے کا مقام نہیں۔ زندگی کے مقدر میں پردیسی ہونا لکھا جا چکا ہے۔ یہ تحریر کاتبِ تقدیر کی ہے، اٹل ہے۔ اسے ہو کر رہنا ہے پیر، پیغمبر، ولی، درویش، مردانِ خدا کوئی بھی ہو، یہاں مدام قیام نہیں کر سکتا۔ زندگی کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی ایک نامعلوم موج ہمیں اِس کنارے پر چھوڑ گئی ہے اور کسی نامعلوم مدت کے بعد کسی نامعلوم لمحے میں ایک نامعلوم لہر ہمیں اٹھا کر اُس پار واپس پھینک دے گی۔

یہ روزمرّہ کا مشاہدہ ہے کہ زندگی کے بارونق بازار سے لوگ رخصت ہو جاتے ہیں، شہر آباد

رہتے ہیں لیکن شہری بدل جاتے ہیں چلے جاتے ہیں۔ ہر دس سال کے بعد چہرے بدل جاتے ہیں، گلیاں وہی، مکان وہی، شہر وہی، شہر کی رونق وہی لیکن وہ چہرے کہاں گئے۔ وہ مانوس و محبوب چہرے . . . . رخصت ہو گئے، چلے گئے، اپنے گھر . . . کون سے گھر . . . اپنے وطن . . . کون سے وطن! اگر ان کا وطن کوئی اور دیس تھا تو یہ دیس . . . ان کا، ہم سب کا پردیس ہے! عجب حال ہے۔ دیس میں پردیس، سب کے لیے، ہمیشہ کے لیے۔

ہر شہر میں، آباد شہر میں، بارونق اور جگمگاتے شہر میں قبرستان کا ہونا ایک عجب داستان ہے۔ یہ داستان اہلِ دل کے لیے عبرتوں اور حقیقتوں کا دبستان ہے۔ اہلِ فضل اور اہلِ فکر حضرات اپنے اصل دیس کا چکر لگاتے رہتے ہیں۔ سرِ پُر غرور کا انجام نگاہ میں رکھتے ہیں۔ وہ تاجوری سے زرگری تک اپنے حاصل کا لاحاصل دیکھتے رہتے ہیں۔

لڑکیوں، عورتوں اور خواتین کو بار بار سمجھایا جاتا ہے کہ یہ دنیا بابل کا گھر ہے اور وہ دنیا سسرال ہے اور ہر لڑکی کو سُسرال جانا ہی ہوگا۔ . . . دراصل یہ اطلاع ہے، یہ اعلان ہے یہ وارننگ ہے کہ جانا ہی ہوگا . . . پردیس میں رہنے والو! اسے غلطی سے اپنا دیس سمجھنے والو! یہ سمجھ لو کہ جانا ہی ہوگا . . . . اس کے بغیر چارہ ہی نہیں . . . . دیس پردیس ہے اور ہم سب پردیسی ہیں۔ ہم سنتے ہیں اور بھُول جاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں اور بھُول جاتے ہیں۔ ہمیں دعوت ہے کہ اے آنکھوں والو! سیر کرو دُنیا کی اور دیکھو عاقبت اُن جھوٹے مالکوں کی، جن کی اصل ملکیت کچھ نہ تھی۔ یہ عبرت کدہ ہے۔ وقت کا عبرت کدہ . . . . آج کے کھنڈر کل کے محلات تھے۔ آج جہاں اُلّو بولتے ہیں، وہاں کل تک رونق تھی، روشنی تھی، ظلِ سبحانی کے جلال کا شہرہ تھا۔ آج وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ پردیسی اپنے دیس کو چلے گئے اور چھوڑ گئے ویرانیاں اپنے بعد . . . . ہم سمجھتے نہیں۔ مالک بن بیٹھتے ہیں۔ زمین کو انتقال کراتے کراتے ہمارا اپنا انتقال ہو جاتا ہے۔ اور یہ دیس . . . . نئے پردیسیوں کا انتظار کرتا ہے۔

بڑے بڑے شہروں میں تو ویسے بھی پردیسی رہتے ہیں۔ دور سے آنے والے یہاں مقیم

ہوتے ہیں۔ پلاٹوں کی سیل (SALE) ہوتی ہے اور پھر وہی حال یعنی وہی بُرا حال.... جانا ہی ہوگا اپنے گاؤں.... اپنے گاؤں کے ویران قبرستان میں۔ نامعلوم دیس کا پہلا سٹیشن.... اور پھر منزلیں.... منزل در منزل.... سفر در سفر اور پھر آئے گا اپنا دیس، اصل دیس..... جہاں سے سفر کا آغاز ہوا تھا.... اس واقعہ کو ہر روز ہر آدمی دیکھتا ہے.... دیکھتا ہے اور بھول جاتا ہے اور اس وقت تک بھولے رہتا ہے جب تک اسے زور سے جھنجوڑا نہ جائے کہ آگئی تیرے سفر کی باری.... گھر جانے کی گھڑی اور اب جانا ہی ہوگا، ناگزیر ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو کرائے کے مکان میں رہنے والا ساری عمر خود کو پردیسی سمجھتا ہے۔ نہ جانے کب اسے مکان سے نکال دیا جائے.... آدھی سے زیادہ قوم کرایہ دار ہے، پردیسی ہے۔ ملازم پیشہ انسان کا کوئی دیس نہیں۔ آج یہاں کل وہاں۔ ان لوگوں کی زندگی کا اندازہ لگائیں کہ بیوی کہیں، خود کہیں۔

سوچنے کا مقام ہے۔ ریل گاڑیوں کو دیکھیں، کھچا کھچ بھری ہوئی۔ پردیسی آ رہے ہیں پردیسی جا رہے ہیں۔ ہزارہا بسیں ہمہ وقت سفر میں ہیں۔ پردیسی آ رہے ہیں جا رہے ہیں۔ ہوائی جہازوں کی بکنگ.... ٹکٹ نہیں ملتا.... پردیسیوں کو۔ یا اللہ! تمام مسافروں کا کون سا دیس ہے۔ یہ کہاں سے آتے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔

آج کی بین الاقوامیت نے دیس کے تصور کو ویسے بھی رد کر دیا ہے۔ ہم کسی دیس کے شہری نہیں۔ ہم دنیا کے رہنے والے ہیں۔ سب پردیسی ہیں، وطن میں، وطن سے باہر!

ہمارے سیاستدان سب پردیسی ہیں۔ کسی کی کتاب ہندوستان میں چھپتی ہے، کسی کی انگلستان میں.... اپنے اپنے دیس میں.... سیاست پرورش پاتی ہے۔ بیرونی ممالک ہیں اور پھر واپسی پر.... بہاریں ساتھ لاؤں گا اگر لوٹا بیاباں سے.... لیکن نہیں.... پردیسیوں کے کیا ٹھکانے.... جانے کب کیا ہو جائے۔ لندن میں بیٹھ کر دیسی لوگ پلاننگ کرتے ہیں، دیس کے بارے میں، اپنے دیس کے بارے میں، اپنے پردیس میں.... عجب حال ہے۔ پردیس

ہی پردیس ہے۔

سب سے زیادہ حسرت ناک حالت اُن پردیسیوں کی ہے، جو کسبِ معاش کے لیے باہر گئے..... بیرون ملک گئے..... ان کے عزیز ان کے انتظار میں یہاں پردیسی ہیں، وہ وہاں پردیسی۔ دولت کی ہوس نے جدائیاں پیدا کر دی ہیں۔ پیسہ آ رہا ہے اور عمر بیتی جا رہی ہے۔ حالات بہتر کرنے کی تمنا نے حالت خراب کر دی ہے۔ خواہشات کا پھیلاؤ، نمائش کی خواہش، آرائش کی تمنا نے مجبور کر دیا کہ اپنے محبوب بیٹے، محبوب خاوند کو وطن سے باہر بھیجا جائے۔ اب گھر میں انتظار ہے، خط کا انتظار ہے، پیسے کا انتظار، پیسہ بھیجنے والے کا انتظار..... جس کی خاطر گھر سجایا، وہی گھر میں نظر نہ آیا۔ حیرت ہے، افسوس ہے۔ ہم کیوں نہیں سادہ زندگی بسر کرتے۔ کیا غریب الوطنی کے بغیر گزر نہیں ہو سکتی؟

اور وہ لوگ، بیچارے وطن سے دور یادوں کے سہارے دن کاٹ رہے ہیں۔ اوپر سے گزرنے والے طیاروں کو حسرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ یہ جہاز وطن جا رہے ہیں اور وہ مجبور ہیں۔ اجنبی زمینوں پر، اجنبی فضاؤں میں، اجنبی لوگوں میں، اجنبی ماحول میں۔ وطن میں عزت کی زندگی گزارنے کی تمنا میں پردیس کی ذلت برداشت کر رہے ہیں..... مجبوریوں کا عذاب نازل ہو چکا ہے۔ ہم کیوں نہیں سمجھتے۔ دولت کی تمنا دلبروں کو دُور کر دیتی ہے۔ انسان غریبی کا لقمہ نہیں کھاتا اور جدائی کا زہر کھا لیتا ہے کیوں نہ بلا لیا جائے ان بیچاروں کو! وی سی آر نہ سہی، رنگین ٹی وی کے بغیر بھی زندگی گزر سکتی ہے۔ اپنے پیاروں کو جدا کر کے کون سا میوزک سنو گے؟ غریبی کے اندیشے سے نکل کر تم اور بڑے اندیشوں میں مبتلا ہو چکے ہو۔ تم سب ایک دوسرے کی یاد میں روتے رہتے ہو..... چند سکوں کے عوض اتنا بڑا عذاب..... جدائی کا عذاب..... بلا لو پردیسیوں کو دیس میں واپس!

وہ دانشور بھی پردیسی ہیں جو سفرنامے لکھنے کے لیے مسافر بنتے ہیں۔ سفرنامے کی خواہش ہی پردیس کی تمنا ہے۔ جب خیال اور رفعتِ خیال کمزور ہو جائے، تو واقعات کا بیان آسان محسوس

ہوتا ہے۔ خیال کے سفر سے جسم کا سفر آسان ہے۔ بہرحال آج کل سفرناموں کا دور ہے۔ مسافرت کی گھڑی ہے۔ پردیسی ہو جانے کے زمانے ہیں۔ پاسپورٹ اور ویزا اور این او سی کے حصول کا وقت ہے۔ جب تک خیال ایک مقام پر نہ ٹھہرے ہم کسی مقام پر نہیں ٹھہر سکتے۔ ہمارا ہر خیال ابھی زیرِ تشکیل ہے۔ ابھی ہر شعبہ زیرِ منصوبہ بندی ہے۔ ابھی بڑے فیصلے باقی ہیں۔ ہمارے فیصلے اور پھر ہمارے بڑوں کے فیصلے۔ ہم لوگ عجیب حال میں ہیں۔ گھر میں پنجابی بولتے ہیں۔ محفلوں میں اُردو، دفتروں میں انگریزی.... عبادت عربی میں کرتے ہیں۔ ہر زبان پردیسی ہے۔ ہم کئی دفعہ پردیسی ہیں۔ ہم انگریزی زبان سے نجات حاصل نہیں کر سکے اور ہم سندھی، بلوچی اور پشتو سے ناآشنا.... بھائی کی زبان سے بے خبر۔ دور کی زبانیں بولتے ہیں اور یہاں خود کو پردیسی سمجھتے ہیں۔ بھائی بھائی کی زبان سے آشنا نہ ہو تو بھائی چارہ کیسے پیدا ہو۔

انسان گھر سے نکلے تو پردیسی ہو جاتا ہے۔ ساٹھ کلومیٹر کے بعد زبان کا لہجہ، الفاظ، ڈکشن بدل جاتے ہیں۔ ضلع ضلع کی زبان الگ ہے۔ ایک صوبے کا آدمی دوسرے صوبے میں مکمل پردیسی ہے۔ زبان اور لباس کی یکسانیت خیال میں یکسانیت پیدا کرتی ہے۔ اس یکسانیت کے بغیر ہم سب پردیسی ہیں۔ ایک دوسرے کے پاس ایک دوسرے سے ناشناس۔ دیس میں پردیسی۔ زندگی کے مقدر میں پردیسی ہونا لکھا جا چکا ہے۔ ہم تمام عمر زائر اور مسافر رہتے ہیں۔ کبھی اس آستانے پر، کبھی اُس آستانے پر۔ کبھی اِس طرف کبھی اُس طرف .... اسلام عرب سے آیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم بھی عرب سے آئے ہیں۔ اس لیے ہم روز عمرہ، حج، زیارتیں کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستان میں ہمارے رُوحانی پیشواؤں کے آستانے ہیں۔ ہم ان کی جدائی میں پردیسی محسوس کرتے ہیں، خود کو۔

ہمارے فکری اور سیاسی پیشوا بھی دُور بستے ہیں۔ ہم ان کے دیار کو بھی اپنے لیے دیس سمجھتے ہیں۔ ہم اپنے آپ سے یا تو مفرور ہونا چاہتے ہیں یا ہم سمجھتے ہی نہیں کہ ہمارا دیس کیا ہے۔ بہرحال ہمارے محبوب کی گلیاں ہی ہمارا دیس ہیں۔

دراصل ہم اس فانی جہاں میں بے قرار ہی رہتے ہیں۔ ہم سب پردیسی ہیں۔ جب تک ہم اپنے دیس نہ جائیں ہمیں چین نہیں آئے گا۔ . . . ہمارا اصل دیس ہمارے پاؤں کے نیچے مٹی میں ہے یا سر کے اُوپر آسمان میں ہے۔ وجود مٹی سے آتا ہے مٹی کے دیس میں لوٹ جائے گا۔ روح آسمان یا لامکان سے آتی ہے، وہ وہاں پرواز کر جائے گی اور پھر قرار آئے گا۔ بے قرار پردیسی کو۔ ؎

ماٹی پر ماٹی چلے، چلے ہزاروں رنگ
انت کو ماٹی جا ملے ماٹی ہی کے سنگ



میں آرزوئے دید کے کس مرحلے میں ہوں
خود آئینہ ہوں یا میں کسی آئینے میں ہوں
تیرے قریب رہ کے بھی تھا تجھ سے بے خبر
تجھ سے بچھڑ کے بھی میں ترے رابطے میں ہوں
ہر شخص پوچھتا ہے مرا نام کس لیے
تیری گلی میں آکے عجب مخمصے میں ہوں
واصف مجھے ازل سے ملی منزلِ ابد
ہر دور پر محیط ہوں جس زاویے میں ہوں

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود

اس کائنات میں کوئی وجود ہمیشہ کے لیے ایک جگہ پر موجود نہیں رہ سکتا۔ ہر چیز بدل جاتی ہے۔ ہر لمحہ دوسرے لمحات کو رستہ دے کر رخصت ہو جاتا ہے۔ سانس کی آری ہستی کے سایہ دار درخت کو کاٹتی چلی جاتی ہے اور آخر کار انسان ہر عمل سے بیگانہ ہو کر نامعلوم دنیا کی طرف رخصت ہو جاتا ہے۔ یہ کھیل جاری رہتا ہے۔

کائنات کا ذرہ ذرہ اپنا مقام بدلتا ہے۔ حالتیں بدلتی ہیں۔ حالات بدل جاتے ہیں۔ موسم بدل جاتے ہیں۔ ہر شے میں ہمہ وقت تغیّر رونما ہوتا رہتا ہے۔ ہمہ حال تبدیلیوں میں قیام کی خواہش ہی انسانی زندگی کا طرۂ امتیاز ہے۔ انسان جانتا ہے کہ یہاں اس دنیا میں ٹھہرنا ناممکن ہے۔ قیام کا امکان نہیں۔ اس سے پہلے بھی ہزارہا قافلے اس دشتِ بے اماں سے گزرے اور اپنے بعد ویرانیاں چھوڑ گئے۔ انسان جانتا ہے کہ اسے بھی جانا ہے لیکن وہ جانے سے پہلے کوئی کام ایسا کرنا چاہتا ہے جو اس کے نام سے منسوب رہے۔ وہ مکان بناتا ہے۔ اُس میں روشنیاں اور فانوس لگاتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد خود اندھیروں میں کھو جاتا ہے۔

ہمہ حال نئی شان والے پروردگارِ عالم نے ہر شے میں تغیّر پیدا فرما کر حُسن بخشا ہے۔ سارا جہاں حسن ہزار رنگ کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ کتابِ فطرت کا ایک ایک ورق رنگ و نور سے مزیّن ہے۔ زمین خوشبو سے مہکتی ہے۔ کبھی آسمان اپنی گردشوں میں مست نظر آتا ہے۔ ہر طرف جلوے ہی جلوے ہیں۔ رونقیں ہی رونقیں ہیں۔ خالق کی قدرتِ کاملہ کے مظاہر دلفریب اور دلنشیں ہیں۔ پُوری کائنات پر منوّر رُوح محیط ہے۔

سورج کو دیکھیں اپنی آمد سے پہلے ہی جلوہ آرا ہوتا ہے۔ صبح کاذب ہو یا صبح صادق، نُور کا پرتو ہے۔ سُورج کی روشنی میں تحریک ہے۔ صبح پہلی کرن سے پھول کھلنے شروع ہوتے ہیں۔ سورج نکلتا ہے تو بس زندگی نکلتی ہے۔ چہکار اور مہکار کا دور شروع ہوتا ہے۔ ہر ذی جان حمد و ثنائے خالق کبریا میں مصروف نظر آتا ہے۔ چرند پرند، انسان، اشیاء، دریا، پہاڑ، ہوائیں، فضائیں سب متحرک نظر آتے ہیں۔ منور نظر آتے ہیں۔ زندگی اپنا اظہار کرتی ہے۔ انسانی آنکھ محو نظارہ ہوتی ہے اور پورا منظر نامہ حسن کے لباس میں ملبوس دلکشی کی داستان میں بیان کرتا ہے۔

صبح کی رونقیں دوپہر کے آرام میں سانس لیتی ہیں اور پھر دوپہر سہ پہر اور شام اور پھر سکوتِ شام۔ سب آوازیں خاموش ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ تلاش میں سرگرداں وجود اپنے آشیانوں اور اپنے ٹھکانوں میں واپس آجاتے ہیں اور اس طرح سورج اپنے جلوے بکھیرتا ہوا رخصت ہو جاتا ہے۔

رات چاند ستاروں کے حُسن سے آراستہ ہو کر منظر نامے پر طلوع ہوتی ہے۔ ایک نئے قسم کا جلوہ نظر آتا ہے۔ جھلمل جھلمل ستاروں کی محفلیں بپا ہوتی ہیں۔ دل محبت سے معمور ہوتے ہیں۔ رات کے مسافر اپنی منزلوں کی طرف رواں ہوتے ہیں۔ کاروانِ وجود کسی حالت میں ٹھہرتا نہیں ہے۔ ہمہ حال حرکت، ہمہ حال گردش، ہر لحظہ نیا پن، ہر لمحہ انوکھی داستان۔ رات کی محفل رُوح کی محفل ہے۔ یادوں کے دریچے وا ہوتے ہیں۔ دل کی دنیا آباد ہوتی ہے۔ ستارے چمکتے ہیں اور انسان کے دل و دماغ میں خیالات روشن ہوتے ہیں۔ سُورج وجود کی خوراک مہیا کرتا ہے اور رات رُوح کی خوراک مہیا کرتی ہے۔ چاندنی راتوں سے وجد میں آئے ہوئے آنسو کلیلیں بھرتے ہیں۔ چکور چاند کی طرف لپکتے ہیں اور لپکتے ہی رہتے ہیں، منزلیں دُور ہوں تب بھی ہمت پست نہیں ہوتی۔ حوصلے بلند ہوتے ہیں۔ راتوں کو تغیر جاری رہتا ہے۔ ہوائیں نیند کے تحفے لاتی ہیں اور انسان کی خدمت میں پیش کرتی ہیں۔

اس کائنات میں کوئی ستارہ، کوئی سیارہ، ہمہ حال ایک حال پر نہیں رہتا۔ جو خود نہیں بدلتے

اُن کے گردونواح بدل جاتے ہیں اور یوں تبدیلی مستقل طاری و جاری رہتی ہے۔

موسم ایک حال میں نہیں رہتے۔ ابھی گرمی تھی، ابھی برسات ہے۔ زمین خشک تھی اب جل تھل ہے۔ خشک سالی کا موسم اور پھر سیلاب کے زمانے۔ دریا کبھی چاندی کے ایک تار کی طرح اپنے راستوں سے گزرتے ہیں اور کبھی سمندر بن کر کناروں کو اُڑا لے جاتے ہیں۔ اس کائنات کا مزاج مبدل ہے۔ تغیر ہی اُصولِ حیات ہے۔ موسموں کو نئے انقلاب سکھانے والی ذات خود ہی ہمہ رنگ نیرنگ ہے۔ سرد ہوائیں چلتی ہیں تو زندگی غاروں اور پناہ گاہوں میں چھپتی ہے۔ اولے اور برف باری کے مناظر بڑے دلچسپ ہیں۔ فطرت کبھی نغمات سناتی ہے اور کبھی فطرت ہنگامے بپا کرتی ہے۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ زلزلے آتے ہیں۔ زمین کے اندر مخفی قوتیں اظہار کرتی ہیں اور زلزلوں کی ہیبت سے جہاں کانپ جاتا ہے۔ قدرت کے کارخانے میں کوئی پرزہ ساکن نہیں۔ سکون اس کارخانے میں ناممکن ہے۔ ہر شے تیزی سے بدل رہی ہے۔

عروج و زوال کی داستان ہے یہ زندگی۔ اس میں کوئی حالت ہمیشہ رہ نہیں سکتی۔ کبھی خوبی اور عمل کے بغیر عزت اور عروج ملتے ہیں۔ کبھی خامی اور بداعمالی کے بغیر ہی ذلت اور زوال سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ عجیب حالت ہے۔ زندگی کے مزاج میں قائم رہنا ممکن نہیں۔ اس میں کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔

انسان ہنستا ہے۔ خوش ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی پر ناز کرتا ہے اور اسی دوران کسی نامعلوم وجہ سے اس کی ہنسی آنسوؤں میں بدل جاتی ہے۔ خوشی رخصت ہو کر غم دے جاتی ہے۔ انسان جس حالت پر فخر کرتا ہے اُسی حالت پر افسوس کرنے لگتا ہے۔ مبارک دینے والے تعزیت کرنے لگتے ہیں۔

یہ تغیرات ہیں۔ ہر آدمی کے سر پہ کتنا گزرا ہے۔ کون کس سے تعزیت کرے۔ اس دُنیا میں ٹھہرنے کا مقام ہی نہیں۔ مسلسل تبدیلی۔ مستقل تغیر۔ ہمہ حال نیا احوال۔ اس میں کوئی قرار نہیں کوئی اماں نہیں۔ انسان کُرسی پہ بیٹھا بیٹھا بوڑھا ہو جاتا ہے۔ عمل نہ کرے تو بھی عمل جاری رہتا ہے۔

یہ بچپن کل کی بات تھی گزر گیا۔ کھیل کود کے زمانے گزر گئے۔ کیوں گزر گئے۔ بس یہی قانون ہے۔ ہر حال گزر جاتا ہے۔ ہر جلوہ رخصت ہو جاتا ہے۔ ہر لحظہ بدل جاتا ہے۔ بچپن گیا، جوانی آئی۔ آئی کہ نہ آئی بہر حال چلی گئی۔ کیسے؟ کیوں؟ بس ایسے ہی۔ آنے والی شے جاتی ہے۔ جوانی اور بڑھاپے میں فرق نہیں رہتا۔ مستقبل کا خیال رہے تو انسان جوان ہے اور اگر صرف ماضی کی یاد ہی باقی ہو تو انسان بوڑھا ہے۔ بوڑھے انسان کے پاس مستقبل کے منصوبے نہیں ہوتے۔ صرف ماضی کی حسرتیں ہوتی ہیں۔

انسان سفر کا آغاز کرتا ہے۔ اس کے پاس کتنے ہی راستے ہوتے ہیں جو راستہ چاہے اختیار کر لے۔ وہ آہستہ آہستہ راستے ترک کرتا جاتا ہے اور پھر ایک صبح اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے پاس صرف ایک ہی راستہ رہ گیا ہے۔ اب اس کی زندگی لامحدود امکانات سے محدود ممکن میں داخل ہوتی ہے۔ ہر انسان کے ساتھ یہ ہوتا ہے۔ کشادہ سڑکیں کم ہوتے ہوتے تنگ گلی تک آجاتی ہیں اور یہ تنگ گلی ایسی ہے کہ انسان مڑ بھی نہیں سکتا، واپس نہیں جا سکتا۔ بس آزاد انسان مجبور انسان بن کے رہ جاتا ہے۔

پھیلے ہوئے خیالات، پھیلے ہوئے پروگرام، پھیلے ہوئے آسمان سب سمٹ جاتے ہیں۔ ہر حال بدل جاتا ہے۔ ہر لمحہ نیا لمحہ ہے اور آخر کار قدرتوں والا انسان بے بسی کو تسلیم کر لیتا ہے اور موسم بدلتے بدلتے آخری موسم آجاتا ہے جس کے بعد کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ آخری باب ہے زندگی کا۔

یہ کائنات ہر حال میں بدلتی ہے۔ بس ایک چکی ہے کہ چل رہی ہے۔ پیس رہی ہے زندگی کو اور جنم دے رہی ہے نئی زندگی کو۔ رنگ بنتے ہیں اور رنگ مٹتے ہیں۔ ایک رنگ جو ہمیشہ قائم رہتا ہے، وہ ہے اللہ کا رنگ، اس کا جلوہ۔ ہر شے تبدیل ہوتے ہوئے مٹتی چلی جاتی ہے، لیکن اللہ کا رنگ، شان والا اللہ نئی تابانیوں کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ کائنات بدلتی ہے اور کائنات کو تبدیلیاں عطا کرنے والا قائم و دائم ہے۔ جوں کا توں۔ اس میں نہ کمی ہوتی ہے نہ اضافہ۔

وہ اپنے جلووں میں باقی رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر تبدیلی، ہر تغیّر پیغام فنا ہے، ہر رنگ عارضی ہے۔ ہر اختیار بے بسی ہے۔ ہر حاصل محرومی ہے۔ ہر ہونا نہ ہونا ہے۔ ہم سے کوئی ہماری عمر پوچھے تو ہم گزری ہوئی عمر بتا دیتے ہیں، جو اپنے پاس نہیں ہے اس کو شمار کرتے رہتے ہیں۔ جو خرچ ہو گیا اسے گنتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ہماری اصل عمر تو وہ ہے، جو باقی ہے۔ انسان سمجھتا نہیں۔ تبدیلیوں کے عارضے میں مبتلا انسان اور انسان کی زندگی اور گردوپیش کی کائنات سب عارضی اور فانی ہے۔ یہ قافلہ ٹھہر نہیں سکتا۔ ہر ذرہ تڑپ رہا ہے اور مر رہا ہے۔ تغیّر کو ضرور ثبات ہے لیکن یہ ثبات بھی متغیّر ہے۔ اصل ثبات اُس کے لیے ہے جو ذات ذُوالجلال وَالاِکرام ہے۔ باقی سب وہم و خیال کی بدلتی ہوئی محفل ہے۔ باقی سب آرائش، جمالِ کائنات کا حسن ہے، لیکن یہی کائنات کا راز ہے اور یہ راز یوں آشکار ہوتا ہے کہ انسان سمجھ لیتا ہے کہ

"اوّل و آخر فنا باطن وظاہر فنا۔"



انسان عجب مخلوق ہے۔ خود تماشا ہے اور خود ہی تماشائی۔

انسان خود ہی میلہ لگاتا ہے اور خود ہی میلہ دیکھنے نکلتا ہے۔

ہجوم میں ہر انسان ہجوم کا حصہ ہے اور ہر انسان اپنے علاوہ انسانوں کو ہجوم کہتا ہے۔ تنہائیاں اکٹھی ہو جائیں تو میلے بن جاتے ہیں۔

ننھے چراغ مل کر چراغاں بن جاتے ہیں۔

عبادت

عابد اور معبود کے درمیان رشتہ عبادت ہے۔ معبود کے احکامات کی بجا آوری عبادت کہلاتی ہے۔ یہ احکامات اوامر و نواہی کی شکل میں ہمیں پیغمبرؐ کی ذاتِ اقدس اور قرآنِ حکیم کے وسیلہ سے معلوم و وصول ہوتے ہیں۔ ان کی تعمیل بغیر عذر اور تردّد کے عبادت کی اصل ہے۔

مسلمانوں کو عبادات کے مفہوم سے کما حقہٗ آگاہ کرنے کے لیے حضورِ اکرمؐ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں عملی کردار ادا فرمایا۔ عبادت کے اس مفہوم میں نہ اضافے کی گنجائش ہے، نہ تخفیف کی۔ نماز فرض ہے، تو سب کے لیے سب زمانوں میں فرض ہے۔ اسی طرح باقی عبادات۔ اس میں نہ کوئی کلام ہے نہ کسی بحث کی ضرورت۔ احکامِ عبادت میں کوئی ابہام نہیں۔ اس میں کوئی مزید وضاحت درکار نہیں۔ معبود کے احکام جاری ہو چکے ہیں۔ ان کی تعمیل پیغمبرؐ کے زمانہ سے آج تک من و عن جاری ہے۔ ملّتِ اسلامیہ کا عبادت کا طریقہ کار وہی ہے جو حضور پُرنورؐ کے زمانہ مبارک میں تھا۔

معبود کا حکم ہے کہ حرام نہ کھایا جائے۔ پس حرام مال سے اجتناب عبادت ہے۔ ماں باپ کا اس حد تک ادب کیا جائے کہ ان کے آگے "اُف" تک کا لفظ نہ کہا جائے۔ پس والدین کی خدمت عبادت ہے۔ غرضیکہ جو کچھ بھی معبودؐ نے فرما دیا، اس پر یقین اور عمل عبادت ہے۔ جو کچھ کرنے کے لیے کہا گیا، وہ کیا جائے اور جس سے بچنے کے لیے کہا گیا، اس سے بچا جائے یہی عبادت ہے۔ عبادت عقیدہ بھی ہے اور عمل بھی۔

ایک بات جو اس ضمن میں قابلِ غور ہے، وہ یہ ہے کہ ہمارا معبود ہمارا خالق بھی ہے خالق نے مخلوق کے لیے تخلیق کے حوالے سے بھی فرائض عائد فرما رکھے ہیں۔ ان کی بجا آوری بھی عبادت

ہی کہلائے گی۔ مثلاً خالق نے ہمیں انسان پیدا فرمایا۔ انسانیت کے تحفظ کے لیے جو اعمال فرض ہیں، انہیں ادا کرنا عبادت ہے۔ اگر سانس لینا فرض ہے، تو سانس کی حفاظت عبادت ہے۔ خالق کی عطا کی ہوئی زندگی اپنے دامن میں فرائض کا انبار لیے ہوئے ہے۔ اِن فرائض کو پورا کرنا ہے۔ مثلاً رزق کمانا ضروری ہے، فرض ہے، مجبوری ہے۔ پس رزق کمانے کا عمل عبادت ہے۔ رزق کمانے کے بعد اس کی مناسب تقسیم عبادت ہے۔ اللہ کا حصّہ اللہ کو دیا جائے، دنیا کا حصّہ دنیا کو دیا جائے، اپنا حصّہ اپنے استعمال میں لایا جائے، یہ عبادت ہے۔ اپنے استعمال میں آنے والے رزق کو مناسب استعمال کرنا بھی عبادت ہے۔ مطلب یہ کہ زندگی کو اپنے ماحول میں پُرسکون بنانے کے ساتھ ساتھ اسے دین کے تابع رکھنا ہی عبادت ہے۔

حج، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ کی عبادات سب کے لیے یکساں ہیں لیکن زندگی کے فرائض میں ہر انسان ہر دوسرے انسان سے مختلف ہے۔ یکساں عبادت اپنی جگہ اٹل لیکن غیر یکساں عبادت اپنی اہمیت کے لحاظ سے اتنی ہی اٹل ہے اور اس کا مفہوم ہر دَور اور ہر زمانے میں ہر معاشرے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا ہے اس لیے زندگی کے فرائض کی بجا آوری میں اکثر رہنمائیاں درکار رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یکساں عبادت یکساں نتیجہ نہیں پیدا کرتی۔ ہر نمازی نیک نہیں ہوتا۔ ہر مسجد کا ماحول ہر دوسری مسجد کے ماحول کے مساوی نظر نہیں آتا، اس لیے کہ زندگی اور زندگی کے تقاضے یکساں نہیں۔

نیت بدل جائے تو نیک عمل نیک نہیں رہتا۔ انسان اندر سے منافق ہو، تو اس کا کلمۂ توحید کلمۂ توحید نہ ہوگا۔ ہر چند کہ کلمۂ توحید وہی ہے۔ قرآن بیان کرنے والے اور قرآن سننے والے اگر متقی نہ ہوں، تو قرآن فہمی سے وہ نتائج کبھی نہیں پیدا ہوں گے، جو قرآن کا منشاء ہیں۔

اللہ کریم کا ارشاد ہے کہ اگر منافق حضور اکرمؐ کی نبوت کی گواہی دیں تو یہ بیان ہر چند کہ سچا ہے لیکن منافق جھوٹ بول رہے ہیں۔ اسلام کے دشمن اگر مسجد بنائیں تو وہ مسجد گرا دی جائے۔ اس سے مساجد کا احترام مجروح نہیں ہوتا، بلکہ اس کے برعکس یہ مساجد کے احترام کا ہی عمل ہے۔

اگر مساجد میں عبادت جاری ہے اور اہلِ محلہ کی معاشرتی زندگی میں اصلاح کا عمل نہیں پیدا ہوا، تو ایسی عبادت قابلِ غور ہے۔ نماز کا مدعا صرف نماز ادا کرنا ہی نہیں، بلکہ نماز کے انداز اور مفہوم کو زندگی میں رائج کرنا ہے۔ اگر زندگی سماجی قباحتوں میں بدستور گرفتار ہے اور نماز بدستور ادا کی جا رہی ہے، تو ایسی صُورت حال پر بڑا غور ہونا چاہیے۔

مثلاً ایک عابد ڈاکٹر مریضوں کے حق میں صحیح نہیں تو اُس کے لیے اُس کی عبادت منفعت نہ لائے گی۔ اسی طرح اگر ہم تمام شعبہ ہائے حیات میں زندگی کے فرائض ادا نہ کریں اور معبُود کی عبادتیں جاری رکھیں، تو یہ منشائے عبادت نہیں۔ منشائے عبادت یہ ہے کہ فرائض حیات بھی ادا کیے جائیں اور معبُود کی عبادت بھی جاری رہے۔

اگر اولاد کی پرورش فرض ہے تو اولاد کے لیے صحت مند ماحول مہیا کرنے کا عمل عبادت ہے۔ ایک دوسرے کا احترام عبادت ہے۔ خالق کے اعمال کا احترام عبادت ہے۔ خالق نے یہ کائنات تخلیق فرمائی۔ انسان تخلیق فرمائے۔ کافر مومن، کالے گورے۔ صحت مند بیمار، محتاج غریب وغیرہ۔ ان کا احترام تخلیق کے حوالے سے فرض ہے اور دین کے حوالے سے ان کی اصلاح عبادت ہے۔ کافر کو دعوتِ اسلام دینا عبادت ہے۔ یہ دعوت محبت سے دی جائے یا قوت سے دی جائے، مفہوم کافر کی اصلاح ہے۔ منشائے اصلاح ہی عبادت ہے۔

اللہ کے لیے دعوتِ عمل صرف اللہ ہی کے لیے ہو تو عبادت اور اگر اس میں انا یا نفس شامل ہو جائے تو عبادت نہ رہے گی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ جب عبادت وہی ہے، معبود بھی وہی ہے تو نتیجہ وہی نہیں۔ کیوں؟

آج مسلمانانِ عالم اپنی عبادات کے باوجود اقوامِ عالم میں پسماندہ ہیں۔ کیوں؟ اگر اللہ کا پسندیدہ دین اسلام ہی ہے اور اس میں شک نہیں کہ ہے اور ہم مسلمان یعنی اسلام قبول کرنے والے، تو ہماری زندگی ہمارے مالک سے قریب ہونے کے دعویٰ کے باوجود آسانیوں سے محروم ہے، تو ہمیں سوچنا پڑے گا کہ کچھ نہ کچھ کہیں نہ کہیں بگاڑ ہے۔ پانی کہیں مر رہا ہے۔

مسجدِ اقصیٰ مسلمانوں کے لیے ہی نہیں، اللہ کے لیے بھی محبت کی ایک یادگار ہے یہودیوں کے قبضے میں ہے۔ ہم بے بس ہیں۔ اللہ تو بے بس نہیں (نعوذ باللہ) کچھ نہ کچھ ہے کہیں نہ کہیں۔

خانہ کعبہ مقامِ امن ہے۔ اس میں ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ وہ مہدی ہے۔ مار دیا جاتا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اگر اس نے جھوٹ بولا تو خانہ کعبہ میں بولا۔ اگر وہ قتل ہوا تو خانہ کعبہ میں۔ دونوں حالتیں اسلام کے دعووں کے لیے قابلِ غور ہیں۔

ہم عبادت کرتے ہیں۔ دعائیں مانگتے ہیں۔ نیک اعمال کرتے ہیں لیکن زندگی مشکلات سے باہر نہیں نکلتی۔ کیوں؟

مسلمانوں کے پاس سب سے زیادہ دولت ہے اور مسلمان ہی سب سے زیادہ غریب ہیں اور پھر بھی وہ مسلمان ہیں۔ اخوّت کا درس اور چیز ہے اور اخوّت کا عمل اور۔ مسلمانوں کے لیے تیل کے چشمے ہیں، سرچشمے ہیں اور مسلمانوں کے پاس چراغ کے لیے تیل نہیں۔

اگر اعمال یہودیوں کے سے ہوں اور عبادت مسلمانوں کی سی ہو تو نتیجہ کیا ہوگا؟

محمدؐ بن قاسم کا حملہ اس لیے ہُوا کہ مسلمان خواتین کی بے حرمتی ہُوئی تھی۔ محمدؐ بن قاسم جلالِ خداوندی بن کر ناموسِ ملّت کے تحفّظ کے لیے تشریف لائے۔ آج اگر مسلمان مرد ہی مسلمان خواتین کی بے حرمتی فرمائیں، تو محمدؐ بن قاسم کہاں سے آئے اور کیا کرے؟ بے بسی ہے!!

عبادت کے مفہوم کی وضاحت میں علامہ اقبال نے کیا خوبصورت اشعار فرمائے ہیں ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

کتنا روح پرور منظر ہوگا، غزنوی و ایاز ایک ہی دربار میں یکساں حالت میں موجود ہیں آقا و غلام کی تقسیم ختم ہوگئی۔ یہ عبادت کی اصل ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر منشائے عبادت آقا و غلام کی تقسیم ختم کرنا ہے، تو کتنی دیر کے لیے ؟ صرف نماز میں ؟ یہی عبادت کی اصل ہے اور یہی عبادت سے محرومی ہے کہ ہم صرف نماز میں بندہ و صاحب کی تقسیم ختم کرتے ہیں اور زندگی میں یہ فرق جاری رہتا ہے۔

اگر عبادت کی حالت زندگی میں رائج ہو جائے، تو عبادت کے نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ غزنوی اور ایاز کی تقسیم ختم کرنے کے لیے عبادت فرض کی گئی اور ہم نے محمود اور ایاز کے درجے قائم رکھ کر عبادت ادا کی، اس لیے عبادت کی برکت زندگی میں شامل نہ ہو سکی۔ ایک آدمی آٹے میں ملاوٹ کرتا جا رہا ہے اور عبادت بھی کرتا جا رہا ہے۔ وہ نہ یہ کام چھوڑتا ہے نہ وہ، نتیجہ سامنے ہے۔ ایک انسان جھوٹا ہے اور سچا کلام سنایا جا رہا ہے۔ نتیجہ کیا ہو گا۔ متقی نہ ہو تو انسان قرآن سے فلاح نہیں پا سکتا۔ ایک کافر اگر قرآن پڑھ لے، تو مومن نہیں ہو جاتا۔ تقویٰ شرط ہے، ہدایت کے لیے۔

حضورِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ ہمارے سامنے ہے۔ آپؐ کا مرتبہ اس کائنات کے تمام مراتب سے بلند۔ آپؐ کی ذاتِ گرامی باعثِ تخلیقِ کائنات ہے۔ آپؐ پر درود و سلام ہو۔ آپؐ نے اپنے منصب کی بلندیوں کے باوجود اپنی زندگی کو اپنے جاں نثاروں کی زندگی کے برابر رکھا۔ آپؐ اللہ کے پاس تشریف لے جاتے ہیں اور لباس میں پیوند ہے۔ آپؐ نے کبھی اپنے پاس مال جمع نہ رکھا، بلکہ آپؐ نے دو وقت کا کھانا محفوظ رکھنا بھی پسند نہ فرمایا۔

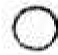
عبادت کی تاثیر حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ عابدوں پہ زندگی کی نوازشیں یکساں ہوں۔ اگر ناہموار معاشی، سماجی اور معاشرتی زندگیاں ایک جگہ یکساں عبادت کے عمل میں مصروف رہیں اور سالہا سال رہیں تو بھی نتیجہ یکساں نہ نکلے گا، بلکہ کچھ نتیجہ نہ نکلے گا۔ ہماری عبادت اپنے ثواب سے محروم ہے، اس لیے کہ ہماری زندگی یکساں مواقع سے محروم ہے۔

یتیم کا مال چھین کر حج کرنے والا ظالم حج کے ثواب سے کیوں نہ محروم رہے۔ مسلمانوں کا حج مسلمانوں کے لیے وہ نتیجہ نہیں پیدا کر رہا، اس لیے کہ حج کے موقع پر تمام خرید و فروخت اُس

مال کی ہوتی ہے، جو یہودیوں کا بنا ہُوا، جہاز ان کے بنے ہوتے، سامان ان کا بکتا ہے یعنی حج ہمارا اور ثواب ان کو۔ ہم غیر مسلم معاشرے کی بنی ہوئی اشیا خریدنے سے کیوں گریز نہیں کرتے؟

عبادت کے ثواب کو مسلمانوں کے لیے وقف کر دینا بھی عبادت۔ دل مومن نہ ہو تو عبادت کس کام کی؟ دل سے اللہ کو ماننا ہی عبادت ہے۔ مشکلات پر صبر کرنا عبادت، نعمتوں پر شکر ادا کرنا عبادت، اپنی منشا کو منشائے الٰہی کے تابع کرنا ہی عین عبادت ہے۔ محروم اور مظلوم کو حق دلانا عبادت ہے۔ اپنی زندگی کو بے ضرر بنانا عبادت کی ابتدا اور زندگی کو منفعت بخش بنانا اس کی انتہا۔ انسان جتنا اللہ کے قریب ہو گا، اُتنا ہی مخلوق پر مہربان ہو گا۔ یہی اصل ہے کہ جو اللہ کے حبیب ہیں، اللہ کے انتہائی قریب ہیں۔ وہی کائنات میں سب کے لیے رحمت ہیں۔ اللہ کی عبادت ہمیں مخلوق پر شفیق بناتی ہے۔ مخلوق پر ظلم کرنے والا، اُن سے دھوکا کرنے والا، اُن کی خوراک میں ملاوٹ کرنے والا جتنی عبادت کرتا جائے، بے فائدہ ہے۔ کسی کا حق چھیننے والا تقربِ الٰہی کا دعویٰ کرے، تو یہ دعویٰ دلیل سے محروم ہے۔

عبادت اجتماعی فلاح کے لیے ایک حقیقی اور اسلامی راستہ ہے۔ عبادت انفرادی امتیاز نہیں۔ کشتی کنارے لگی، تو سب ہی کنارے لگیں گے، ورنہ سب کے لیے مشکل ہے!!



اک عجب چال چل گیا رستہ
چلتے چلتے بدل گیا رستہ
آسماں تھا مری نگاہوں میں
پاؤں سے جب نکل گیا رستہ

خوش نصیب

یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ خوش نصیب کون ہے۔ کسی بڑے خوش نصیب کی زندگی کا جائزہ لیں تو معلوم ہو سکتا ہے کہ خوش نصیبی کسے کہتے ہیں۔ ہمارے عقیدے اور معلومات میں پیغمبر ہی خوش نصیب ہیں۔ وہ لوگ جن کی زندگی دوسروں کے لیے ایک مثالی نمونہ ہے۔ جن کا ذکر بھی اہلِ فکر حضرات کے لیے سکون و برکت کا باعث ہے۔

اگر ہم کسی پیغمبر کی پوری زندگی کو غور سے دیکھیں تو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ ان کی خوش نصیبی نے کیا کیا منظر دیکھے اور کیا کیا منزلیں طے کیں۔ ایک پیغمبر بیٹے کی جدائی میں روتے روتے بینائی سے محروم ہو گئے۔ پیغمبر ہیں اور بیٹے سے جدا اور بیٹا بھی پیغمبر۔ بیٹے کی پیغمبری کی ابتدا کنوئیں میں گرنے سے ہوتی ہے۔ خوب صورت اور خوب سیرت پیغمبر، بھائیوں کے ناروا سلوک سے آشنا۔ اور پھر بازارِ مصر ہے اور پیغمبر کو بیچا جا رہا ہے۔ اور پھر الزام تراشی اور قید خانہ کی صعوبت۔ معصوم ہیں لیکن مقید۔ مصر کا مالک مصر کے قید خانے میں۔ عجب حال ہے علم والے ہیں، عزت والے ہیں، مرتبے والے ہیں، حسن والے۔ اللہ کے اتنے قریب ہیں کہ قرآن میں آپ کے تذکرے ہیں۔ آپ کا ذکر احسنُ القصص ہے۔ آپ کا حُسن مثالی ہے۔ خوش نصیبی کی انتہا ہے۔

ایک اور پیغمبر۔ خوش نصیب پیغمبر، کم و بیش ہزار سال تک اللہ کے دین کی تبلیغ فرماتے ہیں۔ دین کی خدمت کرتے ہیں اور آخرکار اپنے بیٹے کو طوفان کی نذر ہوتے دیکھتے ہیں۔ التجا کرتے ہیں، خدا سے التجا کہ میرا بیٹا بچا لو۔ حکمِ خداوندی آتا ہے کہ "بیٹا جب باپ کے عقیدے پر ہی نہ ہو، تو کیا بیٹا، جانے دو لہروں کے سنگ"۔ پیغمبر ہیں اور خوش نصیب ہیں،

اس لیے خاموش رہتے ہیں۔ نبوت سلامت رہتی ہے اور زندگی خوش نصیبی میں کٹ جاتی ہے۔ ایک اور پیغمبر مچھلی کے پیٹ میں نبوت لیے، تقرب لیے۔ خوش نصیبی ہے، لیکن مچھلی کا پیٹ بھی ہے۔

کسی پیغمبر کو آرے میں چیر دیا جاتا ہے، اُف نہیں کی جاتی، کیونکہ اُف کرنا خوش نصیبی کے خلاف ہے۔ کتنے پیغمبروں کا ذکر کیا جائے۔ ایک پیغمبر گھر سے بے گھر۔ بادشاہِ وقت سے مقابلہ، دولت والے کے خلاف۔ بادشاہت والے، سلطنت والے، دبدبے والے، انسان کے خلاف ایک پیغمبر، جس کے پاس مال و زر نہیں، تخت و تاج نہیں، بس صرف خوش نصیبی ہے۔ بادشاہ دریا کی موجوں میں غرق ہوتا ہے اور پیغمبر کو آسودۂ منزل کر دیا جاتا ہے۔ پیغمبر کا مشن پورا ہو گیا، خوش نصیبی ہے۔ بڑا نصیب ہے۔

اور پیغمبروں کے ذکر میں اس آخری رسول، عزت و شوکت والے پیارے نبی یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیسے نہ آئے۔ آپ سے زیادہ دنیا میں کون خوش نصیب ہو سکتا ہے۔ ایک طرف اللہ اور اس کے فرشتے آپؐ پر درود بھیجتے ہیں دوسری طرف دنیا میں آپؐ کے جاں نثار آپؐ پر درود و سلام اور نعت کے ہدیے پیش کرتے ہیں۔ آپؐ ایسے خوش نصیب ہیں کہ اپنے تو اپنے، بیگانے بھی آپ کو عقیدت کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔ آپ اتنے خوش نصیب ہیں کہ جو آپؐ کا غلام ہو گیا، وہ بھی خوش نصیب کر دیا گیا۔ لیکن غور طلب بات ہے کہ آپؐ کی زندگی کس کس راہ سے گزری۔ آپؐ پر کیا کیا وقت آیا۔ کون کون سے مراحل آئے۔ آپؐ سلطان الانبیاء ہیں اور آپؐ پر کوڑا پھینکا گیا۔ آپ باعثِ تخلیقِ کائنات ہیں اور آپؐ پر زمین تنگ کر دی گئی۔ ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ آپؐ نے کفار سے پتھر کھا کر اپنے بہنے والے خون سے انہی کفار کے لیے دعائیں لکھیں۔ کسی پر لعنت نہ بھیجی۔ خوش نصیبی کی انتہا ہے کہ پیوند والا لباس زیبِ تن ہے اور آسمانوں سے بلاوا آتا ہے کہ اللہ اپنے خاص بندے کو آج سیر کرائے گا۔ کیا کیا نہ دکھائے گا، کیا کیا نہ بتائے گا۔ کیا کیا نہ آشکار ہو گا۔ سب کچھ ہو گا۔ سب ماضی سے ملاقات ہو گی اور مستقبل کے بھی

جلوے آشکار ہوں گے۔ اُمّت کے لیے دعائیں منظور ہوں گی، رفعتوں کی مسافت طے ہوگی، قابَ قوسَین بلکہ اس سے بھی آگے۔ جلوہ، جلوے کے رُوبرو ہوگا۔ آئینہ آئینے کے روبرو ہوگا۔ انسان اللہ کے قریب ترین ہوگا۔ ایسا قرب کہ نہ کبھی ہوا، نہ کسی کو حاصل ہوگا، لیکن لباس میں پیوند رہے گا۔ خوش نصیبی وجود کا ظاہر نہیں، وجود کا باطن ہے۔

یہ بات ہمیں سمجھ میں نہیں آسکتی کہ امام حسینؑ کیوں خوش نصیب ہیں۔ آپ پر کربلا گزری اور یہ بہت بڑی کٹھن منزل تھی۔ کیا کیا نہ ہُوا۔ کون سا غم تھا جو نہ ملا ہو۔ کون سا مرحلہ تھا، جو نہ آیا ہو۔ مراحل ہی مراحل، مشکل ہی مشکل۔ خود مشکل کشا اور یہ ابتلا۔ مالک ذوالفقار کے اور پھر جلوے گردشِ روزگار کے۔ بڑے نصیب کی باتیں ہیں۔ تقرب کے صحیفے ہیں۔ زمین پر ہونے والا آسمانی کرشمہ۔ خود تماشا و خود تماشائی۔ عجب صُورتِ حال ہے۔ خوش نصیبی کی شرح دلپذیر اپنے خون سے رقم کر رہے ہیں۔ سیدالشہداء نے خوش نصیبی کو وہ رنگ عطا کیا کہ کہنے والے برملا کہہ اُٹھے ؎

حقا کہ بنائے لاالٰہ است حسینؑ

یہ سب حسین اوراق ہیں، خوش نصیبی کی کتاب مقدس کے۔ یہ سب مقطعات ہیں، خوش نصیبی کی الہامی کتاب کے۔ کون جانے اور کون سمجھے۔ علم کے مخفی خزانوں کی کنجیاں ہیں، ان خوش نصیبوں کے پاس۔ ساقیٔ کوثر ہیں اور دریا کے کنارے پر پیاسے ہیں۔ یہ سب رازہائے سربستہ کی کرشمہ کاریاں ہیں۔ آج کا انسان کیا جانے کہ خوش نصیبی کیا ہے۔ آج کسی کو غریبی اور اور پیغمبری اکٹھی مل جائے تو وہ پیغمبری سے استعفیٰ دے دے۔ اگر آج کے انسان کو دولت اور خدا میں سے ایک کو چُننا پڑے، تو وہ دولت قبول کر لے گا۔ دل اور شکم کا قصّہ تو اقبالؔ نے فرما دیا کہ ؏

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت

آج کا انسان صرف دولت کو خوش نصیبی سمجھتا ہے اور یہی اس کی بدنصیبی کا ثبوت ہے۔ آج کا انسان یا مسلمان زندگی فرعون کی پسند کرتا ہے اور عاقبت موسیٰ کی۔ بدقسمت ہے آج کا انسان۔ آسائشوں کا گرفتار، نمائشوں کا پرستار، آرائشوں کا پجاری، آلائشوں کی بیماری میں

گراہ رہا ہے۔ اس کا دل بجھ چکا ہے، لیکن اس کے مکان میں قمقمے روشن ہیں۔ وہ لذت وجود کی لعنت میں گرفتار ہے۔ اسے کسی بڑے مقصد سے تعارف نہیں۔ وہ صرف سنچریاں ہی بناتا ہے اور پھر کلین بولڈ ہو کر رخصت ہوتا ہے۔

آج ترقی کو مُدعائے حیات سمجھا جا رہا ہے۔ ترقی، کیسی ترقی، کس سے ترقی، کس پر ترقی۔ خوراک کی بجائے دوائی کھانے والا انسان کیا ترقی کرے گا۔ آسمان زیرِ قدم آ گیا۔ آسمانوں کی راہ ڈھونڈنے والا دل کی دنیا ویران کر چکا ہے۔ انسان، انسان سے اجنبی ہے۔ اپنے آپ سے بیگانہ۔ مقصدِ حیات سے بے خبر۔ خوش نصیبی کے مفہوم سے ناآشنا۔

خوش نصیبی کسی شے کا نام نہیں۔ سماجی مرتبے کا نام نہیں۔ بینک بیلنس کا نام نہیں۔ بڑے بڑے مکانوں کا نام نہیں۔ خوش نصیبی صرف اپنے نصیب پر خوش رہنے کا نام ہے۔ کوشش ترک کرنے کا مقصد نہیں۔ کسی خوش نصیب نے آج تک کوشش ترک نہیں کی، لیکن یہ کوشش بامقصد ہونی چاہیے۔ ایسی کوشش کہ زندگی بھی آسان ہو اور موت بھی آسان ہو۔ یہ دُنیا بھی اچھی اور وہ دنیا بھی بہتر۔ ایسی زندگی کہ ہم بھی راضی رہیں اور ہماری زندگی پر خدا بھی راضی ہو۔

خوش نصیبی ایک متوازن زندگی کا نام ہے۔ نہ زندگی سے فرار ہو نہ بندگی سے فرار ہو۔ ایک ایسا انداز کہ نہ لالچ ہو نہ کنجوسی، نہ بخل۔ لالچی انسان پیسے گنتا رہتا ہے، جمع کرتا ہے اور آخر کار عذاب کی گرفت میں آ جاتا ہے۔ کنجوس اپنی دولت کے استعمال سے محروم ہے۔ وہ کسی کے مال کی حفاظت کرتا رہتا ہے، استعمال کا حکم نہیں اور بخیل اپنے مال سے کسی کو کچھ نہیں دیتا۔ وہ ایسا سورج ہے، جس کی روشنی نہیں۔ ایسا دریا ہے، جس میں پانی نہیں، ایسا انسان ہے، جس میں انسانیت نہیں۔

خوش نصیب انسان حق کے قریب رہتا ہے۔ وہ ہوس اور حسرت سے آزاد ہے۔ وہ فنا کے دیس میں بقا کا مسافر ہے۔ اس کا دل جلوۂ پُرنور سے معمور ہے۔ وہ اپنے آپ پر راضی، اپنی زندگی پر راضی، اپنے حال پر راضی، اپنے حالات پر راضی، اپنے خیالات پر راضی، اپنے خدا پر راضی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راضی۔ سلام ہو خوش نصیبوں کی خدمت میں!!

○

اِختلاف

جب تک رات اور دن قائم ہیں، اختلاف قائم رہے گا۔ اختلاف ہی شاید زندگی ہے، زندگی کا حسن ہے، زندگی کا دوام ہے۔ خالق نے تخلیقِ کائنات میں اختلافِ لیل و نہار ہی نہیں، اختلافِ عقائد، اختلافِ مزاج، اختلافِ مشاہدات بلکہ اختلافِ حالات کو تخلیق فرما کر فنِ تخلیق کے کمالات کا اظہار فرمایا ہے۔

ہر عقیدے کے مخالف ایک عقیدہ ہے، ہر آرزو کے برعکس آرزو ہے، ہر مزاج کے روبرو ایک مزاج ہے، ہر جنس کے مقابل ایک جنس ہے، ہر انا کے سامنے ایک انا ہے۔ ہر خودی کی ضد ایک خودی ہے، ہر خوشی کے باطن میں غم ہے اور ہر مایوسی کے عالم میں امید جلوہ گر ہے۔ . . .

دنیا میں اگر کوئی شے ناممکن ہے، تو ہم رنگی و یک رنگیِ عقیدہ ہے۔ اللہ کریم نے اپنی لامحدود قدرتوں کے سامنے اپنی ہی مخلوق میں سے ایک قوت، اپنی ذات کے مقابل، بغاوت و طاغوت میں قائم۔ بیان فرمائی ہے۔ قادرِ مطلق کے حکمِ مطلق سے انکار کرنے کا حوصلہ رکھنے والا کون ہو سکتا ہے؟ اگر ہے تو کیوں ہے؟ اُسے جرأتِ انکار کیوں ہے؟ اُسے موت کیوں نہ آئی؟ وہ فنا کیوں نہ کر دیا گیا؟ اگر شیطان نے بغاوت کی بھی تو اس بات کا بیان قرآن کی آیت کیوں ہے؟ اختلاف کو عالی ظرفی اور خندہ پیشانی سے برداشت کرنا بقائے حیات اور بقائے اختیار کا ثبوت ہے . . . . خالق مخالف کو تباہ نہیں کرتا۔ مخلوق مخالف کو تباہ کرنا چاہتی ہے۔ یہی خالق اور مخلوق میں فرق ہے۔ لوگوں نے قیامت کے بارے میں پوچھا . . . . اللہ نے ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ ایسی خبر کے بارے میں پوچھتے ہیں، جس میں ان کا اختلاف ہے۔ اختلاف مشاہدے کے بغیر ختم نہیں ہوتا اور قیامت کا مشاہدہ زندگی ختم کر دے گا۔ پھر لوگ جان

لیں گے۔ ان کو علم ہو جائے گا اور وہ علم کیا علم ہوگا جو صاحبِ علم کو فنا کر دے۔

زندگی میں اختلاف ایسے ہے، جیسے فطرت کے مشاہدات میں اختلاف ۔ ۔ ۔ ۔ عجب حسن ہے اختلاف کے عالم میں۔!!

پہاڑ ہیں کہ میخوں کی طرح گڑے ہیں۔ چٹانیں ٹھوس، قوی عزم کی طرح اٹل اپنی جگہ قائم و دائم۔ اور پھر پہاڑوں کے دامن میں وادیاں حسین و جمیل، دریا رواں دواں اور پھر میدان بچھونے کی طرح کشادہ اور پھر صحرا اور سمندر۔ پیاسے صحرا اور لبریز سمندر، عجب عالم ہے۔ حسن ہی حسن، جلوہ ہی جلوہ اور اختلاف ہی اختلاف !!

تیز ہوائیں، خاموش فضائیں، بلند آسمان، متحرک اجسام، منوّر سیّارگان، تاریک راتوں میں روشن قمر، درخشندہ ستارے اور پھر سورج، بقا اور فنا کا بیک وقت پیامبر۔ سب اختلافاتِ زیست کے حسین کرشمے ہیں۔

رونقِ حیات اختلافات کے دم سے ہے۔ گرمئی بازار نیرنگئ اشیا کے باعث ہے۔ شعور کی پختگی اور خیال کی بلندی اختلافِ شعور اور اختلافِ رائے سے ہے۔

عقیدے کی پختگی اختلافِ عقیدہ کی برداشت کا نام ہے۔ ناپختہ عقیدہ چھوٹے برتن کی طرح جلد گرم ہو جاتا ہے۔ سب سے قوی عقیدہ اُس ذاتِ گرامی کا ہے، جو کائنات کے ہر انسان کے لیے رحمت کا پیغامبر ہے۔ سلام ہو اُس ذات پر، جو سب کی سلامتی کی خواہاں ہے، جس نے کسی کے لیے بد دعا نہیں کی، جو ہر زخم کے لیے مرہم ہے، جو ہر دل سے پیار فرماتی ہے، جس کے پاس شفقتوں کے خزانے ہیں، جس نے کم ظرفوں کو عالی ظرف بنایا، جس نے اختلاف برداشت نہ کرنے والوں کو صبر و استقامت کی منزلیں عطا فرمائیں۔ بلند عقیدہ بلند دروازوں کی طرح آنے والوں کے استقبال میں کشادہ رہتا ہے۔ محبّت نہ ہو تو عقیدہ بلند نہیں ہو سکتا اور محبت نفرت کی ضد ہے۔ عقیدوں سے نفرت انسانوں سے نفرت ہے اور انسانوں سے نفرت خالق کی محبت سے محروم کر دیتی ہے۔

اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ سب عقائد درست ہیں، قطعاً نہیں۔ درست عقیدے والا نادرست عقائد کو محبت سے بدل دیتا ہے۔ نفرت اور غصہ عقیدوں کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ جس دل میں نفرت پرورش پائے، وہ خود عقیدے سے محروم ہو جاتا ہے۔

یہ بات ذرا پیچیدہ سی ہے، آئیے غور کریں!

اللہ کی زمین پر اللہ کے دیئے ہوئے رزق پر پلنے والے اللہ کے پیدا کیے ہوئے انسان اللہ کو نہیں مانتے۔ سوچیے کیا اللہ چاہتا ہے کہ سب لوگ ایک عقیدے میں شامل ہوں؟ کیا اللہ سب کو ہم عقیدہ بنانے پر قادر ہے کہ نہیں؟ اگر اللہ قادر ہے تو کیوں نہیں سب کو ہم عقیدہ بناتا؟ اللہ یقیناً قادر ہے اور اپنی قدرتِ کاملہ سے ہی عقیدوں کے اختلاف کے باوجود کائنات کے ہر انسان کو رزق عطا فرماتا ہے۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ نے اختلاف کو کبھی تباہ نہیں فرمایا یا مکمل طور پر اختلاف کا خاتمہ نہیں کیا۔ ... شیطان اللہ کا دشمن ہے، لیکن ہے اور رہے گا ..... !! اختلاف کا جواز یہ ہے کہ جنت پیدا فرمانے والے نے دوزخ کو بھی پیدا فرمایا۔ قوت اور صداقت ایک ہی طاقت کے نام ہیں اور اسی طاقت کو عقیدہ کہتے ہیں۔ یہ طاقت اختلاف پر برہم نہیں ہوتی۔ قوت بغاوت سے ڈرتی نہیں۔ صداقت آفتاب کی طرح ہے، جسے کسی کاذب اندھیرے کا ڈر نہیں ہوتا۔ عقیدہ اتنا مطمئن ہوتا ہے کہ اسے کسی اختلاف کا خوف نہیں ہوتا۔ ... خوفزدہ عقیدہ عقیدہ نہیں رہ سکتا!! ساری کائنات بھی اگر مخالف ہو جائے تو اللہ اور اللہ والوں کو فرق نہیں پڑ سکتا۔!

عقیدے کی طرح سیاست میں اختلاف رائے حیاتِ سیاست ہے۔ مخالف رائے کو تباہ کرنے کی آرزو کرنے والا دور عارضی رہتا ہے۔ جو زمانہ تاریخ میں داخل نہ ہو، وہ چاہے کتنا طویل ہو، عارضی ہوتا ہے۔ ہر انسان کو رائے دینے کا حق ہے، رائے رکھنے کا حق ہے، زندگی گزارنے کا حق ہے۔ ہمارا مخالف ہی تو ہمارا ثبوت ہے اور وہی ہماری تقویت بھی۔ اپنے اپنے مدار میں گردشیں کرنے والے لامحدود ستارے آسمانوں کی رونقیں ہیں۔ اسی طرح

کثرتِ رائے زندگی کی رونق ہے۔ جس طرح ہم اپنی رائے کو معتبر سمجھتے ہیں اسی طرح دوسرا انسان بھی اپنی رائے کو معتبر اور مستند سمجھتا ہے۔ اپنا احترام مقصود ہو، تو اختلاف رائے کا بھی احترام ہونا چاہیے۔ اگر مَیں رات کو آفتاب دیکھتا ہوں تو مجھے اس شخص کا بھی احترام کرنا چاہیے جو دن کو تارے دیکھتا ہے ..... ہر چند کہ دونوں باتیں بظاہر ناممکن ہیں۔

ہم اپنی خوش فہمی کو آگہی کہتے ہیں اور دوسروں کی آگہی کو غلط فہمی ..... تعجب ہے۔ یوم حساب سے پہلے ہم ایک دوسرے کی عاقبت خراب کرنے میں مصروف ہیں۔ ہم خود کو جنت کا مکین سمجھتے ہیں اور دوسروں کو دوزخ کا ایندھن ..... حالانکہ معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔

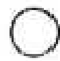
ہم خود کو اہم بلکہ بہت ہی اہم سمجھتے ہیں۔ ہم اپنے خیالات میں خود کو وی آئی پی سمجھتے ہیں۔ یہ ہماری کم ظرفی ہے۔ سیاست میں ہم اپنی جماعت کو محبِّ وطن سمجھتے ہیں اور دوسری جماعتوں کو غدّار۔ اپنی رائے پر مغرور ہونے والے انسان صحت رائے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان پر اصلاح کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ وہ بھُول جاتے ہیں کہ وہ انسان ہیں۔ خطا و نسیان، ظلم و جہالت کے پتلے !!

اختلاف کا احترام کرنا چاہیے۔ مخالف کی اصلاح محبّت سے کی جائے، مروت سے کی جائے۔ مخالفت شعور میں نکھار پیدا کرتی ہے ..... بادِ مخالف بلند پروازی کا زینہ ہے۔ اختلاف ہی بے قراری پیدا کرتا ہے۔ اختلاف کے دَم سے زندگی جمود سے نکل کر تحریک بنتی ہے۔ حرکت زندگی ہے، جمود موت۔ اختلاف انقلاب و ارتقاء کا ذریعہ ہے۔

عظیم انسان اختلاف کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ زندگی کا وسیع تر اختلاف زندگی کا حسن ہے اور خالق نے زندگی کو اختلاف کے زیور سے مزیّن فرما کر اُسے حُسن بخشا ہے۔ ایک گھر میں پیدا ہونے والے اور ایک چھت کے نیچے پرورش پانے والے ایک انداز فکر نہیں رکھتے۔ ایک دستر خوان پر پلنے والے ایک جیسا ذائقہ نہیں رکھ سکتے۔ دنیا کی طرف رجُوع کرنے والے اور آخرت پر نگاہ رکھنے والے الگ الگ رہیں گے۔ بھلا سونے والے

اور جاگنے والے کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔ ساری دنیا فوج نہیں بن سکتی کہ ایک ہی وردی میں ملبوس ہو۔ دنیا میں لباس الگ الگ رہے گا، مزاج الگ الگ ہوگا، رنگ الگ الگ ہوگا، عقیدے مختلف رہیں گے۔ دریا ہمیشہ رواں رہیں گے اور کنارے ساکن ہوں گے۔ پہاڑ بلند رہیں گے اور میدان کشادہ . . . کنجوس کا دل تنگ رہے گا اور سخی کی پیشانی کشادہ۔ ہمارے عقائد ہمارے تخیلات اور ہمارے رجحانات ہمارے ملبوسات کی طرح الگ الگ رہیں گے۔ ان ملبوسات کے اندر ہمارا وجود، حقیقی وجود . . . وجودِ واحد بے رنگ ہے' اس لیے ہم رنگ ہے انسان انسان سے غیر نہیں لیکن فکر اور عقیدہ الگ الگ . . . . !!

ہر آنکھ میں آنسو یکساں ہیں، ہر دل کی دھڑکن ایک ہے۔ ہر ماں کی ممتا ایک۔ ہر مسافر ایک ہی سفر پر ہے اور تمام مسافر ہم سفر ہیں۔ ہر اثاثہ راہ میں لٹے گا۔ ہر آرزو نا تمام ہے۔ ہر آغاز ایک سے انجام پر ختم ہوگا۔ رنگا رنگ جلوے، ہمہ رنگ نظارے حسن اختلاف کے دم سے ہیں اور یہ اختلاف اُس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک بے رنگ کا جلوہ نظر نہ آئے۔ بے رنگ روشنی کے سب رنگ ہیں۔ سات رنگوں کے جلوے دراصل سفید رنگ کے دلفریب روپ ہیں۔ کثرت اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتی، جب تک وحدت آشنائی نہ ہو اور وحدت اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتی جب تک کثرت شناسی نہ ہو۔ اختلاف حجاب ہے اور یہ حجاب اُس وقت اٹھتا ہے جب اختلافات پیدا فرمانے والے کا فضل شاملِ حال ہو، نہیں تو نہیں۔



السّلامُ علیکم

آج کا کالم آپ حضرات کے خطوط کے جواب میں حاضر ہے۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا مجھے کہ میں یکسر بدل سا گیا تھا۔ میں جب کسی شے کو دیکھتا، تو میری راہ میں بینائی حائل ہو جاتی۔ بولنا چاہتا تو گویائی راستہ روک لیتی کہ آخر یہ سب کیوں؟ اپنی رام کہانی دوسروں کو سنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جو میرے ساتھ بیت رہی ہے، اسے ظاہر ہی کیوں کیا جائے؟ لیکن آپ حضرات کے خطوط اور "نوائے وقت" کے بروقت تقاضے سے کچھ محسوس ہُوا کہ ایک دل کی بات ہر دل کی بات ہے۔ ایک قلب کا اضطراب سب قلوب کا اضطراب ہے۔ ایک انسان کی تلاش اور اس کا حاصل دوسرے انسانوں کی تلاش اور ان کے حاصل سے منسلک ہے۔ ہم خلاؤں میں نہیں رہتے اور اگر خلا میں بھی رہنے لگیں، تو بھی رابطہ کنٹرول ٹاور ہی سے رہے گا۔ سب انسانوں کی آنکھوں میں یکساں آنسو ہیں اور یہی ہے رشتہ انسان کا انسانوں کے ساتھ۔ انسان بہت کچھ بیان کرتا ہے اور بہت کچھ مخفی رکھنا چاہتا ہے، لیکن وہ اسے مخفی نہیں رکھ سکتا۔ دنیا میں کوئی راز ہمیشہ راز نہیں رہا۔ ہم مخفی رکھتے رکھتے خود ہی مخفی ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ گنجِ مخفی آشکار نہ ہو تو گنج کیسے کہلائے۔ بات دعویٰ کی نہیں بات احساس کی ہے اور احساس کسی مزید مشاہدے کا محتاج نہیں ہوتا۔ احساس اپنا ثبوت آپ ہے۔ جب ہم وادیٔ احساس میں قدم رکھتے ہیں تو بس اس سے نکلنا ہمارے بس میں نہیں رہتا۔ ہم احساس کو قابو کرتے ہیں اور احساس ہمیں قابو کر لیتا ہے۔ احساس شاید اپنی ہی آواز میں اپنا نوحہ بھی ہے اور اپنا قصیدہ بھی۔ اس آواز کو جتنا بند کر دیں یہ اتنی ہی سربلند ہوتی ہے۔ یہ

آواز ہی طلسم ہوشربا ہے۔ یہ آواز آہ و فغانِ نیم شب کا پیغام بھی لاتی ہے اور حرفِ رائیگاں بھی نوشت کرتی ہے۔ خاموشی میں رات کے سناٹوں میں یہ آواز شور مچاتی ہے۔ سینے کے اندر سے چلاتی ہے۔ مجھے آزاد کرو۔ مجھے بولنے دو۔ مَیں مر گئی تو تم بھی مر جاؤ گے۔ آوازیں بند ہو جائیں تو سمجھ لیجیے کہ کوئی سانحہ گزر رہا ہے۔ آواز خاموش نہیں ہو سکتی۔ آواز ہمیشہ بولے گی۔ تنہائی میں محفل میں زندگی میں زندگی کے بعد۔ آواز قائم رہتی ہے۔ زندگی ایک آواز سے شروع ہوتی ہے۔ حرفِ کُن تو ایک صدا ہے، ایک اذن ہے، ایک آواز ہے۔ اس آواز سے ہی آوازوں کا سفر شروع ہُوا اور یہ سفر لامتناہی ہے۔ آوازوں کو خاموش کرنے کی خواہش کچھ دیر کے لیے کامیاب ہو سکتی ہے لیکن پھر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ خاموشی بذاتِ خود ہی آواز بن کے رہ جاتی ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے، جب مخفی آشکار ہوتا ہے، جب خفتہ بیدار ہوتا ہے اور رازِ سربستہ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس میں کوئی اُلجھاؤ نہیں۔ سامع کا شوق ہی خاموشی کو گویائی عطا کرتا ہے۔

تو حضرات مَیں کہہ رہا تھا کہ مَیں نے خاموش ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور پھر یہ فیصلہ بھی پُورا نہ ہُوا۔ دنیا صبر کا گھونٹ بھی تو نہیں پینے دیتی۔ ہمارا آخری کالم شاید "انتظار" ہی تھا اور انتظار ہی قائم نہ رہ سکا۔ انتظار کو موت سے زیادہ شدید کہا گیا ہے، اس لیے کہ انتظار اور موت دونوں ہی فراق کو خاموش کر دیتے ہیں لیکن انتظار خاموش نہیں رہنے دیتا۔ انتظارِ وصال کی آرزو میں فراق سے گذرنے کا تجربہ ہے اور یہ تجربہ اشکوں سے تحریر ہوتا ہے۔

مَیں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ ہم سب انتظار میں ہیں۔ اپنی محنتوں کے معاوضے اور اپنے اعمال کی عبرتیں حاصل کرنے کے لیے ہم منتظر ہیں۔ خدا وہ وقت نہ لائے کہ معاوضے عبرتیں بن جائیں۔ وقت بدلا ہوا ہے۔ زمانے کا رنگ بدل گیا ہے۔ رگوں میں خون کی گردش کی رفتار بدلی ہوئی ہے۔ مزاجِ فلک برہم ہے۔ صاحبانِ بصیرت غور کیوں نہیں کر رہے کہ جس دَور میں خواجگی بندہ پروری سے الگ ہو جائے، وہ دَور بدنصیب کہلاتا ہے۔ اس امانت خانے سے حاصل کی ہوئی ہر چیز ہمیں چھوڑ کر رخصت ہونا ہے اور ہم ایسا نہیں چاہتے۔ ہم بحیثیت قوم

ایک ایسے مسافر کی طرح ہیں، جس کا اثاثہ اس کے سفر میں رکاوٹ ہے۔ وہ اثاثہ نہیں چھوڑتا اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سفر کا عزم اس سے چھن جاتا ہے۔ مسافر سفر نہ کرے۔ تو منزل سے محرومی ہی اس کا نصیب بن کے رہ جاتی ہے۔

غالباً ہم سب مجبور ہیں اور اسی مجبوری میں ہی ہم اپنی اپنی منزل کی طرف گامزن ہیں۔ غلام کو غلامی پسند نہ ہو۔ تو کوئی آقا پیدا نہیں ہو سکتا۔ غلامی خود آقا پرور ہے، آقا ساز ہے۔ نیازمندی ہی بے نیازی کا ثبوت ہے۔ ہم خود ہی کسی کو بلندی بخشتے ہیں اور پھر اس سے اس بلندی کا فیض مانگتے ہیں۔ ہم خود ہی اپنے لیے عذاب ہیں اور خود ہی اپنے لیے ثواب۔ ہم خود ہی راہی ہیں، خود ہی رستہ۔ خود ہی مسافر، خود ہی ہمسفر، خود ہی منزل اور خود ہی محرومیٔ منزل۔ ہماری لب بندی سے گویائی پیدا ہوتی ہے اور گویائی سے لب بندی بلکہ نظر بندی پیدا ہوتی ہے۔

تو عزیزانِ محترم! میں کہہ رہا ہوں کہ آواز زندگی ہے۔ اگر شکلیں مسخ ہو جائیں تو بھی ہم ایک دوسرے کو آواز ہی سے پہچانیں گے۔ آوازوں کے سمندر میں انسان کی گویائی ڈوب جاتی ہے اور ڈوبتے ڈوبتے ہی ایک نئی آواز افق سے گونجتی ہے۔ آواز کا طلسم سب سے بڑا طلسم ہے۔ عین ممکن ہے کہ آوازوں کا شور ہو اور زندگی کا نشان باقی نہ ہو۔ مشینیں انسانوں کی آوازیں پیش کر رہی ہوں اور انسان مشینوں کی دُنیا سے نکل چکا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہر طرف بظاہر سناٹا ہو اور اس میں آوازیں گونج رہی ہوں۔ رات کے ہولناک سناٹوں میں انسان کا ماضی گونجتا ہے، مستقبل بولتا ہے۔ انسان ایسے پیغامات سنتا ہے جو نہ سنائی دینے والے ہوں اور وہ اجسام دیکھتا ہے جو نہ دکھائی دینے والے ہوں۔ دُور کی آواز پاس سے سنائی دیتی ہے اور پاس ہی سے آنے والے خراٹوں کی آواز آہستہ آہستہ خاموش ہو جاتی ہے۔ انسان جب اپنے ہونے کا اور کوئی ثبوت نہ پیش کر سکے تو وہ صرف شور مچاتا ہے، بولتا ہے ـــــ معنی و الفاظ کے رشتوں سے بے نیاز۔

آواز کی تاثیر مسلم ہے۔ ایک آواز اطاعت پیدا کرتی ہے اور ایک بغاوت۔ ایک آواز خوف پیدا کرتی ہے اور ایک آواز شوق۔ آواز انسان کو محبوب بناتی ہے اور آواز ہی سے انسان ناپسند ہو جاتا ہے۔ آواز بڑی پُرتاثیر ہوتی ہے۔ کسی کے منہ سے نکلی ہوئی آہ آسمانوں کو چیر جاتی ہے اور کسی کی فریاد بے حسی کے کانوں سے ٹکرا کر شرمسار ہو جاتی ہے۔ دلربا کی آواز ہی سرِّ دلبری ہے۔ کرخت آوازیں دوزخ کے نگرانوں کی ہوتی ہیں۔ جنت کے مکین شیریں سخن ہوتے ہیں۔ آوازیں پیدا کرنے والے نے آوازوں کی رینج (RANGE) مقرر کر دی ہے۔ سب سے بُری آواز گدھے کی ہے اور سب سے پیاری آواز سب سے پیارے انسان کی ہے۔ اللہ کو یہ آواز اتنی پیاری ہے کہ اس نے حکم دے رکھا ہے کہ خبردار! کوئی آواز اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند نہ ہو۔ ورنہ سب اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ آپؐ کی آواز کے مقابل دنیا کی ہر آواز کا قد پست ہے۔ یہی راز ہے، یہی اُس پیغام کی ندرت ہے جو آپ کی آواز نے عطا فرمایا۔ اب آپؐ کی آواز ہی گرتے ہُوئے انسان کو سنبھالا دیتی ہے۔ آپؐ کی آواز ہی ایک روشن مستقبل کی طرف نشاندہی کرتی ہے۔ آپؐ کی آواز قلوب کو منور کرتی ہے۔ آپؐ کی آواز زمین اور آسمانوں میں سب سے زیادہ مقبول آواز ہے۔ آپؐ کی آواز پر چلنے والے مسافروں کی خدمت میں السلام علیکم۔



حب تک توبہ کا دروازہ بند نہ ہو کسی آدمی کو بُرا نہ کہو!



چھوٹے آدمی کو چھوٹا نہ سمجھو، بڑا آدمی بڑا نہ رہے گا!

رزق

مخلوق کے خالق کا دعویٰ ہے کہ وہ زمین پر چلنے والے ہر جاندار کے رزق کا کفیل ہے۔ اس میں سب مخلوق شامل ہے۔ انسان، حیوان، کیڑے مکوڑے، مرغ و ماہی غرضیکہ ہر ذی جان اور ذی روح، بغیر کسی استثنا کے۔

رزق صرف یہی نہیں کہ جیب میں مال ہو، بلکہ ہماری ہر صفت رزق ہے اور ہماری ہر استعداد رزق ہے۔ بینائی رزق ہے، گویائی رزق ہے، خیال رزق ہے، احساس رزق ہے، سماعت رزق ہے، وجُود کی طاقت اور لطافت رزق ہے، غم رزق ہے، خوشی رزق ہے، علم رزق ہے، محبت رزق ہے، حُسن رزق ہے۔ ذوقِ جمال رزق ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایمان بھی رزق ہے۔

اس ہمہ رنگ رزق کے نزول اور حصول کے عمل پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خالق کا دعویٰ کسی اور دلیل کا محتاج نہیں۔ وہ ایسا رازق ہے کہ بچّے کے پیدا ہونے سے پہلے اِس کے رزق کا انتظام کر چکا ہوتا ہے۔

آسمانوں سے مصفّا اور مطہّر پانی کی بارش کرنے والا خالق رزق کی ترسیل کے وسیع سلسلے رکھتا ہے۔ انسان سمجھ نہیں سکتا۔ آج کا انسان جھگڑالو ہو گیا ہے۔ وہ تسلیم سے حاصل ہونے والی تعلیم سے محروم ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ رزق کے وسیع و عظیم پھیلاؤ کو دیکھتا تو ہے، سمجھتا نہیں۔

بارش کے ساتھ رزق کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ بارش کو ہی رزق کہہ دیا جاتا ہے۔ بارش

کے ہونے سے ہی رزق کے چشمے بلکہ سرچشمے جاری ہو جاتے ہیں۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں اُگنے والے ایک معمولی درخت کو دیکھیں، رزق سے بھرپور ہے۔ اس کی شاخیں پرندوں کا رین بسیرا ہیں۔ اس کا سایہ جانداروں کی پناہ گاہ ہے۔ لکڑی، طویل سلسلہ ہے رزق کا۔ جلانے والی ہو تب بھی لکڑی رزق ہے۔ عمارتی لکڑی تو سُبحان اللہ۔ رزق ہی رزق ہے۔ فرنشنگ ہاؤس شوروم، فرنیچر، گاڑیاں رزق کمانے والوں اور رزق کھانے والوں کے لیے نعمت ہے۔ درخت کی لکڑی نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے۔ درخت بارش کی عطا ہے۔ بارش خالق کا عمل ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ رزق آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ دلیل یہ کہ بارش میں صفتِ رزّاقی ہے۔

زمین سے اُگنے والے اناج کو بارش سے جو تعلق ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ جاندار زمین سے اُگنے والی اجناس پر پلتے ہیں۔ مویشیوں ہی کو لیجیے۔ تازہ دودھ کی نہریں ہیں۔ تازہ گوشت کا نہ ختم ہونے والا اسٹور، صحت مند گوشت، جس پر انسانی صحت کا دار و مدار ہے۔ مویشیوں کی کھالیں کیا کیا رزق مہیا کرتی ہیں، کسی ٹینری سے معلوم کریں۔ مویشیوں سے لباس، جوتے، باربرداری اور نہ جانے کیا کیا کچھ حاصل ہوتا ہے۔ ان کی رزاقانہ افادیت پر مکمل تبصرہ خارج از امکان ہے۔

جانور جانوروں کا رزق ہیں، انسانوں کا رزق ہیں، یہاں تک کہ مرا ہُوا جانور بھی گِدھ کا رزق ہے۔ گِدھ مُردار پر پلتا ہے، شاہین زندہ شکار سے اپنی زندگی برقرار رکھتا ہے۔ پروردگار کے کام ہیں، شاہین اور شیر کی خوراک کو زندگی دے کر محفوظ کر دیا گیا ہے۔

اگر آسمانوں سے مینہ نہ برسے، تو رزق کی داستان ختم سی ہو کر رہ جائے۔ سائنس کی ترقی کے باوجود رزق کا نظامِ معیشت و معاشیات تقسیمِ دولت کا سارا نظام بارش کے ختم ہونے سے ختم ہو جائے گا۔ بارش کے دم سے سُوتی اور اُونی کپڑے کی ملیں چل رہی ہیں۔ بارش نہ ہو تو نہ اون نہ کپاس، نہ خوراک نہ لباس۔

بارش کی کمی سے بجلی کا نظام بحران کا شکار ہوتے دیکھا گیا ہے۔ رزق کی تقسیم و ترسیل

کا نظام آسمان سے برسنے والے پانی پر ہے۔ پانی کی کمی سے قحط سالی اپنے ظالم جبڑوں میں انسان کو دبوچ لیتی ہے۔ یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ بارش منشائے الٰہی ہے اور یہ عطائے رحمانی بغیر کسی معاوضے کے ہے۔

انسانی آنکھ کو قدرت نے بینائی کا رزق عطا کیا اور اس بینا آنکھ کے لیے نظاروں کے خزانے موجود ہیں۔ کائنات کے منوّر مناظر انسان کی ضیافتِ نگاہ کا سامان ہیں۔ کہساروں سے ریگزاروں تک نظر کا رزق نظاروں کے حُسن میں پھیلا دیا گیا ہے۔ یہ سب بغیر معاوضے کے ہے۔

ایسے محسوس ہوتا ہے کہ مشرق سے طلوع ہونے والا سُورج رزق کے خزانے بکھیرتا ہُوا مغرب میں غروب ہوتا ہے اور پھر رات ایک الگ قسم کا رزق راحتِ جاں کے لیے تقسیم کرتی ہے۔ پُرسکون نیند ایک عظیم دولت ہے، مفت ملتی ہے، اس پر کروڑوں رُوپے نثار۔ سُورج پھلوں کو رس عطا کرتا ہے، چاند مٹھاس بخشتا ہے، ستارے صاحبانِ فکر کو دولتِ افکار سے مالا مال کرتے ہیں۔ غرضیکہ اس کائنات کا ہر موسم اور ہر لمحہ کسی نہ کسی انداز سے رزق تقسیم کرتا ہی رہتا ہے۔

انسان کا رزق اُس کے اپنے وجود کے کسی حصے میں پنہاں ہوتا ہے۔ اس صلاحیت کو دریافت کرنا ہی انسان کا فرض ہے۔ اس کے بعد حصولِ رزق کا مسئلہ ختم ہو جاتا ہے۔

کچھ لوگوں کا رزق ان کے ذہن میں ہوتا ہے۔ ان کی ذہنی صلاحیت رزق بنتی ہی چلی جاتی ہے۔ یہ صاحبانِ فکر و فراست اپنی اور دوسروں کی معیشت کو استوار کرتے ہیں۔ دنیا کو علم و ادب سے نوازتے ہیں اور رزق ان کے ذہن کو سلام کرنے کے لیے حاضر رہتا ہے۔

کچھ انسانوں کا رزق ان کے گلے میں ہوتا ہے۔ سریلا، رسیلا نغمہ یوں بھی رزق ہے، اور یوں بھی گلوکار کا گلا سونے کی کان سے کیا کم ہوگا۔ اس نغمگی سے کتنے اداروں اور کتنے افراد کا رزق وابستہ ہے۔ صاحبِ آواز کے ساتھ صاحبِ ساز کو بھی نواز دیا جاتا ہے۔

مزدوروں اور ورکروں کا رزق ان کے بازوؤں میں ہے۔ جسمانی طاقت جو قدرت کی عطا ہے ذریعہ رزق بھی ہے۔ ہاتھ چلتے ہیں اور پیٹ پلتے ہیں۔ کاسب کا رزق کسب میں ہے۔ کاسب امیر ہو یا غریب، وہ اللہ کا دوست ہے۔

کچھ ممالک میں جنسیات بھی معاشیات کا ایک حصہ ہے۔ گمراہی ہے لیکن رزق سے وابستہ ہے۔ گناہ تو ہے، لیکن رزق کا ذریعہ ہے۔

اس مقام پر مذہب انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ مذہب بتاتا ہے کہ حلال کیا ہے حرام کیا ہے۔ جائز کیا ہے ناجائز کیا ہے۔ ثواب کیا ہے، عذاب کیا ہے۔ کرم کیا ہے ستم کیا ہے۔ مذہب غور کرنے کی دعوت دیتا ہے کہ آخر رزق کی ضرورت کیا ہے۔ زندگی گزارنے کے لیے رزق چاہیے۔

ماں کی گود سے قبر تک کا سفر ہے۔ کتنا زادِ راہ چاہیے؟

ہم مال بڑھاتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ زندگی کم ہوتی جا رہی ہے۔ سانس کی آری ہستی کا شجر کاٹ رہی ہے۔ زندگی برف کی سل کی طرح گھلتی ہی چلی جا رہی ہے۔ یہ پونجی گھٹتی جا رہی ہے۔ دولت موت سے نہیں بچا سکتی۔

سانس بند ہو جائے تو رزق کی تمام افادیت ہمارے لیے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے۔ جائز ضروریات کو ناجائز کمائی سے پورا کرنا حماقت بھی ہے اور گناہ بھی۔ رشوت کے مال پر پلنے والی اولاد لازمی طور پر باغی ہوگی، بے ادب ہوگی، گستاخ ہوگی۔ دوہرا عذاب ہے۔ عاقبت بھی برباد اور اولاد بھی برباد۔

"تکاثرِ زر" نے انسان کو اتنا غافل اور اندھا بنا دیا ہے کہ اُس کی آنکھ بند ہونے سے پہلے کھُل ہی نہیں سکتی۔ انسان دولت کے حصُول کی خواہش میں پاگل سا ہو گیا ہے۔ دولت زندگی کے لیے ہے، لیکن آج کی زندگی صرف دولت کے لیے ہے۔

سوچنا چاہیے کہ صرف پیسہ ہی رزق نہیں۔ ایک قسم کا رزق حاصل کرنے کے لیے دُسری

قسم کا رزق ضائع کرنا کم عقلی ہے۔ دین کو دے کر دولتِ دنیا حاصل کی۔ تو بھی کس کام کی؟

وطن چھوڑ کر پیسہ لیا تو کیا لیا؟ جہنّم میں لے جانے والی دولت سے وہ غریبی بہتر ہے جو جنّت کی راہ دکھائے۔

خیر و شر کا شعور نہ ہو، تو امیر غریب کی بحث عبث ہے۔ کائنات میں دولت کی یکساں تقسیم کی خواہش ایک ایسا خواب ہے، جو اُس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک کوّے اور مور کو ایک جیسے پر نہیں ملتے یا شیر اور گیدڑ کو ایک جیسا مزاج نہیں ملتا۔

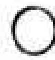
اچھا امیر بہت اچھّا ہوتا ہے، بُرا غریب بہت بُرا۔ اچھّا امیر وہ ہے جو اپنے مال سے اپنے محروم بھائی کی خدمت کرے۔ بُرا غریب وہ ہے جو دوسرے کے مال کو باطل طریقے سے حاصل کرنا چاہے یعنی چوری، ڈاکہ، رشوت کے ذریعہ سے۔

آزادیٔ پرواز رزق ہے۔ سونے کا قفس ملے۔ تو بھی قبول نہ کرنا چاہیے۔

یہ زندگی محدود ایّام کے لیے ہے۔ پاکیزہ رزق کی تلاش کرنی چاہیے، بلکہ اس کا انتظار کرنا چاہیے۔ ہمارا رزق ہمیں ضرور ملے گا جیسے ہمیں ہماری زندگی ملی ہے، بینائی ملی ہے، گویائی ملی ہے اور جیسے ایک دن ہمیں موت سے ملنا ہے۔

جو ہماری جان کا محافظ ہے، وہی ہمارے رزق کا ضامن ہے۔ رزق دینا رازق کا عمل ہے۔ یہ اس کا دعویٰ ہے جس نے سورج، چاند ستاروں کو نورانی رزق عطا کیا ہے، جس نے پہاڑوں کو استقامت دی ہے، دریا کو روانی دی ہے، گُلوں میں رنگ بھرے ہیں، مومنوں کو خوئے انقلاب عطا کی ہے۔ بیج کو مٹّی کی تاریکی میں پالنے والا انسان کو کیوں نہ پالے گا؟

صبر و استقامت کا مقام ہے۔ اپنی غریبی کی توہین نہ کرنی چاہیے۔ اپنے مال کو عذاب نہ بنایا جائے۔ حق والے کو حق دے دیا جائے اور اپنی عاقبت کی فکر کی جائے۔ عاقبت، آنے والا لمحہ ہو سکتا ہے۔



پیلُو پکیاں

بہار کا موسم، پیار کا موسم، گم شدہ چہروں کے دیدار کا موسم، تھل، بیلے، بار کا موسم، پیلُو پکنے کا موسم دراصل وصالِ یار کا موسم بڑے انتظار کے بعد آتا ہے۔ خواجہ غلام فریدؒ نے پیلو کو تکمیلِ عرفان بنا دیا۔

عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک کا فاصلہ بس "پیلو پکنے" کی دیر تک ہے۔ پیلو چُننے سے ابتدا ہے۔ سب سنگی ساتھی مِل کر چنتے ہیں، پیار کی امرتیاں' محبت کے پیلو ـــــ پیلو چنتے چنتے آنکھیں ملتی ہیں' دل ملتے ہیں اور پھر جدائی کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے ـــــ پیلو ختم ہو جاتی ہیں اور انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ چہروں کی سرخیاں رخصت ہو جاتی ہیں اور انسان "ہکّا بکّا" رہنے لگتا ہے۔ پھر کب آئے پیلو کا موسم' اور یار مِل کے پیلو چنیں۔

"آچھنوں رَل یار پیلو پکیاں نی وے"

(پیلو پک گئے، آؤ یار مل کر چُنیں)

محبت سے آشنا، محبت کی رُوح سے آشنا، محبّت کی تاثیر سے آشنا، محبت کے کرشموں سے آشنا، محبت کے اعجاز سے آشنا لوگ ہر موسم اور ہر رُت میں پیار کی بہار ڈھونڈھ لیتے ہیں۔ وہ ہر مجاز میں حقیقت تلاش کر لیتے ہیں ـــــ ہر شے میں جلوہ تلاش کر لیتے ہیں، ہر وجُود میں محبوبِ حقیقی کو موجود پاتے ہیں ـــــ وہ آشنائے راز ہوتے ہیں اور راز آشنا کرنا جانتے ہیں۔

اہلِ تصوّف حضرات نے اپنے کلام میں بڑے بڑے عُقدے کُشا کیے ہیں۔ اُن کے

سامنے کوئی معمولی نظارہ بھی معمولی نہیں۔ ہر شے ہی غیر معمولی ہے۔ پھول کھلے، تو وہ غور کرتے ہیں کہ پھول کی ہستی کیا ہستی ہے۔ عجیب راز ہے۔ پھول کھلتا ہے مرجھا جاتا ہے۔ چند لمحات کے لیے وہ مسکرایا اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نامعلوم دنیا میں چلا گیا ـــــ بس انسان کی زندگی پھول کی مسکراہٹ سی ہے۔ ادھر آئے اُدھر گئے ـــــ پھول اپنی زندگی پر کیا اترائے گا، کیا فخر کرے گا ؎

گوڑھی رنگت دیکھ کر پھول گمان بھئے
کتنے باغ جہان میں لگ لگ سوکھ گئے

اہل باطن دراصل ظاہر کی اصل کو پہچانتے ہیں ـــــ ظاہر کی حقیقت معلوم کرنے والا اہل باطن ہے ـــــ باطن کوئی نئی دنیا نہیں۔ اسی دنیا کا نیا شعور ہے ـــــ ماسوا میں ہی ماورا کے جلوے ہیں۔ باطن شناس انسانی منشا میں خدائی منشا کو پہچانتا ہے ـــــ "پیلو چھوٹا" بہت چھوٹا جنگلی پھل سمجھ لیں ـــــ پیلو کا کھانا اتنا پُرلطف نہیں جتنا پیلو چننا۔

پیلو چنتے چنتے انسان اپنا مقدر چنتا ہے اور پھر ـــــ "ہکا بکا" رہ رہ جاتا ہے کہ اس نے کیا چاہا اور اسے کیا مل گیا ـــــ پیلو چنتے ہی یار آشنا ہو گیا ـــــ اور محبت سے شناسائی ہوئی ـــــ محبت فراق سے گزری ـــــ پیلو چننے والی سنگتیں جدا ہو جاتی ہیں ـــــ اور فراق تھل "سنجا" نظر آتا ہے ـــــ طالب وہیں رو رہی بیلے میں روتا رہتا ہے اور محبوب پیلو کی رُت کے ساتھ ہی غائب ہو جاتا ہے۔ جلوہ رخصت ہوا، لیکن خیرہ آنکھ حیرت کے تھل میں گم ہو گئی ـــــ اس نے کیا دیکھ لیا کہ پھر کچھ دیکھنے کی آرزو ہی نہ رہی ـــــ اس نے کیا سن لیا کہ اب کچھ اور سننے کی تاب ہی نہ رہی۔ وصال آشنا فراق کے دشتِ بے اماں میں گم ہو جاتا ہے۔

اور پھر رُت بدلتی ہے، موسم آتے ہیں، پیلو پکتی ہیں اور اب پیلو کچھ اور ہیں، بہار کچھ اور ہے، وصال کچھ اور ہے، یار کچھ اور ہے، جلوہ کچھ اور ہے ـــــ اب وہ وصال ہے جس

کا فراق نہیں۔ وہ حاصل ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ فرید کہہ اُٹھتا ہے کہ دنیا جس کو تلاش کرتی ہے وہ تو فرید کے پاس ہے۔ ہر دم، ہر آن، ہر رنگ، ہر انداز ـــــ مجاز حقیقت بن چکا ہوتا ہے۔ اب تھل جل تھل ہو جاتا ہے۔

صوفیا نے اپنے شعر کو عرفان رنگ بنا کر اُس سے وہ کام لیا، جو بڑے بڑے ملا تقریروں سے نہ لے سکے۔ نعت کے چند اشعار انسان میں عشق نبیؐ کے جلوے پیدا کر سکتے ہیں، صوفیا نے قلوب کو گرمایا، جلوہ آشنا کیا، اور بندوں کو حق کے تقرب سے آشنا کر دیا۔

اللہ بے مثل و بے مثال ہے۔ اسے کسی شے سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی ـــــ بجا ہے درست ہے، لیکن طالبانِ حق کو جب یہ سنایا جاتے کہ ؎

الف اللہ چنبے دی بُوٹی مُرشد مَن وِچ لائی ہُو

یعنی اللہ ایک خوشبو دار چنبے کی بُوٹی ہے اور مُرشد ہی مرید کے دل میں عشقِ الٰہی کا خوشبودار پودا لگاتا ہے ـــــ بات سمجھ میں آتی ہے کہ توحید صرف علم ہی نہیں اس علم کا کوئی عمل بھی ہے پیار کی فصلیں، پیار کی پیلو پکتے پکتے طالب کو واصل کر دیتی ہیں ـــــ عجب حال ہے۔ اسی دُنیا اور دنیا کی انہی رونقوں اور جلوؤں سے جلوۂ حق دریافت کرنا ہوتا ہے ـــــ چمگادڑوں کو جلوۂ آفتاب کبھی نظر ہی نہیں آیا ـــــ اس میں روشنی کا کیا قصور۔ تن کی دنیا میں ہی من کی دنیا آباد ہے۔ اگر یہ نہیں تو وہ بھی نہیں۔ آنکھ نہ ہو تو جلوہ کیسا۔ ذہن نہ ہو تو خیال آرائی کیسی۔ دل نہ ہو تو دلبر ہی کیا۔ لذتِ جبیں سائی نہ ہو تو سنگِ دربار کا کیا قصور۔ ذوقِ بندگی نہ ہو تو بندہ نوازی کا لطف کون حاصل کرے گا ـــــ لینے والا ہی نہ ہو تو دینے والا کیا کرے ـــــ پتھر دل پریت کو کیا جانے ـــــ ہوسِ زر پرستی حق پرستی کیسے بنے ـــــ جس دل میں نفرت اور کینے کے پھوڑے پک رہے ہوں، وہ کیا جانے کہ پیلو پکنے کا کیا مفہوم ہے ـــــ پیلو چنتے چنتے حیرت کے جلوے میں انسان ہکا بکا کب ہو جاتا ہے۔ جلوۂ محبوب جا بجا دیکھنے والے اور ہوتے ہیں ـــــ وہ دل اور ہیں۔ وہ نگاہیں اور ہیں

وہ روحیں اور ہیں اور بہت ہی اور ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس دنیا میں سب اسی کے رنگ ہیں۔

جانِ من باکمال رعنائی ؎
خود تماشا و خود تماشائی

وہ جانتے ہیں کہ حسن کے جلوے موجود ہیں ـــــ یہ سب جلوے کسی اور کے ہیں ـــــ یہ سب نیرنگ کسی ذات کے ہیں ـــــ پہاڑوں سے نکلنے والے دریا خود سمندر کے لیے پیاسے ہوتے ہیں اور یہ کناروں کی پیاس بجھاتے ہوئے اپنے محبوب ساگر سے واصل ہوکر اپنی پیاس بجھاتے ہیں ـــــ یہ سب پریم نگر ہے۔ محبت نہ ہو۔ تو چاند چاند نہ رہے اور چکور چکور نہ رہے ـــــ تعلق سے دنیا قائم ہے۔

یہ نظام صرف معاشیات اور ارتقا کا نظام ہی نہیں، بلکہ یہ حسن و جمال کی دنیا ہے ، یہ حسنِ خیال کی دنیا ہے، یہ جلوۂ لازوال کی دنیا ہے ـــــ اس میں محبت کی پیلو ہیں ـــــ پیلو چننے کے موسم ہیں۔ چننے والی "سنگتیں" ہیں اور محبت کے جلوے ہیں ـــــ ارتقاء محبت ہے ـــــ اور عرفان و ایقان کی منازل ہیں ـــــ یار یار کے قریب آئے بیلے پر بہار آئے ـــــ اور پھر فراق زدہ دل کو قرار آئے ـــــ خواجہ غلام فریدؒ سچ کہتے ہیں ؎

آیاں پیلوں چُنن دے سانگے
اوڑک تھیاں فریدن وانگے
چھوڑ آرام قرار ـــــ ہکیاں بکیاں نی وے
آچنوں رُل یار ـــــ پیلو پکیاں نی وے

یعنی سب سنگتیں سب سہیلیاں پیلو چننے کے بہانے اکٹھی ہوئیں ـــــ اوّل اوّل تو شوقِ ملاقات تھا اور انجام کار سب فریدن جیسی ہوگئیں ـــــ یعنی آرام قرار سے بیگانہ ـــــ ہکّا بکّا ـــــ حیرت زدہ ـــــ ہوش سے دست بردار۔ بس یہ سب پیلو کا کرشمہ ہے: آرزو اور محبت اور وصالِ یار کے جلوے ہیں کہ ان کی منزل فراق اور وصال سے بہت آگے ہے

ـــــ حیرت ہی حیرت، تحیّر ہی تحیّر۔ معمولی سی بات، کتنا غیر معمولی نتیجہ ـــــ ایک خوشی کا میلہ اور آخر کار حقیقت آشنا فرید، صرف اکیلا ـــــ حیران و سرگرداں، روہی کا تنہا مسافر، قدم قدم پر رونے والا جلوے کے تقرب میں خود سے بھی دُور جا پہنچا ـــــ ایسی منزل جس میں پیلو پکتی ہیں، بہاریں آتی ہیں، سنگتیں آتی ہیں لیکن دل میں دشت کی وسعت اور صحرا کی پیاس ہے ـــــ کوئی یار ہو کہ جس کے ہمراہ پیلو چُنی جائیں ـــــ کوئی ہمراز ہو جس سے درد بیان کیا جائے۔ کوئی درد شناس ہو جس سے دل کی بات کہی جائے ـــــ

فرید نے پیلو کیا چنیں، درد چُن لیا۔ ایسا درد جس کا مداوا بھی وہ خود ہی ہے۔ ایسا سفر جس کا انجام بھی سفر ہے، جس کی منزل ایک نئی مسافرت ہے۔ ایسا راز کہ بیان بھی ہو اور فاش بھی نہ ہو۔ ایسا یار ملا کہ شاہ رگ سے قریب ہو اور نگاہوں سے اوجھل ہو۔ یہ انعام ہے کہ سزا، جو کچھ بھی ہے، لطف ہے۔ اس کا الطاف ہے، جو درد بن کے ساتھ رہتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے لیکن نظر نہیں آتا ـــــ جو جلوہ بن کر دل سے گزرتا ہے اور آنسو بن کر آنکھ سے ٹپکتا ہے۔

پیلو پک گئے اور عرفان کی منزل طے ہوگئی ـــــ فرید درد مزید مانگتا ہے اور پیلو چنتا رہتا ہے ـــــ عجب رنگ سے نیرنگ نے بے رنگ کی راہ دکھائی ـــــ بہار ہی بہار، ہر طرف یار ہی یار، ہمہ وقت دیدار ہی دیدار ـــــ ہکا بکا فرید جنگل، روہی، بیلے میں اکیلے سفر پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رواں دواں "تہر جا عین ظہور" کے جلوؤں سے مسحور اس کی یاد میں گم جو پیلو کے موسم میں ملا اور ہر موسم کو پیلو کا موسم بنا گیا ـــــ فرید کی خزاں سدا بہار ہے۔ اس پر مخفی راز آشکار ہے۔ جتنا آشکار ہے، اتنا ہی پُر اسرار ہے ـــــ کوئی فرید کا یار ہو، تو جانے کہ فرید نے "پیلو" کے موسم میں کیا کیا دیکھا ـــــ کیا کھویا کیا پایا ـــــ سب کچھ نثار کیا اور سب کچھ پا لیا۔ فرید نے اپنی ذات نثار کی اور حسن کی ذات کا عرفان پایا ـــــ پیلو کی رُت فرید کی عید ہے !!



صبر

انسان کو اُس بات پر صبر کرنے کے لیے کہا گیا ہے جو اسے پسند نہ ہو اور جس کا ہو جانا ناگزیر ہو۔ ہر وہ عمل جو برداشت کرنا پڑے، صبر کے ذیل میں آتا ہے۔ ناقابلِ برداشت کوئی واقعہ نہیں ہے جس کو دیکھنے والے اور پڑھنے والے ناقابلِ برداشت کہتے ہیں۔ سانحہ ہو یا حادثہ، جس کے ساتھ پیش آ رہا ہے وہ تو اس میں سے گزر رہا ہے، رو کر یا خاموش رہ کر۔

انسان کو صبر کی تلقین کی گئی ہے، اس لیے کہ یہ زندگی ہماری خواہشات کے مطابق نہیں ہوتی۔ جہاں ہماری پسند کی چیز ہمیں میسر نہ آئے، وہاں صبر کام آتا ہے۔ جہاں ہمیں ناپسند واقعات اور افراد کے ساتھ گزر کرنا پڑے، وہاں بھی صبر کام آتا ہے۔

صبر کا نام آتے ہی اذیت کا تصور آتا ہے۔ ناپسندیدہ زندگی قبول کرنے کی اذیت یا پسندیدہ زندگی ترک کرنے کی اذیت۔ یہ اذیت احساس کی لطافت کی نسبت سے بڑھتی اور کم ہوتی رہتی ہے۔

کوئی زندگی ایسی نہیں جو اپنی آرزو اور اپنے حاصل میں مکمل ہو، برابر ہو۔ کبھی آرزو بڑھ جاتی ہے، کبھی حاصل کم رہ جاتا ہے۔ صبر کا خیال ہی اس بات کی دلیل ہے کہ انسان جو چاہتا ہے وہ اسے ملا نہیں۔

انسان محنت کرتا ہے، کوشش کرتا ہے، مجاہدہ کرتا ہے، ریاضت اور عبادت کرتا ہے کہ زندگی اطمینان اور آرام سے گذرے اور مابعد حیات کے بھی خطرات نہ رہیں، لیکن زندگی عجیب ہے۔ اس میں جب کوئی مقام حاصل ہوتا ہے، پسندیدہ مقام، تب بھی ہمیں احساس ہوتا ہے کہ کہیں نہ کہیں

کچھ نہ کچھ رہ گیا ہے یا کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ غیر ضروری اور غیر مناسب شے شامل ہو گئی ہے' اس زندگی میں۔ بس ایسی صورت میں انسان بے بس ہوتا ہے۔ صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

انسان شادی کرتا ہے۔ شادی کا معنی خوشی ہے، لیکن کچھ ہی عرصہ بعد انسان محسوس کرتا ہے کہ شادی کا عمل فرائض اور ذمہ داریوں کی داستان ہے۔ حقوق کا قصہ ہے۔ صرف خوشی کی بات نہیں۔ اس میں رنج اور رنجشیں بھی شامل ہیں۔ دو انسان' زوجین' مل کر سفر کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے باعثِ مسرت ہونے کے وعدے اور دعوے لے کر ہم سفر بنتے ہیں اور کچھ ہی عرصہ بعد ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے عمل سے گذرتے ہیں۔ خوش رہنے کا تصور ختم ہو جاتا ہے صبر کرنا پڑتا ہے۔ اب یہ فیصلہ تبدیل نہیں ہو سکتا۔ اولاد ہونے کے بعد انسان کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک خوبصورت رسّی سے جکڑا گیا ہے۔ اس کی آزادی اور آزاد خیالی ختم ہو گئی ہے۔ اس پر عجیب و غریب فرائض عائد ہو گئے ہیں۔ وہ محبت کے نام پر مصیبت میں گرفتار ہو گیا' لیکن اب صرف صبر ہے۔ یہی تلقین ہے کہ ہو جانے والے واقعات پر افسوس نہ کرو، صبر کرو۔

صبر کا مقام اُس وقت آتا ہے' جب انسان کو یہ یقین آ جائے کہ اس کی زندگی میں اس کے عمل اور اس کے ارادے کے ساتھ ساتھ کسی اور کا عمل کسی اور کا ارادہ بھی شامل ہے۔ اپنے حال میں دوسرے کا حال شامل دیکھ کر انسان گھبراتا ہے اور جب اسے ایک اور حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ اس کے ارادوں اور اس کے عمل میں اس کے خالق و مالک کا امر شامل ہے' اور کبھی کبھی یہ امر ایک مشکل مقام سے گذرنے کا امر ہے' تو انسان سوچتا ہے کہ اگر بات اپنی ذات تک ہو تو بدل بھی سکتی ہے' لیکن اگر فیصلے امرِ مطلق کے تابع ہیں' تو ٹل نہیں سکتے۔ یہاں سے انسان اپنی بے بسی کی پہچان شروع کرتا ہے۔ بے بسی کے آغاز سے صبر کا آغاز ہوتا ہے۔

خوشی میں غم کا دخل، صحت میں بیماری کا آ جانا، بنے ہوئے پروگرام کا معطل ہونا، کسی اور انسان کے کسی عمل سے ہماری پُرسکون زندگی میں پریشانی کا امکان پیدا ہونا، سب صبر کے مقامات ہیں۔

تکلیف ہمارے اعمال سے آئے یا اس کے حکم سے' مقامِ صبر ہے، کیونکہ تکلیف ایک اذیت ناک

کیفیت کا نام ہے۔ تکلیف جسم کی ہو، بیماری کی شکل میں' یا روح کی تکلیف' احساسِ مصیبت یا احساسِ تنہائی یا احساسِ محرومی کی شکل میں' مقامِ صبر ہے۔ انسان جس حالت سے نکلنا چاہے اور نکل نہ سکے، وہاں صبر کرتا ہے۔ جہاں انسان کا علم ساتھ نہ دے' اس کی عقل ساتھ نہ دے اور اس کا عمل اس کی مدد نہ کر سکے' وہاں مجبوری کا احساس اسے صبر کے دامن کا آسرا تلاش کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

صبر کا تصور دراصل صرف مجبوری ہی کا احساس نہیں ہے۔ صبر کے نام کے ساتھ ہی ایک اور ذات کا تصور واضح طور پر سامنے آتا ہے کہ ہم اپنی زندگی میں سب کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم اپنی زندگی کے مالک ہو کر بھی مکمل مالک نہیں۔ ہم مختار ہو کر بھی مختار نہیں۔ ہم قدرت رکھنے کے باوجود قادر نہیں۔ ہم اور ہماری زندگی ہزارہا اور زندگیوں کے دائرۂ اثر میں ہیں۔ ہم اور ہماری زندگی ایک اور ذات کے ارادے کے تابع ہیں اور وہ ذاتِ مطلق ہے۔ اس کا امر غالب ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے' ہمارے ساتھ، ہماری زندگی کے ساتھ، ہمارے ظاہر کے ساتھ' ہمارے باطن کے ساتھ، ہماری تنہائی کے ساتھ، ہمارے گردوپیش کے ساتھ، ہمارے والدین کے ساتھ' ہماری اولاد کے ساتھ، ہمارے ہر ہر خیال کے ساتھ۔ اور وہ ذات چاہے تو ہمارے مرتبے عذاب بنا دے، چاہے تو ہماری غریبی اور غریب الوطنی کو سرفرازیاں عطا کر دے۔ وہ ذات یتیموں کو پیغمبر بنا دے اور چاہے تو مسکینوں کو مملکت عطا کر دے۔ اس ذات کا امر اور عمل اٹل ہے۔ اس کے فیصلے آخری ہیں۔ اس کے حکم کے تابع ہیں انسان کی خوشیاں' انسان کے غم' انسان کی زندگی' انسان کی موت' انسان کی محبت، انسان کے خوف' انسان کے جذبات و احساسات۔ وہی ذات ہے' جو انسان کو بار بار حکم فرماتی ہے کہ صبر کرو۔ یعنی اپنی زندگی میں میرے حکم سے پیدا ہونے والے حال کو سمجھنے سے پہلے تسلیم کر لو۔ جو سمجھ میں نہ آ سکے، اس پر صبر کرو اور جو سمجھ میں آ جائے، اس پر مزید غور کرو۔ صبر کی منزل ایک مشکل منزل ہے۔ فقر میں ایک بلند مقام ہے' صبر کا۔

وہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ عجب بات ہے کہ وہ تکلیف دُور نہیں کرتا اور برداشت کرنے والوں کے ساتھ رہتا ہے اور تکلیف بھیجنے والا بھی خود ہی۔ بس یہی انسانی عظمت کا راز ہے۔ انسان کی تسلیم و رضا کا روشن باب انسان کی انسانیت کا ارفع مقام کہ وہ سمجھ لے کہ تکلیف دینے والا ہی راحتِ جاں ہے۔ یہ زندگی اس کی دی ہوئی اسی کے حکم کی منتظر ہے۔ وجود اس کا بنایا ہُوا اسی کے امر کے تابع ہے۔ وہ ستم کرے تو ستم ہی کرم ہے۔ وہ تکلیف بھیجے تو یہی راحت ہے۔ وہ ذات ہمارے جسم کو اذیت سے گذارے تو بھی یہ اس کا احسان ہے۔

صبر کرنے والے اس مقام سے آشنا کرا دیئے جاتے ہیں کہ تکلیف دینے والا ہی صبر کی توفیق دے رہا ہے۔ اور اس مقام پر "صبر" ہی "شکر" کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے مقرب اذیت سے تو گزرتے ہیں لیکن بیزاری سے کبھی نہیں گذرے۔ وہ شکر کرتے ہوتے وادیٔ اذیت سے گذر جاتے ہیں۔

دنیا دار جس مقام پر بیزار ہوتا ہے مومن اس مقام پر صبر کرتا ہے اور مومن جس مقام پر صبر کرتا ہے مقرب اس مقام پر شکر کرتا ہے کیونکہ یہی مقام وصالِ حق کا مقام ہے۔ تمام واصلینِ حق صبر کی وادیوں سے بہ تسلیم و رضا گذر کر سجدۂ شکر تک پہنچے۔ یہی انسان کی رفعت ہے۔ یہی شانِ عبودیت ہے کہ انسان کا وجود تیروں سے چھلنی ہو، دل یادوں سے زخمی ہو اور سرِ نیاز سجدہ میں ہو کہ "اے خالق! مجھے صبر و استقامت کی منزلیں عطا کرنے والے! مجھے تسلیم و رضا کے معراج عطا کرنے والے! تیرا شکر ہے، لاکھ بار شکر ہے کہ تو نے مجھے چن لیا، اپنا بندہ بنایا، اپنا اور صرف اپنا۔ تیری طرف سے آنے والے ہر حال پر ہم راضی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم اور ہماری زندگی بے مصرف اور بے مقصد نہ رہنے دینے والا تو ہے۔ جس نے ہمیں تاجِ تسلیم و رضا پہنا کر اہلِ دنیا کے لیے ہمارے صبر کا ذکر ہی باعثِ تسکینِ روح و دل بنایا!"

بیکسی کی داستان بننے والے امام عالی مقام بیکسوں کے لیے چارہ ساز ہیں۔ یہ داستان اہلِ علم کے لیے نہیں، یہ اہلِ نظر کا مقام ہے، اہلِ صبر کے لیے، اہلِ شکر کے لیے۔ اُن کے لیے جوہر

حال پر راضی رہتے ہیں۔ جن لوگوں پر اس کا کرم ہوتا ہے، ان کی آنکھیں تر رہتی ہیں۔ ان کے دل گداز رہتے ہیں۔ ان کی پیشانیاں سجدوں کے لیے بیتاب رہتی ہیں۔ ان کے ہاں تکلیف رہتی ہے، لیکن ان کی زبان پر کلماتِ شکر رہتے ہیں۔ مقاماتِ صبر کو مقاماتِ شکر بنانا خوش نصیبوں کا کام ہے۔ ایسی خوش نصیبی کہ زمین والے ان کی تکلیف پر اظہارِ غم کریں اور آسمان والے ان پر سلام بھیجیں۔ صبر والوں کی شان نرالی ہے۔ ان کا ایمان قوی ہے۔ ان کے درجات بلند ہیں۔ ان کے جسم پر پیوند کے لباس ہیں اور ان کے در پر جبریلؑ جیسے غلام ہیں۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ہمیشہ سے، ہمیشہ کے لیے۔

